ایک قطرہ خون

عصمت چغتائی



مکمل نمونہ ... اور نہیں لکھ سکتا جو عصمت چغتائی کا ہم
شے ا...

زیر نظر ناول عصمت چغتائی کی ایک ایسی زندہ تحریر ہے جو خواب حسین کی طرح ہمیشہ ترو تازہ رہے گی۔

ڈاکٹر شیخ بلیغ الدین جاوید



عصمت چغتائی نہ صرف برصغیر پاک و ہند کی نامور ادیبہ ہیں بلکہ ان کا نام عالمی ادبی حلقوں میں بھی بڑے احترام سے لیا جاتا ہے جنہیں کردار نگاری اور خاکہ نویسی پر دسترس حاصل ہے۔ ایک قطرہ خون، انتہائی چونکا دینے والا شاہکار ہے کیونکہ محترمہ نے جس عنوان پر قلم اٹھایا وہ خود تاریخ عالم کا ایک منفرد واقعہ ہے جس ایثار اور قربانی پر تاریخ انسانیت کو ناز ہے۔

عصمت چغتائی نے اسی تاریخ کے باب کو داستان کا روپ دیا ہے جس میں کردار نگاری اور خاکہ نویسی اپنے عروج کے جوہر دکھا رہی ہے۔

پاکستان بکس انتخاب ادب کو اس بات کا فخر حاصل ہو رہا ہے کہ وہ اس کی اشاعت کی گراں بار ذمہ داری اٹھا رہا ہے۔

پروفیسر معراج نیر
گورنمنٹ ڈگری کالج چنیوٹ



پاکستان میں باجازت ناشر
انتخابِ ادب
۱۰۔ ایبک روڈ، انارکلی، لاہور

باجازت
فن اور فنکار پبلشرز
۴۹۔ محمد علی روڈ۔ بمبئے نمبر ۳

ایک قطرۂ خون

ایک ناول

عصمت چغتائی

ناشران:
انتخابِ ادب

ناشر ...... ڈاکٹر بلیغ الدین جاوید
مطبع ...... جیون پرنٹنگ پریس لاہور
سال اشاعت ۱۹۷۷ء
تزئین و ترتیب ... سرور راہی لاہور

قیمت
۲۵
پچیس روپے

ناشر: انتخابِ ادب
۱۰۔ ایبک روڈ انارکلی لاہور۔

پیش لفظ

ان بہتّر ۷۲ انسانوں کی کہانی ہے جنہوں نے
انسانی حقوق کی خاطر سامراج سے ٹکرلی۔ ———

یہ چودہ سو سال پرانی کہانی آج کی کہانی ہے ——— کہ
آج بھی انسان کا سب سے بڑا دشمن انسان کہلاتا ہے ———

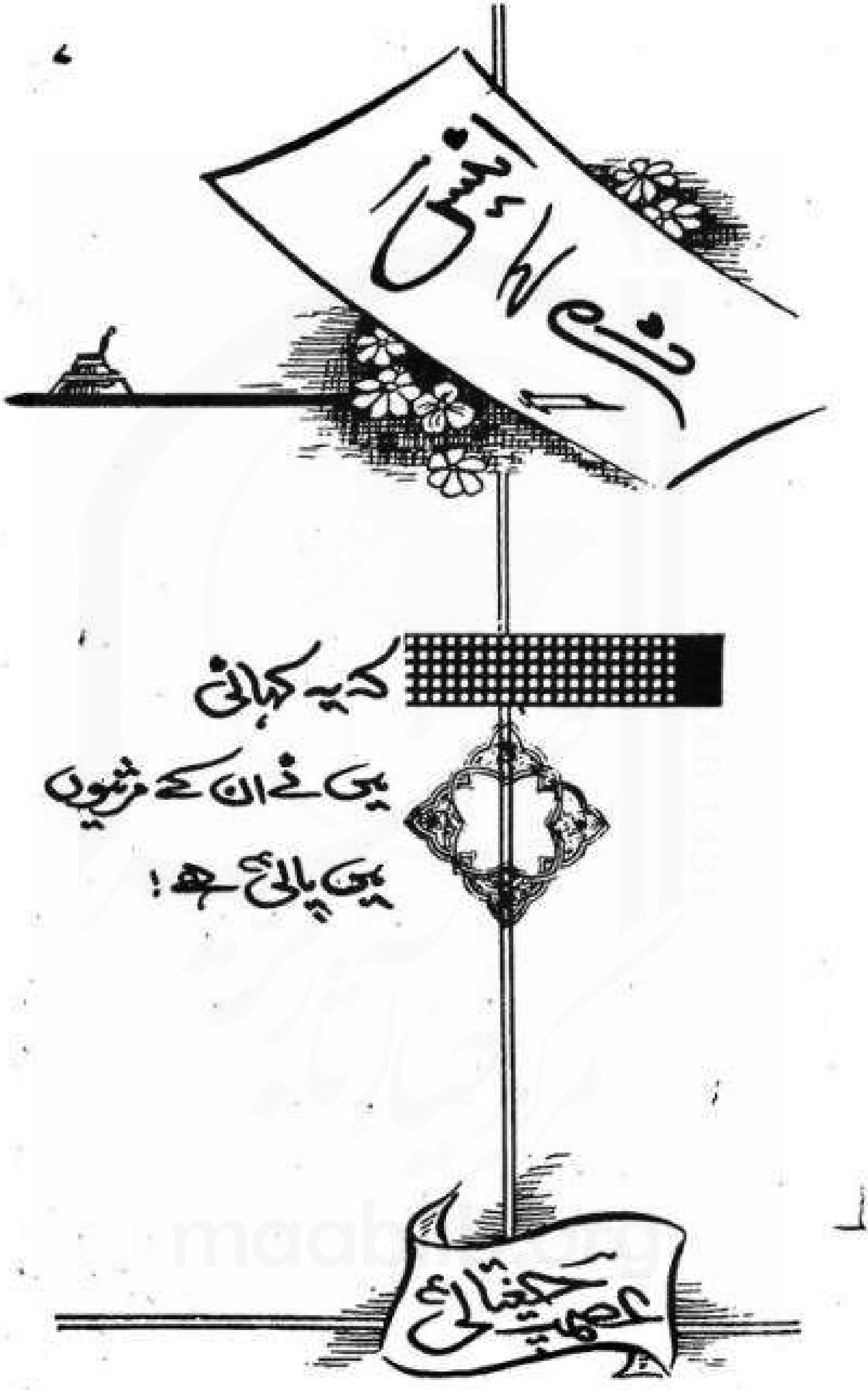
——— آج بھی انسانیت کا علم بردار ن ہے ———
آج بھی جب دنیا کے کسی کونے میں کوئی یزید سر اٹھاتا ہے تو حسینؑ
——— بڑھ کر اس کی کلائی مروڑ دیتے ہیں ———
——— آج بھی اُجالا اندھیرے سے برسرِ پیکار ہے ———

★

——— عصمت چغتائی

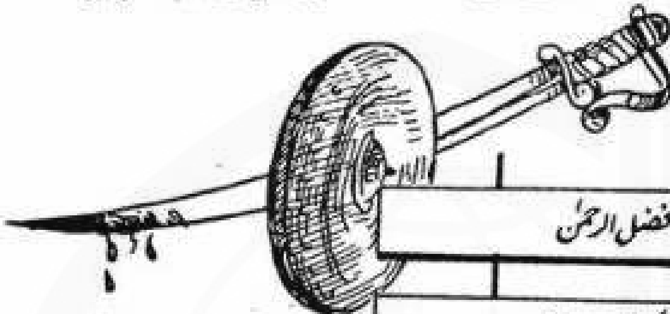
★

ایک قطرہ خون


انیس کے نام
کہ یہ کہانی
میں نے ان کے مرثیوں
میں پائی ہے!
عصمت چغتائی

یک قطره خون

پیارے دوست اور عزیز جنہوں نے اس
ناول کی اشاعت میں میرا ہاتھ بٹایا۔



فضل الرحمٰن

ڈاکٹر یوسف حمید

علی زیدی

فرحان مجیب

رباب جعفری

عصمت چغتائی

زیبان ایرانی

نوین ساہنی

جاوید اختر

صابر دت

ستارہ جعفری

طلوع

فضا میں آسمانی نغمے گونج رہے تھے۔ ہواؤں میں فرشتوں کے پروں کی سرسراہٹ تھی۔ کائنات ایک عجیب و غریب سحور کُن آسمانی نور میں نہائی جگمگا رہی تھی بزمِ عالم آنے والے مقدس بچے کے احترام میں سر بسجود تھا۔ چاند اور تارے نئی دمک اور جِلا سے جھلملا رہے تھے۔ سحر کی روشنیاں نرالی آب و تاب سے مزین تھیں۔ دلوں کی لَویں خود بخود اونچی ہو گئی تھیں۔

خدائے ذوالجلال والاکرام بڑے انہماک سے زمین کی جانب متوجہ تھا۔ آج خدا کا حسین ترین شاہکار عالمِ وجود میں آنے والا تھا۔

بنتِ رسولؐ، علی ابنِ طالبؑ کی چہیتی شریکِ زندگی فاطمہ زہراؑ دردِ زہ میں مبتلا بے چین و بے قرار تھیں۔ اُن کا پھول سا کمسن چہرہ پسینہ کی شبنم میں ڈوبا ہوا تھا۔ بھیگی بھیگی آنکھوں میں وہ کرب تھا جو ہر ماں کا انعام ہے۔

علیؑ ابنِ ابی طالبؑ بڑے بیٹے حسنؑ کو کاندھے سے لگائے بے چین ٹہل رہے تھے۔ جان سے پیاری بیوی کے کرب کا احساس بے چین و بے قرار کر رہا تھا۔ ایسے نازک وقت میں عورت کو ماں کے پیار کی ضرورت ہوتی ہے۔ علیؑ کے لب دعا کے لیے اضطراب سے ہل رہے تھے۔

"اے رحیم و کریم، دنیا کے پالن ہار، اس بن ماں کی بچی پر رحم فرما۔"

سرورِ کائنات، رسول خداؐ بیٹی کی تکلیف سے مسلسل ڈیوڑھی پر ٹہل رہے تھے۔ ماں کا دکھ صرف ماں کا حصہ ہے کوئی اس درد کو بانٹ نہیں سکتا۔

پیغمبرِ اسلامؐ نے اپنی بیٹی فاطمہ زہراؑ کو بڑے ناز و نعم سے پالا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب عرب وحشی اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ لڑکی ذات کو منحوس اور ذلیل سمجھا جاتا تھا۔ زمانۂ جہالت کی اور دوسری لعنتوں کے ساتھ رسولِ خداؐ نے اس بیہودہ رسم کے خلاف بھی آواز بلند کی۔ اپنے قول کو عمل سے ثابت کرنے کے لیے انھوں نے اپنی بیٹی کو وہ سارے حقوق دیئے جو ایک انسان کو مہذب دنیا میں ملنا چاہئیں۔ وہ ان سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ انھیں بڑے شوق اور انہماک سے علم کی دولت سے مالا مال کیا۔ اُن کی بڑی عزت کرتے تھے۔ بیٹی کو آتا دیکھ کر ہمیشہ تعظیم سے کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔ جن کے قدموں میں شہنشاہوں کے سر جھکتے تھے۔ انھیں بیٹی کی اس طرح عزت کرتے دیکھ کر لوگ اپنی بیٹیوں کی وقعت کرنے لگے تھے۔ بیٹی کا باپ ہونا گالی نہیں ایک قابلِ فخر بات سمجھا جانے لگا۔

فاطمہ زہراؑ سنِ بلوغ کو پہنچیں تو ان کے لیے بڑے بڑے شہزادوں اور بادشاہوں کے پیغام آنے لگے۔ مگر رسول اللہؐ نے سب کو ٹال دیا۔ لوگ بڑے چکر میں تھے کہ رسول خداؐ کو بیٹی کے لیے کیسے بر کی تلاش ہے۔ ارادہ کیا ہے۔ جوان بیٹی۔ کو کب تک بٹھائے رکھیں گے

بیٹی باپ کے سینے کا بوجھ نہ تھی۔ جسے ہٹانے کے لیے اسے کسی کے سپرد کر دیا جائے وہ ان کی بیٹی تھی۔ جگر کا ٹکڑا تھی۔ وہ اس کے لیے ایسا شوہر چاہتے تھے جو ہر طرح ایک مکمل انسان ہو۔ جسے وہ اپنی بیٹی کی طرح عزیز رکھتے ہوں۔

پیغمبر خداؐ کو خدا کا پیغام انسانوں تک پہنچانے کے لیے ایک معین اور معاون کی ضرورت تھی۔ ایک ایسا شریک کار جو ان کا بوجھ بانٹ سکے۔ جس پر وہ بھروسہ کر سکیں۔ جو ان کے پیغام کو اپنی روح میں جذب کر سکے۔ اور اسے دوسروں تک پہنچا سکے۔

اس وقت صرف سات افرا ... رۂ ... میں آ ... کر چ

وہ چھپ کر عبادت کرتے تھے۔ رسول اللہ نے ایک جلسے میں اپنی اس خواہش کا اظہار فرمایا اور پکار کر کہا۔

"کون ہے تم میں سے جو میرا معین و مددگار بننے کو تیار ہے۔؟"

بنی ہاشم کے سب ہی معزز اصحاب شریک جلسہ تھے۔ مگر کسی نے لبیک نہ کہا۔ لوگ کھل کر اظہار خیال کرتے جھجکتے تھے۔ مخالفین کے خوف سے ہچکچاتے تھے۔ رسول خدا امید بھری نظروں سے سب کا منہ تک رہے تھے۔ مگر سب خاموش تھے۔ آنکھیں چرا رہے تھے۔

اس وقت اچانک ایک لڑکا جس کی عمر مشکل سے دس بارہ برس کی ہوگی۔ مجمع میں سے اٹھا اور نہایت دلیرانہ انداز میں بولا۔

"یا رسول اللہ! میں آپ کا معین و مددگار بننے کو تیار ہوں۔"

لوگ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ بھلا ایک کمسن لڑکا اتنا عظیم بوجھ کیوں کر اٹھا سکے گا۔

مگر پیغمبر کا چہرہ مسرت سے کھل اٹھا۔ فکر و تردد کے آثار یکسر غائب ہو گئے۔ انھوں نے آگے بڑھ کر اس بچے کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

وہ کم سن بچہ اُن کا چچا زاد بھائی علی بن ابی طالبؑ تھا۔ اُس کی دلیری اور صاف گوئی سے وہ بے حد متاثر ہوئے۔

"فضیلت عمر سے نہیں، عقل اور جرأت سے ہوتی ہے۔" انھوں نے فرمایا۔

"یا رسول اللہ! میری آنکھیں میں ہمیشہ تکلیف رہتی ہے۔ میرا جسم بھی تنومند نہیں۔ مگر میرا دل آپ کا مطیع ہے۔" علی بن ابی طالبؑ نے معصومیت سے کہا اور رسول اللہ مسکرا پڑے۔ اس دن انھوں نے اپنا عزیز ترین دوست، ہونہار شاگرد اور بہادر وجری ہم رکاب پا لیا۔ بڑی توجہ سے انھوں نے اس بچے کی تعلیم و تربیت پر وقت صرف کیا۔ دونوں ہر دم ساتھ رہنے لگے۔ ایک درازقد نوجوان مرد اور ایک کم عمر لڑکا! جب علیؑ جوان ہوئے تب بھی سائے کی طرح ساتھ رہے۔ بڑے بڑے معرکوں میں دامن نہ چھوڑا۔ علیؑ رسول اللہ کو بے انتہا عزیز تھے۔ اور جب بھی کوئی انتہائی خطرے کا موقع آتا۔ تو وہ بے دریغ علیؑ کو سامنے کر دیتے، انھیں علیؑ پر اعتماد تھا۔ اور علیؑ بے عذر ان کا

ہر حکم بجا لاتے۔

علیؓ کی بہادری ضرب المثل بن گئی۔ فتح ان کی زرخرید لونڈی تھی۔ وہ جس مہم کو سر کرنے کا تہیہ کرتے۔ فتح یقینی بن جاتی۔ علیؓ بیک وقت دو تلواروں سے لڑتے تھے۔ ڈھال کے بجائے دوسرے ہاتھ میں بھی تلوار ہوتی تھی۔ ان کی دو تلواریں ہی سپر کا بھی کام کرتی تھیں لوگ انھیں سیف اللہ یعنی خدا کی تلوار کہا کرتے تھے۔

چند دوستوں نے علی بن ابی طالبؓ سے کہا۔

"آپ قسمت آزمائی کیوں نہیں کرتے، رسول اللہ آپ کو بہت پسند کرتے ہیں۔ اپنی بیٹی کے لیے وہ آپ کا پیغام ضرور منظور کر لیں گے۔

علیؓ نے کہا۔

"میں یہ جرأت کیسے کر سکتا ہوں۔ جہاں سے شاہوں کو جواب مل گیا۔ وہاں میری کیا گنتی ہو گی۔ میں غریب آدمی ہوں۔"

"آپ غریب و نادار سہی مگر رسول اللہؐ آپ کو بہت چاہتے ہیں۔" دوستوں نے کہا۔" ہمارے خیال میں تو وہ آپ ہی کو پسند کرچکے ہیں۔ خود اپنے منہ سے کہتے تکلف ہو رہا ہے آپ کا فرض ہے کہ پیغام دیں چاہے وہ منظور کریں یا نہ کریں۔

علیؓ ابن ابی طالب نے سر جھکا لیا۔ اور سوچ میں پڑ گئے۔ رسول اللہؐ علیؓ کو پسند فرماتے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ علیؓ کی بہادری کا ڈنکا دور دور تک بج رہا تھا۔ وہ خود اپنی صفات سے بے خبر تھے۔ اپنے بارے میں کوئی مغالطہ نہ تھا۔ وہ غریب تھے۔ انھوں نے ملک جو فتح کیے تھے۔ وہ اپنی ذات کے لیے نہیں اسلام کے لیے تھے۔ ان کے پاس محل دو محل نہ تھے۔ نہ زر و جواہر اور لونڈی غلام۔ مزدوری کر کے گزر بسر کرتے تھے۔ انہیں باغات لگانے کا بہت شوق تھا۔ جب مہمات سے فرصت ملتی، بنجر اور خشک زمین کی کاشت کر کے کھجور کے باغ لگاتے۔ جاں فشانی سے ان کی سینچائی کرتے۔ جب وہ تیار ہو جاتے تو کسی کو بطور تحفہ دے دیتے تھے۔

اس وقت بھی وہ آب پاشی میں معروف تھے جب ان کے دوستوں نے سب اصرار کیا۔

کہ فاطمہ زہراؑ کے لیے پیغام دینا آپ کا بھی حق ہے۔ اور فرض بھی۔ تو راضی ہو گئے۔

پانی کا ڈول ایک طرف رکھا۔ گھر جا کر غسل کیا۔ اپنے ہاتھ کا دھلا پیوند لگا لباس پہنا اور روانہ ہو گئے۔ ابھی علیؑ دروازے تک پہنچے بھی نہ تھے کہ رسول خدا نے ام سلمہ سے فرمایا۔

"دروازہ کھول دو، ہمارا بہت ہی پیارا مہمان آ رہا ہے!"

انھوں نے دروازہ کھولا۔ تو دیکھا علیؑ کچھ شرمائے جھینپے سے سر جھکائے کھڑے ہیں۔ علیؑ کی عمر اس وقت اکیس سال تھی۔

"آؤ، آؤ، علیؑ اندر آ جاؤ، باہر کیوں کھڑے ہو؟"

علیؑ اندر آئے۔ ان کا قد اتنا لمبا تھا کہ ہر دروازہ چھوٹا معلوم ہوتا تھا۔ نہایت گھبرائے ہوئے تھے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ ایک ہاتھ کی انگلیوں سے دوسرے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے۔ موقع بڑا نازک تھا۔

رسول اللہ انھیں دیکھ رہے تھے اور مسکرا رہے تھے۔ ان کے طور طریق سے بھانپ گئے کہ علیؑ کیا کہنے آئے ہیں۔ انھیں بھی علیؑ کے منہ سے بات سننا تھی۔ مسکراہٹ روک کر پوچھا۔

"کچھ پریشان معلوم ہوتے ہو علیؑ! کیا قصہ ہے؟"

"علیؑ تھوڑا سا کسمائے! پیشانی سے پسینہ پونچھا۔ جی کڑا کر کے کہہ ہی دیا۔

دیا رسول اللہ! میں آپ کی بیٹی فاطمہ زہراؑ کے لیے درخواست کرنے آیا ہوں۔"

"ہوں، مہر میں دینے کے لیے کچھ ہے؟" مسکرا کر پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں، بس یہ تن کے کپڑے ہیں۔ ایک گھوڑا ہے۔ تلوار ہے اور زرہ بکتر بس یہی کل اثاثہ ہے۔"

"تلوار تو ایک سپاہی کے لیے نہایت ضروری ہے۔ گھوڑے کے بغیر بھی کام نہیں چلے گا۔ مگر زرہ بکتر کی تمہیں کیا ضرورت ہے۔ خدا تمہارا محافظ ہے۔ تمہیں اور کسی حفاظت کی حاجت نہیں۔"

علی بن ابی طالبؑ نے اپنی زرہ بکتر بطور مہر پیش کر دی۔ تب رسول اللہ نے اپنی بیٹی کو بلایا

"فاطمہؓ! علیؓ تمہارے سامنے کھڑے ہیں۔ یہ تمہارے خواستگار ہیں۔ بولو۔ تمہاری کیا مرضی ہے؟"

فاطمہ زہرا بالکل چپکی رہیں۔ وہ کچھ بھی بول نہ سکیں۔

تین بار باپ نے بیٹی سے یہی سوال کیا۔ جب وہ خاموش رہیں تو کہا۔

"اس کا مطلب ہے علیؓ تمہیں پسند ہیں۔ تمہیں یہ رشتہ منظور ہے۔ شرم کی وجہ سے خاموش ہو۔"

فاطمہ زہراؓ پھر بھی خاموش رہیں۔

رسول اللہؐ نے اپنے چند دوستوں کو بلا کر مشورہ کیا۔ زرہ بکتر جو علیؓ نے بطور مہر پیش کی تھی۔ اسے فروخت کر کے فاطمہ زہراؓ کا جہیز خریدا گیا۔ دو چکیاں، دو گھڑے، ایک چرخہ ایک چادر، اور چند پیالے اور رکابیاں۔

رسول اللہ ہی علیؓ کے بزرگ تھے۔ باقی جو روپے بچے، ان سے ولیمہ کی دعوت کا انتظام ہوا۔ آپ نے علیؓ سے فرمایا۔

"جاؤ علیؓ! اہل مدینہ کو اپنے ولیمہ کی دعوت دے آؤ۔"

علیؓ گھبرا گئے، اتنا تھوڑا سا کھانا اور مدینے کے ہر خاص و عام کی دعوت! مگر دم مجود تھے بولنے کی گنجائش نہ تھی۔ سوچا، اگر واقعی اہل مدینہ بلاوا پا کر آ گئے تو غضب ہو جائے گا۔ بڑی شرمندگی اٹھانا پڑے گی۔ لہٰذا ایک ٹیلے پر کھڑے ہو کر بڑی دھیمی آواز میں پکارا۔

"اے اہل مدینہ! علی ابن ابی طالب کے ولیمہ کی دعوت ہے۔ شرکت فرما کر عزت افزائی کیجئے۔"

علی سمجھتے تھے کہ یوں ہولے سے پکاریں گے تو جو سنیں گے آ جائیں گے۔ جو نہ سن پائیں گے نہیں آئیں گے۔ اچھا ہی ہے کہ کم مہمان آئیں۔ کھانا بہت کم مقدار میں ہے۔

مگر ہوا کو جو شرارت سوجھی تو علیؓ کی آواز کو لے اڑی اور گلی گلی گھر گھر خبر پہنچ گئی۔

جب بلاوا دے کر واپس لوٹے تو یہ دیکھ کر پیروں تلے سے زمین کھسک گئی کہ ایک

بھیڑ لگی ہے۔ لوگ جوق در جوق پیدل اور ناقوں پر سوار چلے آرہے ہیں۔ رسول خدا کی پیاری بیٹی کی شادی اور علیؓ کے ولیمہ کی دعوت، کون احمق تھا جو چھوڑ دیتا۔ پوری مدینہ کی خلقت ٹوٹ پڑی۔

"یا رسول اللہ، کھانا کیسے پورا پڑے گا۔ ذرا دیکھئے تو مہمانوں کی ریل پیل۔" علیؓ نے پریشان ہو کر کہا۔

"فکر نہ کرو، انشاءاللہ کھانا پورا ہو جائے گا۔"

اور ایسا ہی ہوا، لوگوں نے کھایا اور کھلایا۔ کوئی بھوکے کا مارا تو دور، جی بھرنے نہیں آیا تھا سب برکت کا نوالہ کھا کر سیر ہو گئے۔

رسول اللہؐ نے اپنی پیاری بیٹی فاطمہ زہراؑ کا ہاتھ اپنے سب سے پیارے رفیق اور شریک کار اور لائق ترین شاگرد کے ہاتھ میں دے کر خدا کا شکر ادا کیا۔

یکایک فاطمہ زہراؑ کا حجرہ نور سے جگمگا اٹھا۔ در و دیوار بقعۂ نور ہو گئے۔ اسماءؓ ہڑبڑائی ہوئی حجرے سے باہر نکلیں۔

"علیؓ! علیؓ!! بیٹا مبارک ہو، بخدا بالکل چاند کا ٹکڑا ہے۔"

علیؓ نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ رسول خدا کے کان آواز پر لگے ہوئے تھے۔ بڑی تیزی سے اندر داخل ہوئے۔

"لاؤ اسماء، کہاں ہے ہمارا بیٹا، ہمیں دکھاؤ۔"

"ذرا صبر کیجئے، نہلا دھلا کر ابھی لاتی ہوں۔"

"اسے نہلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ پاک ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اسے آسمانی طہارت بخشی ہے۔ تم ہمیں ایسے ہی دو۔" اسماءؓ نے بچے کو ایک زرد کپڑے میں لپیٹا اور باہر لے آئیں۔ نانا نے بچے کو سینے سے لگا لیا۔ اور بے اختیار چومنے لگے:

"علیؓ، علیؓ، واللہ ذرا بیٹے کو دیکھو، خوش نصیب ہو تم اور فاطمہؓ کہ خدا نے تمہیں

یہ بیٹا دیا، یہ بڑے نصیب والا ہے۔ ایک دن یہ دنیا کا ہادی اور رہنما بنے گا۔ لوگ رہتی دنیا تک اس کے کارنامے یاد کریں گے۔ علی! تمہیں یہ بے مثال بیٹا مبارک ہو۔"

"علیؑ بے اختیار مسکرا دیئے۔

"یہ آپ کا ہے، مجھ سے زیادہ اس پر آپ کا حق ہے۔ جو فضیلت اسے نصیب ہوگی وہ آپ کی بدولت ہوگی۔ آپ کی گود میں پلے گا۔ خدا اس کے سر پر آپ کا سایہ قائم رکھے۔"

خدا سے دعا ہے کہ تم اور فاطمہؑ خوش رہو۔ پھلو، پھولو۔"

رسولِ خدا نے بچے کو زانو پر لٹا لیا۔ علیؑ خاموش حیرت زدہ انہیں دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے کبھی رسول اللہؐ کو یوں بچوں کی طرح خوشی سے ہنستے نہیں دیکھا۔

انھوں نے بچے کے کان میں اذان کہی، پھر دوسرے کان میں اقامت اور اس کے ننھے ننھے ریشمی ہاتھ چومنے لگے۔

بچپن

حسنؓ اور حسینؓ اوپر تلے کے بھائی تھے۔ دونوں کی پیدائش ایک سال کے اندر ہوئی تھی۔ مشکل سے دونوں میں سال بھر کا فرق تھا۔ رسول اللہؐ اپنے نواسوں کو بہت پیار کرتے تھے۔ ان کا کوئی اپنا بیٹا زندہ نہ رہا۔ اس لیے نواسوں کو بیٹوں کی طرح پالا۔ ان بچوں کو دیکھ کر وہ بس اپنے نواسوں کے نانا بن جاتے تھے یہ سادگی ہی ان کی عظمت کی نشانی تھی۔ ان کی محبت میں ایسی شدت تھی کہ بچوں کو دیکھے بغیر چین نہ پڑتا۔ صبح اپنے گھر سے نکل کر سیدھے بیٹی کے گھر جاتے بچوں کی خیریت پوچھتے۔ رات کو روئے تو نہیں آرام سے سوئے!“

”جی ہاں، سب خیریت رہی، بابا آپ خواہ مخواہ ان بچوں کے لیے فکرمند رہتے ہیں۔“ بیٹی ہنس کر جواب دیتیں۔

تب انہیں اطمینان ہو جاتا اور وہ مسجد تشریف لے جاتے۔ واپسی میں پھر بچوں کو دیکھنے جاتے۔ تھوڑی دیر ان کے ساتھ کھیلتے، پھر گھر جاتے۔ کہیں سفر کو جاتے تو سب سے آخر میں بچوں سے رخصت ہوتے اور لوٹ کر سیدھے بچوں کے پاس جاتے۔

جب بچے ذرا بڑے ہو گئے تو انہیں اپنے ساتھ مسجد لے جاتے، وہاں بچے کھیلا کرتے۔ نماز پڑھتے وقت کندھوں پر چڑھ جاتے۔ ایک دن رسول اللہ منبر پر بیٹھے خطبہ فرما رہے تھے کہ حسینؓ بھاگے ہوئے آئے تو ٹھوکر کھا کر گر پڑے۔ خطبہ چھوڑ کر

نانا نے لپک کر اُٹھایا اور سینے سے لگا لیا۔ انھیں بہلایا۔ جب چپ ہو گئے تو پھر خطبہ جاری کیا۔

رسول اللہ کو سب ہی بچوں سے پیار تھا۔ وہ کسی بچے کے رونے کی آواز سنتے تو بے چین ہو جاتے۔ بچے جو دنیا کا مستقبل ہیں۔ حسنؓ اور حسینؓ کو نانا اور والدین کی محبت برابر ملتی تھی۔ پھر بھی بچوں میں کبھی ضد ہو جاتی اور بحث چل نکلتی

ایک دن دونوں نے تختیاں لکھیں اور نانا سے پوچھا کہ بتائیے کس کی لکھائی زیادہ خوبصورت ہے۔ انھوں نے کہہ دیا "جاؤ اپنے بابا سے پوچھو، وہ تو بہت خوش خط ہیں"

بچے باپ کے پاس گئے۔

"بھئی اپنی اماں سے پوچھو، وہ بتائیں گی" بابا نے کہہ دیا۔

جب مقدمہ ماں کے سامنے پیش ہوا تو وہ تذبذب میں پڑ گئیں۔

"دونوں کی لکھائی ٹھیک ہے"

"نہیں، یہ بتائیے کہ زیادہ اچھی کس کی ہے؟" بچے ضد کرنے لگے۔

"یہ فیصلہ ذرا مشکل ہے، مگر ٹھہرو، ایک کام کرو" فاطمہ زہراؓ نے گلے میں پڑا ہوا موتیوں کا ہار توڑ کر زمین پر بکھیر دیا۔

"بس تم میں سے جو سب سے زیادہ موتی چن لے، اُسی کی لکھائی سب سے اچھی مانی جائے گی"

بچے جلدی جلدی موتی چننے لگے۔ ایک موتی گرنے سے دو ٹکڑے ہو گیا۔ دونوں نے آدھا آدھا چن لیا۔ جب موتی گنے گئے تو دونوں کے پاس برابر موتی نکلے۔ ایک کا آدھا آدھا ٹکڑا۔

اس کا یہ مطلب ہے کہ تم دونوں کی لکھائی ایک ایسی ہے" بچے قائل ہو گئے۔

"مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اور مشق کی ضرورت نہیں۔"

رسول اللہ فرصت کا وقت عموماً بیٹی کے ہاں گزارا کرتے تھے۔ ایک دن

چادر اوڑھے بیٹھے تھے کہ اتنے میں فاطمہ زہرؑا ادھر کسی کام سے آئیں ۔ باپ کی گود اب صرف نواسوں کے لیے وقف ہو کر رہ گئی تھی ۔ باپ پر پیار سے آنے لگا بولیں ۔

"بابا ہمیں سردی لگ رہی ہے ۔"

"آؤ چادر میں آ جاؤ ۔" انھوں نے بیٹی کو چادر میں سمیٹ لیا ۔ وہ باپ کے شانے پر سر رکھ کر بیٹھ گئیں ۔

علیؑ نے دیکھا تو مسکرا کر بولے ۔

"یا رسول اللہ ! سردی تو ہمیں بھی لگ رہی ہے ۔"

"آؤ تمہیں کس نے منع کیا ہے ۔ ہماری چادر میں بڑی وسعت ہے ۔" علیؑ بھی چادر میں آ گئے ۔ بچوں نے جو اپنی حق تلفی دیکھی تو دوڑ کر وہ بھی گھس گئے ۔

رسول اللہ نے محبت سے سرشار ہو کر سب کو اپنے قریب سمیٹ لیا اور مسکرا کر بولے ۔

ہم سب ایک ہی تو ہیں ۔ ہمارے راستے ایک ہیں ۔ ہماری مشکلات ایک ہیں ۔ راستہ بہت دشوار ہے ۔ صعوبتیں زیادہ ہیں ۔ تم لوگ میرے ہو ۔ میرے بعد میرے پیغام کے وارث ہو ۔ تم اسے لے کر دنیا کے دلوں کو چھو لوگے ، مجھے تم پر یقین ہے ۔ تم سے کوئی کوتاہی سرزد نہ ہوگی ۔ انھوں نے آنکھیں بند کر لیں ۔ اور چاروں اپنی آنے والی ذمہ داریوں کے متعلق سوچنے لگے ۔

بچپن ہی سے حسنؑ اور حسینؑ کو احساس تھا کہ وہ اور بچوں کی طرح کبھی غیر ذمہ داری کا مظاہرہ نہیں کر سکتے ۔ وہ رسولؐ کے نواسے ہیں ۔ دنیا کی نظریں ان پر ہیں ان کی کچھ ذمہ داریاں ہیں جن سے وہ منہ نہیں موڑ سکتے ۔ کچھ فرائض جن سے ملنا ممکن نہیں ۔ بچے سمجھ رہے ہیں ۔ خوش نصیب ہیں وہ بچے جنہیں ذی ہوش بزرگوں کی گود نصیب ہو ۔ وہ بچپن ہی سے زندگی کی باریکیوں کو سمجھنے لگتے ہیں ۔

ایک دفعہ ایک صاحب نے رسول اللہؐ کو ایک ہرن کا بچہ تحفہ میں پیش

کیا اس وقت حسینؓ کہیں اِدھر اُدھر کھیل رہے تھے۔ حسنؓ سامنے بیٹھے تھے۔ نانا سے بچہ حسنؓ نے لے لیا۔ جب حسینؓ آئے تو ہرن کا بچہ بھائی کی گود میں دیکھ کر لبسورنے لگے۔

"ہمیں بھی دیجئے ایک ہرن کا بچہ۔"

"تم دونوں اسی ایک بچہ کو اپنا سمجھو۔" بابا نے سمجھایا۔

"نہیں، وہ تو بھائی کا ہے۔ وہ ہمیں چھونے بھی نہ دیں گے۔"

حسینؓ رو دیئے۔ حسنؓ نے بھی کچھ اوپری دل سے ہرن کا بچہ چھونے کی اجازت دی حسینؓ کو تسلی نہ ہوئی اور آنسو نہ تھمے۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک ہرنی بچہ لیے چلی آرہی ہے۔

"لو حسینؓ خدا نے تمہیں بھی ایک بچہ بھیج دیا۔ لو اب تو ہنس دو۔" نانا نے فرمایا۔

حسینؓ خوش ہو گئے اور بچے کو پیار کرنے لگے۔

"معلوم ہوتا ہے یہ دونوں بچے اسی ہرنی کے ہیں۔ یہ اس کی خوشبو سونگھتی اس کی تلاش میں آئی ہے۔ بچے اسے دے دو۔" نانا نے کہا۔

بچے اداس ہو گئے۔

"بچے نہیں دو گے تو تم اس ہرنی کو دکھ پہنچاؤ گے۔ سوچو اگر کوئی تمہیں تمہاری امی سے چھین لے تو ان کا کیا حال ہو گا۔"

"امی بہت روئیں گی۔" بچوں نے کہا۔

"یہ ہرنی بھی اپنے بچوں سے جدا ہو کر بہت روئے گی۔"

بچوں نے فوراً ہرنی کے بچے چھوڑ دیئے۔ ہرنی ان کو لے کر بھاگی نہیں وہیں دودھ پلانے لگی۔ پھر وہ وہیں دن رات رہنے لگی۔ بچے اس کے ساتھ کھیلا کرتے۔

رحم اور رواداری بچوں نے رسول اللہؐ کی گود میں سیکھی۔ چھوٹی سی عمر سے بات کی گہرائی کو سمجھنے کی عادت پڑ گئی۔ ایک دفعہ مسجد میں دونوں نے دیکھا کہ ایک ضعیف آدمی غلط طریقے سے وضو کر رہا ہے۔ دونوں پریشان ہو گئے۔

"حسینؓ! بڑے میاں غلط وضو کر رہے ہیں۔" حسنؓ نے چپکے سے کہا۔
"ہاں! اور اگر ٹوکا جائے تو گستاخی ہوگی۔ بُرا مان جائیں گے۔"
"مگر کسی کو غلطی کرتے دیکھنا اور کچھ نہ بولنا بھی تو غلط ہے۔ وہ تو ان جانے میں غلطی کر رہے ہیں۔ گناہ ہم پر ہوگا۔"

تھوڑی دیر سوچ بچار کے بعد ایک ترکیب سوجھی۔ اُن بزرگ کے پاس گئے اور کہا۔ آپ بزرگ ہیں۔ ذرا دیکھئے ہمارے وضو کرنے میں کوئی غلطی تو نہیں۔ جب بچے وضو کرنے لگے۔ تو بزرگ کو معلوم ہوا وہ خود غلطی کر رہے تھے۔ بولے۔ بچو! تم ٹھیک وضو کر رہے تھے۔ میں ہی غلطی پر تھا۔ شکر ہے تم نے آگاہ کر دیا۔ ورنہ میں غلطی کئے جاتا۔"

فاطمہ زہراؓ جب باپ کو دیکھتیں کہ بہت لاڈ پیار کر رہے ہیں تو کہتیں۔
" بابا! اتنا لاڈ نہ کیجئے، خراب عادتیں پکڑ لیں گے۔ خود سر اور نافرمان ہو جائیں گے کہنا نہیں مانیں گے۔"

"محبت سے بچہ خراب نہیں ہوتا۔ وہ خود محبت کا لین دین سیکھتا ہے۔ جسے چاہتے اور چاہے جانے کا فن آتا ہو وہ انسان دنیا کے لیے رحمت لاتا ہے۔"

حسنؓ اور حسینؓ کو نانا اور والدین کی طرف سے اتنی محبت ملی کہ انھیں دنیا کی کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہوئی۔ گھر میں فاقے ہو جاتے۔ کپڑوں میں پیوند لگے ہوتے۔ مگر ان کے دل محبت سے لبریز ہوتے۔ دنیاوی چیزوں کی بے جا ہوس ان کے دلوں میں پیدا ہی نہ ہو پائی۔ جو آگے چل کر ملک گیری کی ہوس کی صورت اختیار کر لیتی انھوں نے غربت میں ہنسنا اور خوش رہنا سیکھا۔

ایک دن عید کے موقع پر لوگ زرق برق لباس پہنے عیدگاہ جا رہے تھے حسنؓ اور حسینؓ کے کپڑے پرانے تھے۔ اور جا بجا پیوند بھی لگے ہوئے تھے۔ آخر بچے تھے، رو پڑے۔ نانا بے قرار ہو گئے۔ پوچھا "کیوں روتے ہو؟"
"ہمارے کپڑے پرانے اور پیوند لگے ہیں۔ ہمیں شرم آتی ہے۔"

رسول اللہؐ نے جھک کر باری باری بچوں کے لباس کے ہر پیوند کو چوما اور پھر پوچھا۔

"ہمیں تمہارے پیوند بہت پیارے ہیں کہ تمہارے باپ کی گاڑھی کمائی سے یہ کپڑے بنے ہیں۔ پر اب تو یہ پیوند بُرے نہیں لگتے؟"

بچوں کو ایسا لگا، ہر پیوند تارے کی طرح جگمگا۔ کھلکھلا کر بچے ہنس پڑے۔

"آپ کے لباس پر بھی تو پیوند ہیں؟"

"لباس پھٹا پرانا ہو تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ روح داغ دار نہ ہونے پائے۔"

مگر پھر بچوں نے دیکھا۔ لوگ سواریوں پر جا رہے ہیں۔ ناقوں پر سوار ہیں۔ پھر اُن کے منہ لٹک گئے۔

"اب کیا بات ہوئی؟" نانا نے پیار سے پوچھا۔

"سب اونٹوں پر سوار ہیں، ہم کیوں پیدل جا رہے ہیں؟"

"تمہیں پیدل جانے کی ضرورت نہیں، آؤ ہمارے کندھوں پر آ جاؤ۔"

یہ کہہ کر انہوں نے بچوں کو کندھوں پر اٹھایا۔ لوگوں نے رسول خداؐ کو جب اپنے نواسوں کو کندھوں پر اٹھائے پیدل جاتے دیکھا تو سب سواریوں سے اُتر آئے۔ اور اپنے بچوں کو کندھوں پر اٹھالیا۔

"آج یہ بچے ہمارے کندھوں پر سوار ہیں۔ کل ان کے کندھوں پر دنیا کا بوجھ ہوگا۔" رسول اللہؐ نے کہا۔ بچوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ پھر آگے سوجھی۔ بولے۔

نانا جان! ہمارے اونٹ کی نکیل کہاں ہے؟"

"لو ہمارے بال پکڑ لو۔"

تھوڑی دیر بعد نئی شکایت پیدا ہوئی۔

"نانا جان!"

"ہاں بچو!"

"دوسرے اونٹ تو بولتے ہیں۔"

نانا جان فوراً اونٹ کی سی آواز نکالنے لگے۔ بچوں کی مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ بار بار جھک کر اپنے "اونٹ" کو چومتے عجیب و غریب نظارہ تھا۔ لوگ بچوں کے ساتھ بچہ بنے قہقہے لگا رہے تھے۔ ایک بزرگ کی آنکھوں سے مسلسل آنسو جاری تھے۔ پاس آ کر بچوں سے بولے۔

"بچو! تمہاری سواری تو لاجواب ہے۔"

"اور سوار بھی اپنا جواب نہیں رکھتے۔" رسول اللہؐ نے ہنس کر جواب دیا۔

"آج ہمارے کاندھوں پر دنیا کا مستقبل ہے۔ ہمارا مستقبل روشن اور تابدار ہے۔"

شاید وہ جانتے تھے کہ ایک دن اُن کے جان سے پیارے نواسوں کو بڑی سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑے گا۔ صرف اس جرم میں کہ وہ رسولِ خداؐ کے نواسے ہیں۔ ان لیے وہ شروع ہی سے اپنی محبت کے ذریعے کچھ تلافی کرنا چاہتے تھے۔ ان نواسوں نے بھی اپنے نانا کی محبت کا اس شاندار طریقے پر احترام کیا کہ اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ نانا ایک تھے اور نواسے دو۔ ایک ننھی سی بہن بھی ان کی محبت کا حصہ دار بن گئی۔ نانا نے بچوں کے دل میں اس چھوٹی سی بہن زینب کی محبت بھر دی۔ دونوں بہن پر دل و جان سے فدا تھے۔ یہ ہنس مکھ حسین بچی سب ہی کو پیاری تھی۔ اب نانا کی گود میں ادھر اُدھر حسنؓ و حسینؓ اور بیچ میں ننھی زینب بیٹھنے لگے۔ کہانیاں قصے سنتے سنتے سو جاتے۔ رسولِ خدا کے بیر شل ہو جاتے۔ مگر وہ ساکت بیٹھے رہتے۔ بیٹی انہیں گود سے اٹھانے آتیں تو اشارے سے منع کر دیتے۔ "سوتے وہ کچی نیند میں اُٹھ گئے تو ہلکان ہو جائیں گے۔"

محبت کی اتنی فراوانی کے بعد بچوں کو اتنی فرصت ہی کہاں تھی کہ یہ سوچتے کہ گھر میں ہمیشہ کھانے کی قلت رہتی ہے۔ آدھے پیٹ کھا کے اٹھ جانا ہمیشہ کا دستور ہے۔ گھر میں کچھ اپنا نہیں۔ ہر شے پر دوسروں کا حق ہے۔ کبھی کوئی سائل دروازے سے خالی ہاتھ نہیں جاتا۔

جو جی چاہے لے جائے کبھی انکار نہ ہوگا۔ بچے وہی سیکھتے ہیں جو بڑے سکھاتے ہیں۔ نانا اور باپ اگر پھٹے پرانے سے شرماتے تو بچوں کو بھی شرم آتی۔ اماں اگر دن رات مفلسی کا ماتم کرتیں تو بچے سمجھتے کہ مفلسی ایک عذاب ہے۔ وہ تو اپنی مفلسی کو ایک طرۂ امتیاز سمجھنے لگے تھے۔ انہیں خدا نے وہ قناعت اور صبر دیا تھا جو سونے اور چاندی کا مرہون منت نہیں۔

فضہ کہنے کو غلام تھیں مگر اماں انہیں اپنے سے اچھے کپڑے پہنائیں۔ ان کی چادر میں اماں کی چادر جتنے پیوند بھی نہ تھے۔ اماں تو ادھر نئی چادر سر پر ڈالتیں۔ ادھر کوئی حاجت مند روتا لبورتا نظر آ جاتا جھٹ اپنی چادر اسے دے کر وہی پرانی چادر اوڑھ لیتیں۔

مگر کوئی پرواہ نہیں ہر پیوند چاند تاروں کی طرح رخشاں ہے کہ ہر پیوند پر نانا کے بوسے کی مہر ہے۔

اماں فضہ کا کتنا خیال رکھتی ہیں۔ ایک دن سارا کام فضہ کرتی ہیں تو دوسرے دن اماں فضہ بوڑھی اور بیمار ہیں۔ اس لیے زیادہ کام اماں ہی کرتی ہیں۔ فضہ کا دم پھول جاتا ہے اس لیے چکی ہمیشہ اماں ہی پیستی ہیں۔ کبھی انہیں پسینہ میں تر بتر چکی پیستے دیکھ کر دونوں بچوں کو جوش آ جاتا ہے۔ ساتھ جٹ جاتے ہیں۔ بجائے مدد دینے کے الٹی چکی پھنسا دیتے ہیں۔ تب اماں بہت ہنستی ہیں۔ خوشامد کرتی ہیں کہ خدارا جا کر کھیلو، میں باز آئی ایسی تمہاری مدد سے۔

تب وہ خاموش دور بیٹھ کر اماں کو جی بھر کے دیکھتے ہیں۔ ننھی زینبؓ ان کے گھٹنے پر پڑی دودھ پیا کرتی ہے۔ اماں کی روپہلی پیشانی پر پسینے کی بوندیں موتیوں کی طرح جگمگاتی ہیں۔ موتیوں جڑی اماں کتنی پیاری کتنی بیاری کمسن اور نازک ہیں۔ خدا جانے کیا کھا کر زندہ رہتی ہیں۔ کبھی انہیں کسی نے پیٹ بھر شوق سے کھاتے نہیں دیکھا۔ اوروں کو کھلا کر ان کا پیٹ بھر جاتا ہے۔

اور بابا جان دن بھر کام کر کے اکثر خالی ہاتھ آ جاتے ہیں۔ ان کی آمدنی راستے میں لوگ ادھار مانگ لیتے ہیں۔ جو کبھی واپس نہیں ملتی یا کسی سائل کی خالی مٹھی بھر جاتی ہے۔

ماں کے منہ سے ایک لفظ شکایت کا نہیں نکلتا۔ وہ بھلا بابا کو کیسے ٹوکیں خود اپنی یہ حالت ہے کہ سوکھی روٹی تیار ہوئی۔ سب دسترخوان پر بیٹھے کہ سائل نے صدا لگائی۔ سب کے روٹیوں کی طرف بڑھے ہوئے ہاتھ رک گئے۔ بچوں نے دوڑ کر سب سے پہلے اپنے حصے کی روٹی فقیر کی جھولی میں دی۔ اماں ہنس دیتی ہیں۔ چکی جھاڑ کر پھر دو روٹیاں پکاتی ہیں۔ بابا شہد کی خالی بوتل دیر تک ہلائے رہتے ہیں۔ چند بوندیں روٹیوں پر ٹپکتی ہیں۔ اور پہلے ہی نوالے میں سیری کا احساس ہونے لگتا ہے۔ آدھے سے زیادہ پیٹ تو پانی ہی سے بھر جاتا ہے۔ حسینؓ کو پانی سے بڑا پیار ہے۔ کتنا پانی پیتے ہیں۔ کس پیار سے مزے لے کر پیتے ہیں جی ہی نہیں بھرتا۔ منہ میں گھونٹ لیتے ہیں۔ پھر آنکھیں بند کر کے اس کا مزہ لیتے ہیں۔ دسترخوان پر بیٹھتے ہی سب سے پہلے ان کا ہاتھ پانی کے بادیے کی طرف بڑھتا ہے۔

حسنؓ ان کی اس عادات کا مذاق اڑاتے ہیں۔

"حسینؓ! اگر دنیا کا سارا پانی چڑیاں پی جائیں تو تم کیا کرو گے!"

وہ حسین کو چھیڑتے ہیں۔

تب حسینؓ سہم کر پانی کے بادیے میں جھانکتے ہیں اور دیوار پر بیٹھی پیاسی چڑیا کو دیکھتے ہیں۔ کٹورا اس کے سامنے رکھ کر خود ذرا دور چھپ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ چڑیا سہمی سہمی آتی ہے بڑی ہوشیاری سے پانی میں چونچ ڈبو کر گھونٹ بھرتی ہے۔ پھر ہوا میں چونچ اوپر اٹھا کر غٹ غٹ پی جاتی ہے۔ حسینؓ اس کی کانپتی ہوئی گردن دیکھتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں تراوٹ کی پریاں ناچ اٹھتی ہیں۔ چڑیا کے حلق میں اترتا پانی حسینؓ کے دل و دماغ کو سیراب کر دیتا ہے۔

حسنؓ کچھ مرعوب سے ہو کر چھوٹے بھائی کی طرف دیکھتے ہیں۔ نہ جانے کیوں ان جانے وسوسے سے ننھا دل دھڑکنے لگتا ہے۔

"نہیں حسینؓ! دنیا میں بہت پانی ہے۔ چڑیا سارا پانی نہیں پئیں گی۔ تمہارے لیے پانی ضرور بچے گا۔"

اور حسینؑ چڑیا کا جھوٹا پانی گھونٹ لے کر زبان پر رولتے ہیں، آنکھیں موند کر اس کی لذت میں ڈوب جاتے ہیں۔

فضہؑ چٹائیوں پر کھجور پھیلا رہی ہیں۔ ہولے ہولے گنگنا رہی ہیں۔
چٹائیں منہ اوندھاتے نڈھال پڑی ہیں
ریت سسکیاں بھر رہی ہے۔
سورج کی کمان سے کرنوں کے تیر چھوٹ چکے ہیں
زنبور نے تالو میں ڈنک مارا ہے
میری نس نس میں زہر اتر رہا ہے۔
نہر کی گود میں پانی مچل رہا ہے۔
میرے محبوب کی چھاگل پانی کے موتیوں سے چھلک اٹھی ہے۔
میں پیاسی ہوں
میری نس نس میں ۔۔۔۔۔

حسینؑ پانی کا پادیہ بھرے فضہؑ کے پاس جاتے ہیں۔ وہ پانی نہیں پیتیں۔ سب ہنستے ہیں۔

بابا تو حجرے میں بیٹھے قرآن کی ترتیب میں غرق رہتے ہیں یا غلاموں کا ہاتھ بٹانے لگتے ہیں لکڑیاں چیرنا۔ کھجوریں اتارنا۔ گھر کی مرمت۔ اماں بہت تھکی ہوں تو ان کے ہاتھ سے جھاڑو لے کر خود دینے لگتے ہیں۔ اتنے عظیم فاتح ہیں۔ اتنے بڑے فوجی جنرل ہیں مگر انہیں کسی کام سے عار نہیں۔

مگر کبھی اماں تنگ ترشی سے گھبرا اٹھتی ہیں تو شکایت بھی کر بیٹھتی ہیں۔ دن پریشانی میں گزر جاتے ہیں۔ جتنا اناج آیا تھا۔ مہمانوں کی خاطر مدارت میں ختم ہو گیا۔ حج کے دنوں میں لوگ رسول اللہؐ اور ان کے عزیزوں کے گھر کو اپنا گھر سمجھتے ہیں۔ لوگ بابا سے ملنے سرشام ہی سے آنے لگتے ہیں۔ سب کو بڑے اصرار سے کھانا کھلایا جاتا ہے۔

فقیر بھی جانتے ہیں اس گھر سے کبھی خالی ہاتھ لوٹنا نہ پڑے گا۔ اس لیے تبرک

داخل ہوتے ہی سیدھے ادھر کا رُخ کرتے ہیں۔ بہت تنگی بڑھ گئی تو طے پایا کہ باغ فدک رکھ دیا جائے۔ بابا باغ کا سوداگر کے سیدھے بازار چلے گئے کہ اناج لیتے آئیں گھر میں کچھ نہیں۔ اس سے پہلے کہ اناج خریدتے ایک شخص مل گیا۔ جو بری طرح رو پیٹ رہا تھا

"کیا ہوا بھائی؟" بابا نے پریشان ہو کر کہا۔

"بیوپار میں گھاٹا آگیا۔ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گیا۔ اوپر سے قرض خواہوں نے مکان پر قبضہ کر لیا۔ شام تک نہ ادا کیا تو میرے گھر والوں کو باہر نکال دیں گے۔ میری بیوی کا بچہ ہونے والا ہے۔ پورے دن سے ہے۔ سڑک پر وہ تو مر جائے گی۔"

علی ابن ابی طالبؑ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ فوراً سارے روپے اس آدمی کے حوالے کر دیئے۔

"بھائی! اس وقت تو اتنے ہی ہیں۔ تم ان قرض خواہوں کو دے کر راضی کر لو، کچھ دن صبر کریں باقی روپوں کا بھی انتظام ہو جائے گا۔"

وہ شخص پیروں پر گر پڑا۔ سارا دن گھومنے کے بعد بھی کسی نے اس کی مدد نہ کی تھی

"اے علیؑ تم دستِ خدا ہو۔ جیسے ہی میرا ہاتھ کھلا۔ تمہارا قرضہ ادا کر دوں گا۔"

"یہ قرضہ نہیں ہے۔ اسے ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔"

ویسے بھی علیؑ سے لوگوں کو قرض لیتے تو دیکھا گیا۔ کبھی کسی نے واپس کرنے کی نہ ضرورت محسوس کی۔ نہ کسی نے مانگا۔

گھر میں فاطمہ زہراؑ انتظار کی گھڑیاں گن رہی تھیں کہ کب اناج آئے اور وہ پیس کر پکائیں۔ ننھی زینب تو بھوک کی نیند میں سسکیاں بھر رہی تھی۔

علیؑ کچھ نادم سے واپس لوٹے۔ فاطمہ زہراؑ کو پتہ چلا تو ان کا دامن پکڑ لیا اور بولیں۔

"مجھے اور میرے بچوں کو فاقوں مارنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟"

علی سر جھکائے کھڑے رہے۔

"جواب دیجئے؟"

اتنے میں رسول اللہ آ گئے۔ بیٹی کو علیؓ کا دامن تھامے دیکھ کر چہرہ زرد ہو گیا۔ جلدی سے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

"فاطمہؓ! جانتی ہے یہ کون ہے؟"

"ہاں! جانتی ہوں۔ یہ میرے شوہر علیؓ ہیں۔ ذرا آپ ہی ان سے پوچھئے۔ کیا ان پر میرا اور بچوں کا کوئی حق نہیں۔ ہم کہاں تک دکھ اٹھائے جائیں؟"

"فاطمہؓ یہ علیؓ کا نہیں۔ تو نے میرا دامن تھاما ہے۔ مجھ سے اپنے سوال کا جواب مانگ بیٹی!"

فاطمہؓ نے دامن چھوڑ دیا۔ سر جھکا کر روہانسی ہو گئیں۔

"تو آپ ہی جواب دیجئے۔ آپ نے مجھے ایسے شخص کے پلے باندھ دیا۔ جو مجھے اور میرے بچوں کو دو وقت کا کھانا بھی نہیں دے سکتا۔"

"فاطمہؓ! میری بچی مجھے نہیں معلوم تھا کہ تو اتنی نادان ہے میں نے تو تیرے لیے دنیا کے بہترین انسان کا انتخاب کیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تجھے دنیا کی نعمتوں سے اتنی رغبت ہے کہ تو علیؓ کی عظمت کو نہ پہچان سکے گی۔ تیرے سامنے یہ شخص اس وقت مجرم بنا کھڑا ہے۔ اگر یہ چاہے تو آج کسی صوبے کا حاکم بلکہ کسی ملک کا بادشاہ بن سکتا ہے۔ کیا تو اس کی فتوحات کو بھول گئی۔ اگر یہ چاہے تو تجھے شہزادیوں کی طرح سنگ مرمر کے محل میں رکھ سکتا ہے۔ جہاں بیسیوں لونڈی غلام تیری خدمت پر مامور ہوں۔ اور تو اطلس و دیبا کے زریں لباس پہنے زر و جواہر میں غرق ایک ملکہ کی طرح عیش کر سکتی ہے۔ سونے چاندی کے تھالوں میں دنیا بھر کی نعمتیں تیری خدمت میں حاضر ہو سکتی ہیں۔ یہ شخص اپنے سر کے ایک اشارے سے ساری دنیا تیرے قدموں میں ڈال سکتا ہے۔ مگر یہ علیؓ ابن ابی طالب ہے۔ یہ اسلام کا دست بازو ہے دنیا اس کی ٹھوکر میں ہے۔ اور تو اس سے ایک سوکھی روٹی کی طلب گار ہے آج یہ بھی تجھے نہیں دے سکا۔ کیونکہ اس نے اپنے لیے یہی راستہ چنا ہے۔"

"معاف کر دیجئے بابا، مجھ سے گستاخی سرزد ہو گئی۔ مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔ وہ کچھ ڑی جو بغیر ضمیر فروشی کے نہیں مل سکتی۔ مجھے نہیں چاہیئے۔ اللہ معاف کر دیجئے۔" فاطمہؓ رو پڑیں

"مجھ سے نہیں، علیؓ سے معافی مانگو۔"

"نہیں نہیں۔ دراصل کوتاہی میری طرف سے ہی ہوئی۔ میں ۔ ۔ ۔ ۔"

علیؓ ندامت سے سر جھکا کر بولے۔

تب رسول اللہؐ نے پورا واقعہ سنا اور بے ساختہ ہنسنے لگے۔ کچھ درہم نکال کر دیئے اور کہا۔

بس اتنی سی بات تھی۔ "علیؓ جا کے کچھ کھانے کو لے آؤ۔" پھر بیٹی سے کہا۔

"اتنی سی بات پر بگڑ گئیں۔ جانتی ہو تم ایک شہنشاہ کی نہیں۔ ایک مفلس پیغمبر خدا کی بیٹی ہو۔ اور علی کی بیوی ہو۔ جو مجھے جان سے پیارا ہے۔ جس نے علی کا دل دکھایا۔ اس نے مجھے دکھ پہنچایا۔

نانا سب کو پیار کر کے چلے گئے۔ بچے باپ کے انتظار میں بیٹھے رہے۔ شام سے رات ہوئے کو آئی مگر وہ نہ لوٹے۔ فاطمہؓ بار بار دروازے کی طرف دیکھتی رہیں۔ بچوں کو پانی پلا کر سلانے کی کوشش کرتی رہیں۔ مگر علیؓ لوٹ کر نہ آئے۔

اب اتفاق یہ ہوا کہ جب علیؓ اناج خرید کر چلے تو ایک مصیبت کا مارا قدموں سے لپٹ کر بلک بلک کر رونے لگا۔

"آقا، تین دن کا فاقہ ہے۔ ننھے ننھے بچے بھوکے ہیں۔ اناج کا ایک دانہ نہیں۔ مدد فرمایئے آقا!

علیؓ نے بے سوچے سمجھے اناج اس کی جھولی میں الٹ دیا۔ گھر جانے کی ہمت نہ ہوئی جا کر بھاری قدموں سے مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔

رسول اللہؐ مسجد سے نکلے تو نیم تاریکی میں ایک شخص کو سر جھکائے بیٹھا دیکھ کر قریب آئے۔ علی کو دیکھ کر چونک پڑے۔

"علیؓ، بچوں نے کھانا کھایا؟"

"جی نہیں۔"

"کیوں؟"

انھوں نے رک رک کر سارا قصہ سنایا۔ رسول اللہؐ بے اختیار ہنسنے لگے۔

"بیوی کے ڈر سے یہاں چھپے بیٹھے ہو۔" اٹھا کر انھیں سینے سے لگا لیا۔ خیبر شکن، فاتح حنین، جن کا نام سن کر دشمن کا پتہ پانی ہوتا تھا۔ بھولے بیوی بچوں سے آنکھ چرائے مسجد کی سیڑھیوں پر چھپے بیٹھے تھے۔ رسول اللہؐ انہیں گھر لے گئے۔ وہاں سے کھانا لیا۔ پھر انہیں لے کر ان کے گھر گئے۔ سب نے ہنسی خوشی ساتھ مل کر کھانا کھایا۔

اس دن بچوں کو معلوم ہوا۔ ان کا خاموش، بوسیدہ کپڑوں والا باپ کتنا بڑا انسان ہے۔

ضرورت مند کو دینے کی یہ تعلیم کون جانتا تھا۔ ان معصوم بچوں کے لیے حق و انصاف کی خاطر سر دینے کی تمہید ثابت ہوگی۔

۲

حسنؓ اور حسینؓ کا بچپن نہایت خوش گوار گزرا۔ نانا کی طرف سے محبت کی فراوانی کے باوجود کبھی کبھی شکایت پیدا ہو جاتی تھی۔ ایک دن فاطمہ زہراؓ عصر کی نماز سے فارغ ہوئیں تو حسینؓ کے رونے کی آواز کان میں پڑی۔ بے قرار ہو کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ دیکھا دھاڑوں دھاڑ روتے چلے آرہے ہیں۔ دونوں بیٹے ماں کو آنکھوں کی طرح برابر عزیز تھے۔ مگر حسینؓ چونکہ چھوٹے تھے۔ ماں ان کے رونے سے زیادہ گھبرا جاتی تھیں۔

"کیا ہوا میرے لال!" انھوں نے بچے کو سمیٹ کر اٹھا لیا۔ حسینؓ کی ہچکی بندھی ہوئی تھی۔ منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔

"ضرور تمہیں حسنؓ نے ستایا ہوگا۔ وہ بہت شریر ہو گئے ہیں۔ ہر وقت میرے بچے کو رلاتے ہیں۔ بیٹا تم ان کے ساتھ اب ہرگز نہ کھیلنا۔ آنے تو دو ایسی خبر لوں گی کہ

یاد ہی کریں گے۔ پوچھوں گی کہ میرے بچے نے کیا قصور کیا تھا جو اسے رُلایا۔"

"نہیں امی! ہمیں بھائی نے نہیں ستایا ہمیں تو نانا جان سے شکایت ہے۔"

"یا خدا! نانا جان سے، وہ کیوں؟"

"امی ذرا ہمارا منہ سونگھئے، کیا ہمارے منہ سے بدبو آرہی ہے؟"

"نہیں بیٹے! تمہارے منہ سے تو تازہ گلاب اور مشک کی مہک آرہی ہے۔"

انھوں نے منہ چوم کر کہا۔

"تو پھر نانا نے بھائی کا منہ چوما اور ہمارے گلے پر بوسہ دیا۔ آخر کیوں؟"

"بیٹے! نانا جان تم دونوں پر جان چھڑکتے ہیں۔ پتہ نہیں کیا بات تھی جو انھوں نے فرق کیا، تم نے کوئی شرارت تو نہیں کی تھی؟"

"ہم نے کچھ بھی نہیں کیا، پھر وہ ہم سے ناراض کیوں ہیں۔؟

فاطمہ زہرا فکرمند ہو گئیں۔

"چلو میں ان سے خود پوچھوں گی، آخر کیوں ناراض ہیں؟"

انھوں نے جوتے پہنے، سر پر ردا سنبھالی۔ حسینؑ کو گود میں اٹھایا اور فضہ کو آواز دی۔

فضہ نے سلمان کو پکارا اور فاطمہ زہراؑ اسی وقت مسجد کی طرف روانہ ہو گئیں۔

لوگوں نے دیکھا بنت پیغمبر مسجد کی طرف جا رہی ہیں تو حیران رہ گئے۔ کیا مصیبت آن پڑی کہ بیٹی باپ کے پاس گھبرائی ہوئی جا رہی ہیں۔ رسول خداؐ اصحابؓ کے مجمع میں بیٹھے کسی اہم مسئلہ پر گفتگو فرما رہے تھے۔ بیٹی کو آتے دیکھا تو حسب عادت تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ اصحابؓ بھی انھیں اکیلا چھوڑ کر ادھر ادھر ہو گئے۔

بیٹی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر گھبرا گئے۔ حسینؑ ماں کے شانے میں منہ چھپائے سسکیاں بھر رہے تھے۔ تھوڑی دیر حیرت اور مسرت سے مغلوب ماں اور بیٹے کو تکتے رہے۔ ایسا لگتا تھا۔ جیسے سورج کے پہلو میں چاند۔ پھر نرمی سے پوچھا۔

"کیا ہوا؟ حسینؑ کیوں رو رہا ہے؟"

"بابا آپ حسینؑ کو چاہتے ہیں؟"

"اس میں کیا شک ہے؟"

"مگر حسنؑ آپ کو زیادہ پیارے ہیں؟"

"یہ تم نے کیسا جانا؟"

"آپ کے رویے سے! ماتا کے جوش میں فاطمہ زہراؑ کہتی چلی گئیں۔ آپ نے اپنے لاڈلے حسنؑ کا منہ چوما، اور میرے حسینؑ کے گلے کو بوسہ دیا۔ یہ عجیب کیسی؟ آپ کی نظروں میں دونوں برابر ہیں تو یہ فرق کیوں؟ مجھے آپ جیسے منصف مزاج اور مساوات کے علم بردار سے اس بے انصافی کی قطعی امید نہ تھی۔ آپ خود ہی قرآن کا بے جا ناز اٹھاتے ہیں۔ یہ آپ ......"

"حسینؑ ہم سے ناراض ہیں؟" رسول اللہؐ مسکرائے۔

"آپ سے نہ روٹھیں گے تو پھر کس سے روٹھیں گے۔"

رسول خداؐ نے کوئی جواب نہ دیا۔ کسی خیال میں غرق شکایت سنتے رہے باپ کو خاموش دیکھ کر فاطمہ زہراؑ نادم ہوگئیں۔

"معاف کیجئے بابا جان، حسینؑ سے کوئی نادانی میں خطا ہوگئی تو اللہ اسے بخش دیجئے اسے آپ کی قدم بوسی کے لیے لائی ہوں۔ چلو حسینؑ نانا کے قدموں پر گر کے معافی مانگو۔ وہ تمہیں کم چاہیں یا زیادہ، تمہاری فرماں برداری میں فرق نہ آنا چاہیئے۔ نہ شکایت ہونی چاہیئے۔" حسینؑ نے اپنے ننھے ننھے ہاتھ جوڑ کر نانا کے قدموں پر سر رکھ دیا۔

"نانا! ہم آپ کو اچھے نہیں لگتے۔ ہمارے منہ سے بو آتی ہے؟"

رسول خداؐ نے بیٹی کو دیکھا۔ پھر نواسے کو۔ بے اختیار آنکھیں چھلک اٹھیں۔ حسینؑ کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

فاطمہ زہراؑ بھی رونے لگیں۔

"آپ تو جانتے ہیں کہ میں مفلس ہوں۔ ان بچوں کو ماتا کے سوا کچھ نہ دے سکی آپ کی محبت کے سہارے ان بچوں کو پالا ہے۔ خدا نہ کرے آپ ناراض ہو گئے تو یہ

کیسے جئیں گے۔ ایک دن آپ کو نہیں دیکھتے تو بے کل ہو جاتے ہیں۔" مگر باپ خاموش رہے۔ ان کے آنسو دیکھ کر بے قرار ہو گئیں۔

"نہیں میرے پیارے بابا جان۔ آپ کے آنسو دیکھ کر میرا کلیجا منہ کو آتا ہے۔ کبھی کوئی شکایت نہیں کروں گی۔ اللہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ حسینؑ کے آنسو دیکھ کر میرا جی بے قابو ہو گیا۔ آپ کن اہم معاملات میں مشغول تھے۔ میں یہ ذرا سی بات لے کر آ گئی۔"

"فاطمہؓ تو جانتی ہے، تیرے یہ بچے کتنے عزیز ہیں۔ ان کی صورت دیکھ کر ہی زندگی کا لطف دو چند ہو جاتا ہے۔" پھر آپ نے حسنؓ کا منہ چوما اور حسینؑ کے گلے کا بوسہ دیا۔ "پر کیوں؟ شاید میں ٹھیک سے نہ بتا سکوں اور تجھ میں سننے کی تاب بھی نہ ہو گی۔"

"بابا! اگر آپ اپنے مبارک ہونٹوں سے میری موت کی خبر سنائیں تو بخوشی سن لوں گی۔ آپ کے الفاظ میرے کانوں کے لیے آسمانی آواز کا درجہ رکھتے ہیں۔ ایسی کیا بات ہے کہ آپ بتاتے ہوئے تکلف محسوس کر رہے ہیں۔ میں ایسی کم ہمت نہیں کہ اپنی خودداری کھو بیٹھوں۔"

"فاطمہؓ! تو ماں ہے میری جان! ماں کا دل بڑا کمزور ہوتا ہے۔ مگر حقیقت کو چھپانا بھی مناسب نہیں۔ تیری بدگمانی دور کرنا بھی ہو گی۔ کچھ دیر ہوئی یہ دونوں میرے پاس آئے۔ میری گود میں بیٹھ گئے۔ میرے دل سے ایک آواز آئی۔" "اے محمدؐ! تیرے نواسے ایک دن خدا کی راہ میں قربان ہوں گے۔ حسنؓ بڑے دولت نواز ہیں۔ ہر ایک پر بھروسہ کر لیتے ہیں۔ انھیں ان کے دوست اور پیارے ہی زہر دیں گے۔ حسینؑ کو بھی سیاست اور فن سپاہ گری سے شوق ہے۔ وہ کسی کی دھمکیوں میں آنے والے نہیں۔ نہ کسی کے ورغلانے میں آئیں گے۔ اس لیے ٹکرا جائیں گے۔ خواہ جھوٹ اور فریب کا پلہ کتنا بھی بلند ہو۔ یہ سر جھکانے والوں میں سے نہیں۔"

"میرے بچوں پر قہر ٹوٹے گا اور آپ بیٹھے دیکھیں گے۔ ان کے باپ کیسے برداشت کریں گے؟" "ہم اس وقت اس جہان میں نہ ہوں گے۔ اور نہ علیؓ ہوں گے۔"

"خدا وہ دن نہ دکھائے کہ آپ کا سایہ میرے سر سے اٹھے یا میرا سہاگ اجڑے

میں آپ دونوں کے سہارے زندہ ہوں۔ آپ کے ہوتے ہوئے کس کی مجال ہے کہ میرے بچوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے یا میری گود کو آگ لگائے۔ بابا میرے بچوں پر آنچ آئی تو میں آپ کا دامن پکڑوں گی۔

"ہمارے جیتے جی تمہارے پر کوئی آفت نہیں آئے گی۔ مگر فاطمہؓ! ایک دن ہم نہ ہوں گے۔ علیؓ بھی نہ ہوں گے۔ تم بھی نہ ہو گی۔ تب کیا ہوگا۔ اس کے آثار تو ہیں ابھی سے نظر آ رہے ہیں۔ کون ہمارے دوست اور کون دوست کے بھیس میں دشمن جو صرف موقع کی گھات میں ہیں۔ اس کا ہمیں بہت کچھ اندازہ ہے۔ حقیقت کو نظر انداز کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔"

"مگر کیوں؟ میرے بچوں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے؟"

"یہ محمدؐ کے بچے ہیں۔ علیؓ کی جواں مردی، دلیری اور حق پرستی قابلِ رشک ہے ایسے بھی اللہ کے بندے ہیں جو علیؓ کی فضیلت کے دل سے قائل ہیں۔ مگر ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو علیؓ کی جملہ صفات کو اپنے وجود کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ کون صدقِ دل سے اسلام لائے۔ مگر خال خال ایسے بھی ہیں جو صرف مصلحتاً ہمارے ساتھ آ گئے ہیں۔ ہماری آنکھیں بند ہوتے ہی یہ سر اٹھانے سے گریز نہ کریں گے۔"

"علیؓ سے کسے شکایت ہو سکتی ہے! وہ تو اللہ کے نیک بندے ہیں۔"

"علیؓ کی رحم دلی اور مروت نے غریبوں کے دلوں میں بے شک جگہ پائی ہے۔ مگر جو شان و شوکت کے بھوکے ہیں وہ ان کی رواداری اور انکساری سے چڑتے ہیں۔"

"مگر میرے بچوں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے؟"

"وہ علیؓ کی اولاد ہیں اس لیے تمام وہ مصائب جن کا مقابلہ علیؓ کو کرنا پڑے گا انہیں ورثہ میں ملیں گے۔ سب سے زیادہ حسنؓ اور حسینؓ ہی پر اثر پڑے گا۔ کیوں کہ تمہارے یہ دونوں بچے باپ کے نقشِ قدم پر چلنے لگے ہیں۔"

"تو کیا علیؓ اس قابل نہیں کہ ان کے بچے ان کے نقشِ قدم پر چلیں؟"

"اگر میں علیؓ کی صفات بیان کروں تو بہت سے لوگ اسے خدا کا رتبہ دے کر

ان کی پرستش کرنے لگیں گے۔ مگر علیؓ کی راہیں کانٹوں سے بھری ہیں۔ ان کے نقشِ قدم پر چلنے والوں کو بڑی آزمائش سے گزرنا پڑے گا۔ اور مجھے یقین ہے کہ وہ اس آزمائش میں پورے اتریں گے۔"

"یا اللہ میرے بچوں کو کس قصور کی سزا ملے گی؟"

"ان کا سب سے بڑا گناہ ان کی بے گناہی ہو گی۔ حق کی حمایت کرنا کھیل نہیں میری اُمت کے جابر اور فاسق لوگ انھیں ضمیر فروشی پر مجبور کریں گے۔ تمہارے لال مجھے ضمیر فروش نہیں نظر آتے۔"

یہ کہہ کر انہوں نے حسینؓ کے لب چوم لئے۔

"وحسینؓ اب خوش ہو۔ ہم نے تمہاری شکایت دور کردی۔"

حسینؓ کھلکھلا کر ہنس پڑے اور نانا کی گردن میں بانہیں ڈال کر پوچھا۔

"نانا جان ہمارا گلا کٹے گا؟"

"ہاں بیٹے!"

"بہت خون بہے گا؟"

"ہاں، اتنا خون بہے گا کہ بڑے بڑے پہاڑ غرق ہو جائیں گے۔"

"مگر نانا جان! آپ نے ہمارے گلے کو بوسہ دیا ہے۔ کیا اس کی برکت سے تلوار ٹوٹ نہ جائے گی؟"

"ضرور ٹوٹ جائے گی، تمہارے گلے سے ٹکرا کر ظلم و جبر کی تلوار پاش پاش ہو جائے گی۔"

"تب تو ہمارا گلا ایک بار اور چوم لیجئے۔"

رسولِ خداؐ بیٹے کی بات پر جھوم اٹھے بار بار گلے کے بوسے لئے۔

"فاطمہؓ! تمہارا یہ بچہ بڑا منطقی ہے۔ حسنؓ جذباتی ہے۔ مگر یہ تو اپنے حریف کو ناکوں چنے چبوائے گا۔"

بیٹی اور نواسہ کو لے کر رسول اللہؐ گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستہ

میں حسنؑ دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ حسینؑ کو نانا کی گود میں دیکھ کر دوسرے کندھے پر خود سوار ہونے کی ضد کرنے لگے۔ رسول اللہؐ وہیں خاک پر اکڑوں بیٹھ گئے۔ حسنؑ اچک کر چڑھ گئے۔ ان دونوں کے لیے وہ مدینہ کی گلیوں سے گزرتے ہوئے فاطمہ زہراؑ کے گھر پہنچے۔ بچوں کو اتار دیا۔ دیکھا کہ بیٹی کے چہرے پر ایک عزم تھا، وقار تھا۔ آنسوؤں کا نام و نشان نہ تھا۔

"بابا جان کیا میرے لاڈلوں کا خون رائیگاں جائے گا؟"

"نہیں، حق پر قربان کرنے والوں کا خون رائیگاں نہیں جاتا۔ آنے والی تمام نسلوں کے لیے ان کی جانیں مشعلِ راہ کا کام دیں گی۔ ان کا نام لے کر دنیا سے ظلم و تشدد کی بیخ کنی ہو گی۔ ان کا بچہ بچہ اپنی ہمت بلند اور جواں مردی، صاف گوئی اور حق پرستی کی حفاظت میں اپنی جان دے گا۔ حق پر مٹنے والے کبھی فنا نہیں ہوتے۔ رہتی دنیا تک لوگ ان کا سوگ منائیں گے۔ ان کے قاتل مقہور اور گمنام ہو جائیں گے۔ کوئی ان کا نام لیوا نہ ہو گا۔"

"میں بڑی خوش نصیب ماں ہوں بابا جان!"

"پہلا غم"

جب رسول اللہؐ آخری بار حج کو تشریف لے گئے۔ تو حسنؓ اور حسینؓ ان کے ساتھ تھے۔ اپنے نانا اور والد کے ساتھ دونوں بچوں نے حج کے فرائض ادا کیے۔ اور ان تاریخی مقامات کو پہلی بار اپنی آنکھوں سے دیکھا جن کا ذکر اپنے بزرگوں سے سنا کرتے تھے۔

حج سے واپسی کے وقت غدیر خم میں قیام کیا تو خلقت اپنے پیغمبر اور ان کے پیارے نواسوں کے دیدار کو ٹوٹ پڑی۔ وہاں پہلی بار نانا جان نے ان کے والد علیؓ بن ابی طالب کی صفات پر روشنی ڈالی۔

"آپ نے فرمایا۔

"علیؓ میرے عزیز، رشتہ دار اور قریب ترین دوست و غمخوار ہیں۔ میں ان کی دلیری، صاف گوئی اور عالمانہ قابلیتوں سے بہت مطمئن ہوں۔ وہ میرے پیغام کے وارث ہیں۔ مجھے ان کے کام پر بھروسہ ہے۔

لوگوں نے علیؓ کو بڑے جوش و خروش سے مبارک باد دی۔ اور بچوں نے پہلی بار اپنے والد کو کچھ کچھ پہچانا۔ وہ نانا سے اس قدر مانوس تھے کہ باپ کی قربت میں کچھ تکلف محسوس کرتے تھے۔ نانا ان کے معاملے میں موم تھے مگر باپ کا از حد رعب تھا۔ ایک بار نانا سے پیغام الٰہی سن کر دونوں ماں کو سنانے بھاگے بھاگے آئے۔ زبان کھلنے سے پہلے ہی لڑکھڑا گئی۔ سہم کر بولے۔

"بابا جان گھر میں ہیں ؟"

بابا جان حجرے سے نکل آئے۔ دونوں کو پیار سے گود میں اٹھا لیا۔ اور پیغام سن کر ہمت افزائی کی۔ اس کے باوجود تکلف باقی رہا۔ نانا کی زبانی ان کی تعریف سن کر دونوں انہیں فخر اور احترام سے دیکھنے لگتے ہیں۔ اس دن انھیں معلوم ہوا تھا کہ ان کا خاموش طبیعت اور منکسر المزاج باپ کتنا عظیم انسان ہے۔

حج آخر سے واپس ہوئے تھوڑا عرصہ گزرا تھا کہ رسول خدا کو مرض الموت نے گھیر لیا اس وقت حسنؓ سات سال اور کچھ ماہ کے تھے۔ حسینؓ ان سے قریب سال بھر چھوٹے تھے۔

جوں جوں نانا کی علالت میں شدت ہوتی گئی۔ سارے گھر کی بے چینی اور پریشانی بڑھتی گئی۔ ماں کی آنکھ سے آنسو نہ تھمتے تھے۔ بابا جان گھبرائے اور پریشان دن رات تیمارداری میں لگے رہتے۔ بچوں کا غم سے عجیب حال تھا۔ بار بار اپنے نانا کے سینے پر سر رکھ کر سسکیاں بھرتے۔ بچوں کو دیکھ کر ان کی تکلیف کم ہو جاتی۔ مسکرا کر انہیں تسلی دیتے۔

پھر وہ منحوس گھڑی بھی آگئی جب گھر عیادت کرنے والوں سے بھر گیا سب زار و قطار رو رہے تھے۔ رسول اللہ بار بار علیؓ کی طرف دیکھتے، کچھ فرمانا چاہتے تھے۔ مگر آہ و بکا کی صداؤں میں ان کی آواز ڈوب جاتی۔ جب قدرے سکون ہوا تو رسول اللہؐ سہارے سے اٹھے اور فرمایا۔

موت برحق ہے۔ تم موت سے کیوں ڈرتے ہو؟ نیک اعمال پر بھروسہ رکھو ایک دن سب کو اپنے پیدا کرنے والے رب العزت کے حضور میں جانا ہے۔ میں تم لوگوں میں ہمیشہ رہنے کے لیے نہیں آیا۔ میں عنقریب اپنے رب کے حضور میں جانے والا ہوں خدا کی کتاب میں تمہارے لیے چھوڑے جا رہا ہوں۔ اس کا ایک سرا خدا کے ہاتھ میں ہے۔ دوسرا تمہارے ہاتھ میں۔ اس کتاب سے نافرمانی کرنا۔ اس کی تلاوت میں غفلت نہ کرنا۔ اس میں تمام وہ باتیں ہیں۔ جو تمہیں سیدھے راستے پر لے جائیں گی۔

آپس میں نہ لڑنا نہ دشمنی کرنا۔ اپنے بھائی بندوں سے خیانت نہ کرنا کہ یہ خدا کا حکم ہے
میرے عزیزوں، دوستوں کا ایسا ہی خیال رکھنا۔ جیسا میرا رکھا۔ میری طرح یہ بھی
تمہیں نیک صلاح دیں گے۔"

گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ رسول اللہؐ کا سر مبارک علیؓ کی گود میں تھا۔ بچے ان
کے قدموں سے لگے رو رہے تھے۔

پھر چراغِ نبوت گل ہو گیا۔ بچوں کے پیار و محبت کی دنیا ویران ہو گئی۔ مدینے
کی گلیوں میں غم و اندوہ کے بادل چھا گئے۔ ہر چہار سو چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

کچھ لوگوں نے آ کر علیؓ بن ابی طالب کو رائے دی کہ وہ چل کر خلافت کی باگ ڈور
سنبھالیں۔ مگر انہیں ہوش نہ تھا۔ انھوں نے اپنے ہاتھ سے رسولِ خدا کو غسل دیا
بعد نمازِ جنازہ سپردِ خاک کر دیا گیا۔

نانا کے بعد بچوں کی دنیا ہی بدل گئی۔ زمانہ اپنی کج رفتاریاں دکھانے لگا۔ لوگوں
نے ایسی نظریں پھیر لیں جیسے پہچانتے ہی نہیں۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ چن لیے گئے۔ لوگوں نے آ کر علیؓ سے بہت کہا کہ
تاسے سے خلافت کے آپ حق دار تھے۔ مگر انھوں نے قطعی کوئی توجہ نہ دی۔ بلکہ
احتجاج کیا۔

"میں پیغمبر خدا کا خادم ہوں۔ بساط بھر ان کی امت کی خدمت کرتا رہوں گا۔"

علیؓ سے عقیدت رکھنے والوں کو یہ بات ناگوار گزری۔ وہ ان کی خاطر جانیں
دینے کو تیار تھے۔ مگر علیؓ نے خونی جھگڑے سے نفرت کا اظہار کیا اور اب ان کا زیادہ وقت
قرآن کے مطالعہ اور تدوین میں گزرتا۔ مگر علیؓ کی فضیلت کسی سے پوشیدہ نہ تھی۔
ان کے اس باوقار رویّے سے اور بھی لوگ ان کی قدر کرنے لگے۔ جتنا وہ گوشہ نشین
ہوتے گئے، ان کا مطالعہ بڑھتا گیا۔ مشاہدے میں گہرائی پیدا ہوتی گئی۔ عام دکھی
انسانوں کو ان سے عقیدت بڑھتی گئی۔ لوگ اپنے دکھ درد لے کر ان کے پاس آتے
وہ حتی الامکان جان توڑ کر ان کی خدمت کرتے۔ ہر طرح کی مدد کرتے، ادائے دلجمعی

سختے ہر ایک کو سہارا دیتے۔ ان کی یہ بڑائی اور فراخ دلی ان کے حق میں سم قاتل ثابت ہوئی۔ لوگ ان کی بے غرضی، علو ہمتی اور عجز یا بد دری سے خوف زدہ ہو گئے۔ علیؓ عوام کے دلوں سے قریب ہیں۔ یہ بات آگے چل کر بڑی اہم صورت اختیار کر سکتی ہے۔

دنیا ہی بدل گئی۔ وہ بچے جو رسول اللہؐ کے کاندھوں پر سوار ہو کر مدینے کی گلی کوچوں میں نکلا کرتے تھے۔ اب گوشہ نشین ہو گئے۔ علیؓ کو جو وقت بھی اپنے مطالعہ سے ملتا وہ بچوں کی تربیت میں صرف کرتے۔ بچوں کا زیادہ وقت حصولِ علم و فضل میں صرف ہوتا۔ خود پر ایسی پابندیاں عائد کر لیں کہ کسی کو انگلیاں اٹھانے کا موقع نہ مل پائے۔ ابھی نانا کی جدائی کا غم تازہ ہی تھا کہ بچوں پر ایک اور مصیبت ٹوٹ پڑی۔ سال بھر کے اندر اندر ہی ان کی پیاری ماں بھی انہیں روتا تڑپتا چھوڑ کر اللہ کو پیاری ہو گئیں۔

علیؓ کو اپنی پیاری بیوی کی جدائی کا ناقابلِ بیان صدمہ پہنچا۔ وہ ان سے والہانہ عشق کرتے تھے۔ ان کی زندگی میں انھوں نے کبھی دوسری عورت کی طرف نظر نہ ڈالی۔ انھیں سپردِ خاک کرتے وقت اشک بار آنکھوں سے دیکھا اور کہا۔

"یا رسول اللہؐ! آپ کی پیاری بیٹی نصیب ہیں کہ وہ آپ کے پاس آ رہی ہیں ہمارے دلوں میں جو بلند مقام انھیں حاصل تھا۔ وہاں بھی انہیں بلند مرتبہ ملے گا۔ ان کی جگہ کوئی نہ لے سکے گا۔"

فاطمہ زہراؓ کی وفات کے بعد انھوں نے بڑی شفقت اور پیار سے بچوں کی پرورش کی۔ انھوں نے اپنی بیٹیوں زینبؓ اور ام کلثومؓ کو کبھی بیٹوں سے کم نہ سمجھا۔ انہیں تریتِ تعلیم دی۔ زینبؓ کو دیکھ کر ان کا دل باغ باغ ہونے لگتا۔ کیونکہ وہ بالکل ماں کے طور طریقے کر پیدا ہوئی تھی۔ اتنی سی عمر سے ہی ماں کے بعد ان کی ساری ذمہ داریاں اپنے سر لے لیں۔ بڑے بھائیوں کا ایسا خیال رکھتیں کہ انہیں کبھی ماں کی کمی نہ محسوس ہونے دی ان کے بچپن ہی میں بڑھاپا چھا گیا۔

بھائی بھی ان پر جان دیتے تھے۔ چھوٹی تھیں۔ پر ان کا کہا کبھی نہ ٹالا۔

شکل و صورت میں زینبؓ باپ سے بہت مشابہ تھیں۔ مگر عادت و خصلت ماں جیسی پائی تھی۔ اس لیے لوگ انہیں زہراؑ ثانی کے لقب سے پکارتے تھے۔ ماں نے آخری وقت بیٹی کو سینے سے لگا کر کہا تھا۔

"بیٹی اپنے بھائیوں کا ہمیشہ خیال رکھنا۔ میں انہیں تمہارے سپرد کرتی ہوں۔ جب جب اپنے گھر کی ہو جاؤ، تب بھی ان کو نہ بھلا دینا"

ماں کے الفاظ بیٹی کے دل پر نقش ہو گئے۔ اور انہوں نے اپنی زندگی کی ہر سانس کے ساتھ بھائیوں کا خیال کیا۔

علیؓ ابن ابی طالب نے عرب کی بیود اور کچلی ہوئی عورت کو اس کا حق دلانے کے لئے بہت کچھ کیا۔ نہ وہ حاکم تھے نہ انہیں ملک کے قانون پر اختیار تھا۔ پھر بھی دکھیا عورتیں ان کے پاس فریاد لے کر آتیں۔ وہ عورت کی بے حرمتی پر بے قرار ہو جایا کرتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے اپنی بیٹیوں کو بیٹوں کی طرح تسلیم دی۔ جب کہ عام لڑکیاں اس وقت تک اس نعمت سے محروم تھیں۔

زینبؓ نے بھی اس بیش بہا موقع سے فائدہ اٹھایا۔ وہ اپنے باپ کو فخر انسانیت سمجھتی تھیں۔ ان کے ایک ایک لفظ کو ذہن نشین کرتیں۔ ماں کے بعد باپ کی نگرانی میں انھوں نے فلسفۂ زندگی کا مطالعہ کیا۔ علیؓ سب بچوں کو اپنے پاس جمع کر لیتے۔ اور ان سے بڑی سنجیدگی سے گفتگو کرتے۔

"جب دنیا کی نعمتیں مجھے اپنی طرف بلاتی ہیں تو میں انھیں دھتکار دیتا ہوں۔ میں دنیا سے کہہ دیتا ہوں۔ دور ہو جا مجھ سے! جہاں جانا ہو، چلی جا۔۔۔ میں تیرے چنگل سے نکل چکا ہوں۔ تیری کھچائی ٹھوکروں سے اپنے پیر بچا چکا ہوں۔ تو ہی بتا وہ لوگ کہاں گئے۔ جو تیرے ناز و انداز میں پھنس گئے۔ تیری آسائشوں پر فریفتہ ہو گئے۔ دیکھ، آج وہ قبروں میں بند ہیں اور کرۂ ارض کی خاک بن چکے ہیں۔ اے دنیا! اگر تیرا کوئی جسم ہوتا اور تو میرے ہاتھ آجاتی تو میں تجھے بڑی سخت سزا دیتا۔

افسوس کرتو تے کہتے: بھولے بھالے انسانوں کو جھوٹی آرزوؤں کے جال ... نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ کتنے بادشاہوں کے تاج خاک میں مل گئے۔ اے دھوکہ باز دنیا! تیری پھسلن کی جگہ جس کا پاؤں پڑا۔ وہ پھسل گیا۔ جو تیری موجوں پر سوار ہوا، ڈوب گیا۔ تجھ سے بچ کر کترا کر نکل جانے والا بڑا خوش نصیب ہے۔ اے دنیا! تو بس ایک لمحہ ہے جو ختم ہونے والا ہے۔!"

بچے دم سادھے سنا کرتے۔ اپنے نانا کو یاد کرتے تھے۔ کس قدر سادہ مزاج تھے غلاموں کے ساتھ اکڑوں بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ اپنے جوتے خود ٹانکتے۔ خود کپڑوں میں پیوند لگاتے اور بے پالان کے گدھے پر بے تکلفی سے سوار ہو جاتے۔

بابا ان کی ہر بات میں بڑی شدت سے پیروی کرتے تھے۔ مگر یہ انسانی خصلت ہے کہ بے غرض اور غنی انسان سے رشک کرنے لگتا ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے۔ جو ان سے خوش ہونے کے بجائے۔ ان پر رشک کرتے تھے۔ اور بیر باندھتے تھے۔ ان کے راستے میں کانٹے بچھانے سے بھی گریز نہ کی۔ مگر علیؑ زخمی تلواروں کے باوجود امن اور سلامتی کی راہ پر چلتے رہے۔

جوں جوں شعور آتا گیا۔ بچوں کے دل میں اپنے باپ کی وقعت اور عزت بڑھتی گئی۔ نانِ خشک اور پیوند لگے لباس کے باوجود جب سب یک جا جمع ہو کر تاروں کی چھاؤں میں علیؑ بن ابی طالب سے ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں بات چیت کرتے تو زندگی کی ساری محرومیوں کا ازالہ ہو جاتا۔ علیؑ ایک بلند مرتبہ شاعر تھے۔ بچے مسحور ہو کر سنتے۔ علی کہتے

"پاک ہے وہ ذات
جس پر لپیٹ زمین کے قطعوں
اور باہم ملے پہاڑوں کی چوٹیوں پر
اندھیری رات کی اندھیاریاں چھائی ہوئی ہیں۔
اور پُر سکون شب کی ظلمتیں پوشیدہ نہیں۔

اور نہ آسمان پر پھیلی شفق اس سے چھپی ہے۔
نہ رعد کی گرج اس سے مخفی ہے۔
اور نہ وہ چیزیں اس پاک پروردگار سے چھپی ہیں۔ جن پر بادلوں کی بجلیاں کوند
کر نابید ہو جاتی ہیں۔
اندھیرے کے سیاہ پردے بھی نور کی ضو پاشیوں کو نہیں روک سکتے۔
نہ شب ہائے تاریک کے پردوں میں اس کے حکم سے نافرمانی کی طاقت ہے
نہ آسمانوں میں چاندنی کی پھیلی ہوئی جگمگاہٹ اس کے حکم کے بغیر دھندلی ہو سکتی ہے۔
اور وہ سب جانتا ہے کہ بادل کے لطیف قطرے کہاں گریں گے
اور کہاں جمع ہو کر بہتے دریا بن جائیں گے۔
اور جو چیونٹیاں کہاں دیکھی خود کو کھینچے جا رہی ہیں
اور مچھروں کو کون سی روزی کفایت کرتی ہے۔
مادہ اپنے پیٹ میں کیا لئے ہے
وہ رب ذوالجلال سے اس سے کوئی بات چھپ نہیں سکتی۔"

بچے ان دنوں کی یاد میں اداس ہو جاتے۔ جب نانا زندہ تھے اور وہ ماں کی گود سے محروم نہ تھے۔ تب لوگ پروانوں کی طرح ان کی طرف لپکتے تھے۔ ان کے دیدار کو دور دور سے آتے تھے۔

بچوں کو بڑا تعجب ہوتا تھا کہ ان کے والد صاحب عرب کے نامور سورما تھے جن کی تو تمام مملکت میں دھاک بیٹھی تھی۔ جنہوں نے رسول خدا کے زمانے میں بڑے بڑے معرکے سر کئے تھے۔ وہ لوگوں کی بے تو... ی اور بے اعتنائی صبر و تحمل سے برداشت کر رہے تھے

"بہادری صرف میدان جنگ میں دشمن سے ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہی نہیں۔ اگر جنگ سے ملک کی تباہی و بربادی کا خطرہ ہو تو صبر کرنا عین شجاعت ہے۔" علیؑ فرماتے ہیں کہ ہم کسی کے غلام نہیں۔ ہم آزاد پیدا ہوئے ہیں۔ اور اس آزادی کو برقرار رکھنا ہی کافی ہے۔"

علیؓ

علیؓ ابن ابی طالب کے بچے اور رسول خداؐ کے نواسے کن حالات میں سن بلوغ کو پہنچے، اس کا اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ زینبؓ بنت علیؓ نے اپنے بزرگ باپ سے نیک تربیت سے وہی کچھ حاصل کیا۔ جو ان کے بھائیوں کو ملا۔ اگر فاطمہ زہراؓ کا حلم، خدا ترسی، خاکساری، ایثار، صبر و برداشت اور انسان دوستی ملی تھی۔ تو علیؓ ابن ابی طالبؓ کی جرأت، حوصلہ مندی، بے خوفی، حق گوئی، شجاعت استقلال، فصاحت و بلاغت بھی ورثہ میں پائی۔ زینبؓ بنت علیؓ جوان ہوئیں۔ تو ان کے حسن و جمال، علم و فضل کا چرچا دور دور پھیل گیا۔ انہیں لوگ "عاقلۂ عرب" کے لقب سے یاد کرتے تھے۔

سوتیلی مائیں، ام البنین، اسماء بنت عمیس، اور امامہ بنت ابی العاص کے ساتھ بڑے پیار، محبت کے ساتھ زندگی گزری۔ سب بڑے سکون سے مل جل کر رہتے تھے۔ گھر کی فضا نہایت خوشگوار تھی۔ ان کی مائیں ان سے پیار بھی کرتی تھیں۔ اور قدر و منزلت بھی کرتی تھیں۔ انہیں دیکھ کر فاطمہ زہراؓ یاد آجاتی تھیں۔ تنگ ترشی میں بھی فراخی پیدا کر کے گزر بسر کرنے کا فن انہیں بخوبی آتا تھا۔ کم سن ہوتے ہوئے بھی ان کی رائے صائب سمجھی جاتی تھی۔

خاندان میں عبداللہ بن جعفرؓ کے فضل و کمال کا چرچا تھا۔ وہ زندۂ جاوید حضرت جعفر طیارؓ کے بڑے صاحبزادے تھے۔ ان کی جملہ خوبیوں کو دیکھ کر علیؓ نے اپنی پیاری بیٹی کی نسبت کے لیے انہیں منتخب کر لیا۔

عبداللہ بن جعفرؓ ہاشمی نوجوان تھے۔ ان کی پیشانی مہر درخشاں کی طرح روشن تھی۔ صورت اور سیرت سے رسول خدا سے بہت مشابہ تھے۔ رسول خداؐ بھی ان کے قدرداں تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت میں بہت دلچسپی لیتے تھے

شادی کے بعد زینبؓ کو محسوس بھی نہ ہوا کہ وہ ایک گھر سے دوسرے گھر چلی گئیں۔ گھر کا ماحول پرسکون تھا۔ عبداللہ بن جعفرؓ قابل قدر انسان تھے اور کردار کے لحاظ سے ایک زندہ شخصیت تھے۔ اسلامی امور کے ماہر تھے۔ علیؓ بن ابی طالب کے دست راست کی حیثیت سے ان کا علمی اور دفاعی مہم میں ان کا گراں قدر حصہ تھا۔ خاندانی روایات کے امین تھے۔ انھوں نے سماج اور دین کی ترقی میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ انہیں دریائے سخاوت کہا جاتا تھا۔ مگر شادی کے بعد بھائیوں کی محبت، اور خبرگیری میں کمی نہ آئی۔ زینبؓ بغیر بھائیوں کی صورت دیکھے بھی نہ رہ سکتی تھیں۔ ان کی بیویوں اور بچوں سے بے انتہا انس تھا۔ وہ بھی ان پر جان فدا کرتے تھے۔ ان کے بھائیوں کے بچے اپنی ماؤں سے زیادہ پھوپھی سے مانوس تھے۔ وقت گزرتا رہا۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد علیؓ بن ابی طالب کے سوا کوئی رہنما نظر نہ آتا تھا۔ حالات ایسے بگڑ چکے تھے کہ قابو میں لانے کی کوئی صورت نہ تھی لوگ جوق در جوق ان کی طرف آنے لگے۔ مگر انہیں ایسی گوشہ نشینی کی عادت ہو گئی تھی کہ ہجوم سے وحشت ہوتی تھی۔ جب لوگوں کی طرف سے تقاضا بڑھا تو کبیدہ خاطر ہو کر کہنے لگے۔

"میری جان چھوڑو، کسی اور کو تلاش کرو۔ تم لوگ اتنے خود سر ہو چکے ہو کہ جیسے بے مہار اونٹ۔ تم جانتے ہو، میں بہت سخت گیر ہوں۔ مجھے اپنا امیر بناؤ گے تو پچھتاؤ گے۔ میں تمہیں ہرگز کسی قسم کی چھوٹ نہیں دوں گا۔ مجھ سے تم کوئی رو رعایت کی امید نہ رکھنا"

"ہمیں منظور ہے۔" لوگوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ پھر بھی انکار کرنے پر لوگوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔

"یا علیؓ! آپ دیکھ رہے ہیں قوم پر بڑا آزمائش کا وقت آن پڑا ہے۔"

کو اسلام کی تباہی کا بھی خیال نہیں۔ اس شر کے سیلاب کو روکنا آپ کا فرض ہے"
علیؓ پھر بھی ہچکچاتے رہے۔ وہ جانتے تھے۔ سب خودغرض ہیں۔ جاہ پسندی کا چسکا پڑ گیا ہے۔ ذہنی پر مادہ پرستی کے غلاف چڑھے ہوئے ہیں۔ حکومت کو مطلب برآری کا وسیلہ مانا جاتا ہے۔ خلافت کو ملک گیری کا کھلونا بنا لیا ہے کم ظرفی لوگوں کے دلوں میں پنجے گاڑ چکی ہے۔ ایسی صورت میں ذہنوں کو موڑنے اور طبیعتوں کا رخ بدلنے میں برسوں لگ جائیں گے۔ وہ انہیں غور کرنے کی مہلت بھی دینا چاہتے تھے۔ کل کو کہیں یہ نہ کہنے لگیں کہ گھبراہٹ میں کچھ سوچا نہیں۔ بیعت دل سے اور یقین کے ساتھ ہونی چاہیے۔ ہنگامی جذبہ اور وقتی ضرورت کے زیر اثر نہ ہونا چاہیے۔

"لوگو! اچھی طرح کان کھول کر سن لو۔ اگر تم نے مجھے اپنا امام بنانے کا فیصلہ کیا۔ تو میں تمہارا آلۂ کار نہیں بنوں گا۔ تم مجھے اچھی طرح جانتے پہچانتے ہو۔ پرکھ چکے ہو! میں اصولوں کا پکا ہوں۔ قرآن اور سنت کے سوا کسی مصلحت کے آگے ہتھیار نہ ڈالوں گا۔ اگر تم نے کسی اور کو چن لیا۔ تو میں ایک مثالی شہری کی طرح تمہارے فیصلے کا احترام کروں گا۔ لیکن اگر مجھے منتخب کرتے ہو تو یاد رکھیں میں کسی کے ذاتی مفاد میں کوئی دلچسپی نہ لوں گا۔ میں سخت گیر ہوں اور تم من مانی کے عادی ہو چکے ہو۔ میری سختیاں نہ جھیل سکو گے۔"

یہ سن کر ان کے مداحوں کو اور بھی جوش آ گیا۔ لوگ بیعت کے لیے ان پر ٹوٹ پڑے۔ وہ ہلہ ہوا، ایسی گھمسان ہوئی کہ اپنے پرائے کا ہوش نہ رہا۔ عبائیں پھٹ گئیں۔ سروں سے عمامے کھل گئے۔ جوتوں کے تسمے ٹوٹ گئے۔ عورتیں اپنے مردوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر لانے لگیں۔

وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ علیؓ ابن طالب کا دورِ خلافت شروع ہوتے ہی بنی امیہ نے سر اٹھایا۔ وہ اس عرصہ میں اتنے طاقتور ہو گئے تھے کہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ہر طرف خاک اڑنے لگی اور علیؓ کو ایک دن بھی چین نہ نصیب ہوا۔

سب سے پہلے تو حضرت عثمانؓ بن غنی کے قتل کا الزام لگایا گیا ۳۶ھ میں علیؓ بن ابی طالب اور معاویہ بن ابی سفیان کے درمیان قصاص عثمانؓ کے نام سے جنگ ہوئی۔

امیر شام آہستہ آہستہ طاقت پکڑتے جا رہے تھے۔ اب وہ بالکل ہی خود مختار ہو گئے۔ اور علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے انکار کر دیا۔ جب حضرت عثمانؓ پر قاتلوں نے حملہ کر دیا تو ان کی زوجہ حضرت نائلہ نے انہیں بچانے کے لیے ان پر اپنے ہاتھوں کا سایہ کر دیا۔ ان کی انگلیاں کٹ گئیں۔ امیر معاویہؓ نے وہ انگلیاں اور خون میں ڈوبی ہوئی عبا کو مسجد کے ممبر پہ لٹکا دیا۔ ماتم ہوا۔ زور، شور کی تقریریں ہوئیں۔ خونِ عثمانؓ کا قصاص لینے کی شرط پر اپنے نام کی بیعت لی۔

اس طرح پہلی بار مسلمانوں میں پھوٹ کا بیج بر پا گیا۔ اور اعلانِ جنگ ہو گیا۔ علیؓ ابن ابی طالب کو فکر دامن گیر تھی۔ انہوں نے کہا "افسوس زمانے نے چباڑ کھانے والے خونی درندے کی طرح منہ کھول دیا ہے۔ باطل کا اونٹ جو دبکا بیٹھا تھا۔ بلبلا رہا ہے۔

لوگوں نے فسق و فجور سے بھائی چارہ کر لیا ہے۔
سب رشتے ٹوٹ چکے ہیں۔
بیٹا آنکھوں کا نور نہیں وصول بن گیا ہے۔
باپ کا سایہ جھلتی آگ برسا رہا ہے۔
کمینے پھل پھول رہے ہیں۔
شرافت دم توڑ رہی ہے۔
حکم راں طبقہ سروں پر سوار ہے۔
درمیانہ طبقہ کھاپی کر مست پڑا ہے۔
فقیر و نادار کی مٹی خراب ہے۔
صبت صرف زبانوں پر رہ گئی ہے۔

زنا و بدکاری عیب نہیں۔
پاک دامنی کا مذاق اڑنے لگا ہے۔
دنیا کی ہوس میں آنکھوں والے اندھے ہیں
اور کانوں والے بہرے۔
شیرازہ بکھر رہا ہے۔ جنگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں
اسلام کا دامن دھڑا دھڑ جل رہا ہے۔
قوم ایک بے مہار اونٹنی کی طرح بھٹک رہی ہے
رکھوالا راہ بھول چکا ہے۔
اگر ہم اپنی آنکھیں نہ کھولیں گے تو یہ اونٹنی کہیں ٹھوکر کھا کر اوندھے منہ گرے گی اور دم توڑ دے گی۔"

علیؓ بن ابی طالب کا دور خلافت ان کے لیے درد سر بنا رہا۔ اسلامی سلطنت اتنی وسیع ہو گئی تھی کہ ایک کونے سے دوسرے کونے تک نظام قائم رکھنا دشوار ہو گیا تھا۔ واقعی اسلام کا شیرازہ بکھرنے لگا تھا۔

وسعت سے یہ مطلب نہیں تھا کہ اسلام مضبوط ہو کر پھیلا۔ بہت سے علاقے تو صرف نام کے مسلمان ہو گئے تھے۔ بنیادی اصول یعنی اشتراک و مساوات ختم ہو رہے تھے جس کا جہاں بس چلا قبضہ جما کر حاکم بن بیٹھا۔ گروہ بندی کی وبا عام ہو گئی۔

ان حالات میں نہایت ہوشیار و چالاک سیاسی مہرہ ہی قدم جما سکتا ہے اسلام کے سچے اصولوں پر کاربند ہونا دشوار ہو گیا تھا۔

اس ہنگامے میں امیر معاویہ بن ابی سفیان جو شام کے حاکم تھے سب سے زیادہ طاقت ور ثابت ہوئے۔ ان کا ستارہ عروج پر آ گیا۔ ان کے پاس بے شمار دولت تھی۔ جس کی مدد سے بہت زبردست فوج تیار کر لی۔ اسلامی اصولوں کو پس پشت ڈال کر پھر نجی دولت کو فروغ دیا۔ کیونکہ شہنشاہیت اور سرمایہ داری نظام کے پھلنے پھولنے کے لیے نجی دولت کا وجود لازمی ہے۔

امیر معاویہ نے ہر مقام پر اپنے آزمودہ اسلامی گورنر بنا دیئے۔ جنہیں اپنی فوج رکھنے کی اجازت تھی۔ وہ مالک اور عام مسلمان ان کے غلام بن گئے۔ جو جسے چاہتے جلاتے وہ جسے چاہتے مارتے، کوئی پرسان حال نہ تھا۔ صرف ایک شرط تھی کہ امیر معاویہ کو اپنا خلیفہ مانیں اور ان کے ذاتی خزانے کے لیے مقررہ ٹیکس دیتے رہیں۔ اس کے علاوہ جیسے وصول کرنا چاہیں رعایا سے کریں۔ اگر عوام انہیں من مانی کرنے سے روکنا چاہیں۔ تو امیر معاویہ کی زبردست فوج ان کی مدد کو پہنچ جائے گی۔

اس کا چند سال میں ہی یہ نتیجہ ہوا کہ چند بڑے بڑے طاقتور اور سردار بہت امیر ہو گئے۔ باقی عوام میں غربت بڑھ گئی۔ عوام کی لوٹ شروع ہو گئی۔ خواص پھر ان عیاشیوں اور بدکاریوں میں غرق ہو گئے۔ جن کے خلاف ایک دن اسلام نے جنگ کی تھی۔

دو خلافتیں قائم ہو گئیں۔ ایک علیؓ کی اسلامی اصولوں کی قائم کی ہوئی جمہوریت دوسری طرف امیر معاویہ کی شہنشاہیت۔ علیؓ عام غریب انسان کے ساتھ تھے مگر امیر معاویہؓ کی طاقت اور دولت زیادہ کامیاب ثابت ہو رہی تھی۔ امیر کاسہ لیس ان میں بڑے تھے۔ جب کہ علیؓ کے ساتھ عقبیٰ کی نعمتیں تھیں۔ دنیا کی نعمتیں عقبیٰ کے وعدوں پر غالب آ گئیں۔

صفین کے مقام پر مسلمان مسلمان سے برسرپیکار ہو گیا۔ امیر معاویہ کے ساتھ زبردست فوج تھی۔ دولت تو تھی مگر یقین کی کمی تھی۔ اسد اللہ علیؓ ابن ابی طالب کی فتوحات کی ہیبت طاری تھی۔ عام عرب بڑا وہمی ہوتا ہے وہ بڑی آسانی سے جذبات کی رو میں بہہ جاتا ہے۔ انسان صرف ہتھیاروں سے نہیں لڑتے ایمان بھی ساتھ میں ہونا لازمی ہے۔ امیر معاویہ نے اپنی فوج کو یقین اور بھروسہ کی کمی کی وجہ سے پسپا ہوتے دیکھ کر فوراً اپنی سیاست عملی سے کام لیا۔ قرآن درمیان میں رکھ کر جنگ روک دی۔ علیؓ ان کی یہ چال پہچان گئے۔ انہوں نے

بہت کم۔

"یہ امیر معاویہ کی کوئی تدبیر ہے۔ جنگ بند کروا کے وہ کوئی نئی چال چلنے والے ہیں۔ تاکہ اپنی شکست کو نیا موڑ دے سکیں۔"

مگر یہ مسلمان اور کافر کی جنگ نہ تھی۔ یہ دو اسلامی گروہوں کی جنگ تھی قرآن کے بیچ میں آنے کے بعد جنگ نہ روکنا قرآن کی توہین تھی۔ امیر معاویہ یہ جانتے تھے کہ علیؓ کے ساتھی ان کی اس تدبیر سے بے بس ہو جائیں گے۔

"امیر معاویہ قرآن کو اس طرح درمیان میں لاکر قرآن کی توہین کر رہے ہیں علیؓ نے کہا مگر ان کے ساتھی بگڑ کھڑے ہوئے۔ امیر معاویہ نے بڑی ہوشیاری سے ان کے کیمپ میں اپنے جاسوس چھوڑ رکھے تھے۔ کچھ اہم لوگوں کو اپنی طرف توڑ لیا تھا۔ وہ اپنے ضمیر بیچ چکے تھے۔ کچھ ایسے ضعیف الاعتقاد تھے کہ اس چکر میں آگئے۔ انھوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ اگر قرآن کی توہین ہوئی تو وہ بغاوت کر دیں گے۔ عام سپاہی بھی ان کے ساتھ تھے۔ کیونکہ وہ گہرائی سے سوچنے سمجھنے کے عادی نہیں ہوتے۔

مجبوراً علیؓ خاموش ہو گئے کیونکہ وہ اپنے مخالفین کو ایذائیں دے کر قتل کرنے کے عادی نہ تھے۔ نہ کسی کو یہ خطرہ تھا کہ وہ انتقام لیں گے۔ علیؓ درگزر کر دیں گے، معاف کر دیں گے۔ مگر امیر معاویہ کے قہر سے بڑی مشکل سے جان چھوٹے گی۔ بڑی رسوائی اور ذلت کی موت مرنا پڑے گا۔"

کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ ہوا کہ فریقین اپنا ایک ایک نمائندہ مقرر کریں دونوں مل کر جو فیصلہ کریں اسے مان لیا جائے۔

علیؓ نے عبداللہ بن عباسؓ کو مقرر کرنا چاہا۔ مگر کوفہ والے اڑ گئے کہ ابوموسیٰ اشعری کو چنا جائے۔ جو کسی زمانے میں علیؓ کے مخالفوں میں سے تھے۔ لیکن سادہ لوح سے آدمی تھے۔ ان کے مقابلے میں امیر معاویہ کا نمائندہ بہت ہوشیار گرگ باراں دیدہ تھا۔ دو ہی ملاقاتوں میں اشعری کو شیشے میں اتار لیا۔ اور وہ اس بات پر راضی ہو گئے

کہ دونوں خلیفاؤں کو معزول کر کے مسلمانوں سے کہہ دیا جائے کہ جسے بھی مناسب سمجھیں اپنا خلیفہ چن لیں۔

لوگ جمع ہوئے۔ امیر معاویہ کے نمائندے نے کہا۔ پہلے موسٰی اشعری اپنا بیان دیں۔

"میں علیؓ بن ابی طالب کو خلافت سے معزول کرتا ہوں۔ یہی میرا فیصلہ ہے۔" موسٰی اشعری نے کہا۔

لوگو! تم نے اپنے کانوں سے سنا کہ علیؓ کو ان کے منتخب نمائندے نے معزول کیا۔ میں بھی ان کی رائے سے اتفاق رکھتا ہوں۔ اور علیؓ بن ابی طالب کو معزول کر کے ان کی جگہ امیر معاویہ بن ابوسفیان کو خلیفہ مقرر کرتا ہوں؟ لوگ ہکا بکا منہ دیکھتے رہ گئے۔ یہ شرط تو نہیں تھی۔ نئے چناؤ کا موقع ملنا چاہیئے تھا۔ شرط پوری نہیں ہوئی۔ علیؓ کی صفوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ مطلبی لوگ کھلے بندوں امیر معاویہ کی طرف داری کرنے لگے۔ علیؓ کے لیے ان سے نمٹنا دشوار ہو گیا۔ مگر منصف مزاج یہ چال سمجھ گئے۔

امیر معاویہ بڑے زبردست سیاست داں تھے۔ مگر وہ بھی جانتے تھے کہ جس طرح انھوں نے علیؓ سے مقابلہ کیا ہے وہ کاٹھ کی ہانڈی ہے بار بار نہیں چڑھے گی۔ سنجیدہ اور باشعور طبقہ کا رجحان اب بھی علیؓ کی طرف ہے۔ ان میں ایسے ایسے زبردست مورخ اور مبلغ موجود ہیں کہ اگر ایک دن ان کی حمایت میں کھڑے ہو گئے تو جذباتی عرب قوم پھر انہیں سر آنکھوں پر جگہ دینے کو تیار ہو جائے گی۔ ان کی ذاتی صفات کے ساتھ رسول خداؐ سے ان کا رشتہ اور دوستی ایک ایسی حقیقت تھی جسے وہ نہیں جھٹلا سکتے تھے۔ علی کا وجود ان کے لیے بہت بڑا خطرہ تھا۔ ان کی زندگی میں مکمل کامیابی ناممکن تھی۔ دوسرا ان کا طرزِ حکومت عام انسان کے حق میں نہ تھا۔ ان کے اٹھ کھڑے ہونے کا بہت خطرہ تھا۔

سوائے علیؓ کے قتل کے کوئی راستہ باقی نہیں رہ گیا۔

دوسرا غم

علیؑ بن ابی طالب نماز کے وقت مسجد میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ تھکا ہارا مسافر سیڑھیوں پر غافل سو رہا ہے۔ انھوں نے اسے جگایا۔

"اے برادر، اٹھو، نماز قضا ہو جائے گی۔"

اور اس کی قضا نے آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا۔ اس شخص کا نام ابن ملجم تھا جو کئی دن سے ان کی تاک میں گھوم رہا تھا۔ اپنی موت کو جگا کر وہ اسے ساتھ مسجد میں لے گئے۔

جب علیؑ سجدے میں گئے تو ابن ملجم نے ان پر پے در پے خنجر سے وار کئے۔ اور فرار ہو گیا۔

وہ خنجر جس سے وار کیا زہر میں بجھا ہوا تھا۔

چار دن اور رات علیؑ موت اور زندگی کی کشمکش میں گرفتار تڑپتے رہے انھوں نے اپنے اہل و عیال کو جمع کیا اور وصیت کی۔

"اب اللہ تمہارا نگہبان ہے۔ سب مل جل کر ایک جان ہو کر ایک دوسرے کی حفاظت کرنا۔ ساتھ جینا ساتھ مرنا۔ ہر جاندار کو ایک دن مرنا ہے۔ مگر تمہاری موت ہر موڑ پر کھڑی ہے۔ کیونکہ تم میرے اور رسول خداؐ کے پیارے ہو۔ اسلام کے دشمن تمہارے دشمن ہیں۔ اتحاد ہی تمہارا آخری حربہ ہے جس سے تم اپنی جان کی حفاظت کر سکتے ہو۔ آج بوڑھے، جوان اور بچے سب مل کر عہد کرو کہ خاندان میں

کوئی تفرقہ نہ پڑنے دینا گے۔ ایک نوالہ ملے گا تو مل کر بانٹ کھائیں گے۔ ایک چادر ہو گی تو اس پر سب کا حق ہو گا۔ تمہارا کوئی آسرا کوئی وارث ہے تو وہ آپس کا پیار ہے، اتحاد اور ایک کے لیے قربانی اپنا شیوہ بنالو۔ موت تمہارے پیچھے لگی ہے۔ انتظار کرو گے تب بھی آئے گی۔ اس سے دور بھاگ کر نہ جا سکو گے کہ موت ہر جان دار کا مقدر ہے اس لیے موت سے ڈر کر کبھی ضمیر کا سودا نہ کرنا۔ اپنے کنبے کی عزت کرو کہ کنبہ تمہارا وہ بچھو ہے جس سے تم اڑتے ہو۔ وہ دست بازو ہے۔ جس سے تم مصائب کا مقابلہ کر سکتے ہو۔ ان لوگوں کی قدر کرنا جو سچائی کی خاطر کڑی سے کڑی جھیل جاتے ہیں اور گناہ میں تمہارا ساتھ نہیں دیتے۔"

اس کے بعد اپنے بچوں کا ہاتھ اپنے بڑے بیٹے حسنؓ کے ہاتھ میں تھمایا۔ مگر ابوالفضل عباس کو حسینؓ کے سپرد کیا اور کہا۔

"حسینؓ، تمہارا چھوٹا بھائی ہے میں اسے تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ اسے اپنا غلام سمجھنا اور وہ سب کچھ دینے کی کوشش کرنا جو موت نے مجھے دینے کی مہلت نہ دی۔"

ابوالفضل عباس کی والدہ رونے لگیں اور بولیں۔

"مولا، عباسؓ بیٹے کا کیا قصور ہوا کہ اسے آپ نے اپنے جانشین بڑے بیٹے حسنؓ کے سپرد نہیں کیا۔ قاعدے سے انہیں اس کا ضامن ہونا چاہیے۔"

علیؓ نے بدقت تکلیف پر قابو پا کر کہا۔

عباسؓ اور حسینؓ ایک دوسرے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ عباسؓ حسینؓ سے زیادہ مانوس ہے۔ میرا دل کہتا ہے۔ ان دونوں کو ہمیشہ ایک دوسرے کی ضرورت پڑے گی۔" پھر عباسؓ سے کہا۔

"حسینؓ تمہارے بڑے بھائی ہیں۔ مگر انہیں میری جگہ سمجھنا۔ اپنا آقا سمجھنا۔ ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرنا۔ سایہ کی طرح ان کے ساتھ رہنا۔ ان کے لیے اپنی جان سے بھی گریز نہ کرنا۔"

زینبؓ اپنے جاں بلب باپ کی پٹی پر رخسار ٹکائے چاروں سے آنسو بہا

رہی تھیں۔ انھوں نے اُن کا ہر لفظ دل و دماغ پر منقش کر لیا۔

علیؓ بن ابی طالب کی تکلیف بڑھتی گئی۔ مگر دماغ آخر وقت تک برابر نشتر کی طرح کام کرتا رہا۔

"اپنے نانا کی اُمت کے ساتھ بے وفائی نہ کرنا، دھوکا نہ دینا۔ اپنی فلاح کے لیے انھیں گمراہ نہ کرنا۔ عوام معصوم ہیں۔ مجبور ہیں۔ اگر کبھی نادان ہیں یا جان کے ڈر سے تمہارے ساتھ بے وفائی کریں۔ تو معاف کر دینا۔ بدظن نہ ہونا۔ ان کے جسموں سے نہیں دماغوں اور دلوں کو فتح کرنے کی کوشش کرنا۔ تم نے دیکھا ہے مجھے لوگوں نے کتنے دکھ دیے ہیں۔ یہ دکھ، پریشانیاں اور آلام ہی میں تمہیں ورثہ میں دے کر جا رہا ہوں۔ یہ دکھ بڑھتے ہی جائیں گے۔ لوگ دن بدن مخبوط الحواس ہوتے جا رہے ہیں۔ آخرت کو بھول کر دنیا کی لالچ بڑھ رہی ہے۔ قوت فیصلہ و تدبر گم ہے۔ حرام حلال ہو گیا ہے عقل مند اور دانا اپنی خیر منا رہے ہیں ظالم آپس میں سمجھوتہ کرکے معصوموں کی بیخ کنی کر رہے ہیں۔ آپس میں پھوٹ ڈال کر اپنا کام بنا رہے ہیں۔ دین کے مینار ڈھے رہے ہیں۔ حکمت کا پانی خشک ہو رہا ہے۔ بے وقوفوں کی زبانیں کھل رہی ہیں عقل مند دم بخود ہیں۔ ضمیر فروش کرتا دھرتا بیٹھے ہیں۔ حرام کی روٹی زیادہ لذیذ ہو گئی ہے۔ رشوت کو تحفہ کہا جاتا ہے۔ شراب کو انگور کا رس۔ ایسی صورت میں صرف اتحاد تمہیں بچا سکتا ہے۔ یاد رکھو جو بھیڑ اپنے گلے سے کٹ جاتی ہے اسے بھیڑیا کھا جاتا ہے۔"

پھر باری باری سب کو پیار کیا۔ سینے سے لگایا۔ تکلیف بڑھتی گئی۔ مگر ضبط کا دامن ہاتھ سے نہ دیا۔

۲۱ رمضان المبارک ۴۰ھ کو ایک عظیم انسان، ایک بے مثل مفکر اور فلسفی، اسلام کا قدآور ستون اپنے خاندان اور مداحوں کو روتا سسکتا چھوڑ کر رخصت ہوا۔

کہ سب کو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

تیسرا غم

حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد امام حسنؓ ابن علیؓ صرف چھ ماہ خلیفہ رہے
عجب کشمکش میں گرفتار رہتے۔ لوگ گروہوں میں بٹ کر خون خچر پر تلے ہوئے
تھے۔ اسلام کے پرخچے اڑنے کے آثار پیدا ہو گئے۔ ادھر امیر معاویہ نے ایک
لشکر جرار لے کر چڑھائی کر دی۔ خون خرابے سے بچنے کے لیے امام حسنؓ نے صلح کر لی
وہ لوگوں کے اصرار سے خلافت اپنے ہاتھوں میں لینے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔
اب جو مسلمان کا خون مسلمان کے ہاتھوں بہنے کا وقت آیا تو وہ دست بردار ہو گئے۔
نہ تو ان کے پاس اتنی فوج تھی نہ اس فوج پر بھروسہ تھا۔ نہ اس فوج کا
بار اٹھانے کے لیے دولت کے انبار تھے۔ سامان جنگ بھی ناکافی تھا۔ امیر معاویہ
کے زمانے میں اسلام کی ظاہری صورت اتنی کریہہ نہ ہوئی تھی کہ ان سے سمجھوتہ کرنے
میں غلطی کا اندیشہ ہوتا۔ عیوب بے شک پیدا ہو گئے تھے۔ مگر ان پر پردہ پڑا
ہوا تھا۔ انھیں صرف اہل نظر ہی پہچان سکتے تھے۔ سیاسی باریکیاں عوام تک پہنچانے
کا کوئی ذریعہ [illegible]۔ چپہ چپہ پر مطلب پرستوں کا قبضہ تھا۔ مخالف فوج
اتنی زبردست اور [illegible] تھی کہ امام حسنؓ کی فوج کو بڑی آسانی سے کاٹ کر پھینک
دیتی۔ ان سے ٹکر لینا خودکشی تھی اور اس قتل عام کی ذمہ داری امام حسنؓ
پر آتی۔

چند شرائط پر سمجھوتہ ہو گیا۔

اوّل یہ کہ امام حسنؓ کے طرف داروں کو ایذا نہ پہنچائی جائے۔ ان سے حق شہریت نہ چھینا جائے۔ انھیں عام انسان کی طرح زندگی کا حق دیا جائے۔

دوئم یہ کہ امیر معاویہ اپنے بعد اسلام کی بنیادی رسم یعنی آزاد انتخاب کا کھلا موقع دیں۔ اپنا ولی عہد کسی کو مقرر نہ کریں۔

اور بھی چند شرائط تھیں۔ مگر امیر معاویہ نے وقتی طور پر مان لیں۔ بعد میں کسی پر عمل نہ کیا۔ علیؓ اور ان کے بیٹے کے طرف داروں کو چن چن کر ختم کیا جانے لگا۔ اور آگے چل کر آزاد چناؤ کا سلسلہ بھی ختم کر دیا۔

خلافت سے دست بردار ہو کر حسنؓ ابن علیؓ کوفہ سے مدینہ آ گئے۔ کیوں کہ وہاں کسی کی زندگی محفوظ نہ تھی۔ حالانکہ اب حکومت سے انہیں کوئی واسطہ نہ تھا۔ مگر امیر معاویہ کے دل کو کھٹکا لگا تھا کہ اگر حسنؓ سے پہلے انھیں موت آ گئی تو لوگ ذرا حسن کو خلیفہ چن لیں گے۔ پھر خلافت بنی اُمیہ کے ہاتھوں سے نکل کر بنی ہاشم کے ہاتھوں میں چلی جائے گی۔ اور ان کے پیارے بیٹے یزید کو تخت و تاج نہ مل پائے گا۔

اس سمجھوتے سے امام حسنؓ کی مقبولیت کو بہت سخت ٹھیس لگی۔ اور یہ خطرہ کم ہو گیا تھا کہ حسنؓ کی پکار کو لوگ لبیک کہہ کر ان کے گرد پھر سے جمع ہو جائیں گے۔ پھر بھی وہ علیؓ خیبر شکن کے بیٹے تھے۔ رسول اللہ کے نواسے تھے ان کا وجود کوفت کا سامان بنا ہوا تھا۔ اب بھی لوگوں کی نظریں اُن کی طرف اٹھتی تھیں۔ اس لیے وہ انہیں اپنے راستے سے ہٹا دینا چاہتے تھے۔

امام حسنؓ کی ایک بیوی کوفہ کی تھیں جن کا نام جعدہ [illegible] معاویہ نے خفیہ طور پر انہیں شیشے میں اتار لیا۔ ان سے وعدہ کیا کہ اگر وہ کسی طرح امام حسنؓ کو ختم کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو وہ انھیں ایک لاکھ دینار دیں گے۔ اور ان کی شادی اپنے عزیز بیٹے یزید سے کر دیں گے۔

یزید کے حسن مردانہ کے چرچے تھے۔ اور پھر کون ایسی عورت ہو گی جو

خلیفۂ وقت کی بہو بننے کے خواب نہ دیکھتی ہو۔ جعدہ ان کے بہکانے میں آسانی سے آگئی۔ اس نے کھانے میں زہر ملا کر امام حسنؓ کو کھلا دیا۔ کیونکہ وہ ان پر بہت بھروسہ کرتے تھے۔

زہر اتنا تیز تھا کہ اسی وقت ان کی طبیعت بگڑنے لگی۔ خون کی قے ہوئی اور جسم نیلا پڑ گیا۔

گھر میں ایک کہرام مچ گیا۔ سارا کنبہ جمع ہو گیا۔ انھوں نے چھوٹے بھائی حسینؓ کو بلا کر کہا۔

"یوں تو مجھے کئی بار زہر دیا گیا ہے۔ لیکن اس بار بہت قاتل زہر ہے۔ میرا وقت آگیا ہے۔"

بتایئے بھائی آپ کو کس نے زہر دیا اسے سزا دی جائے گی۔"

"جو ہونا تھا ہو گیا۔ کسی کو سزا دینے کے لیے ثبوت چاہیئے اور میرے پاس کوئی ثبوت نہیں۔ یہ قاتل تو میرے اصلی قاتل کا صرف آلۂ کار ہے۔ اصلی قاتل تک ہماری پہنچ نہیں اس بات کو یہیں ختم کر دو۔ خواہ مخواہ بات بڑھے گی۔ میرے ساتھ تمہاری جان کے بھی لالے پڑ جائیں گے۔ معصوم گرفتار کئے جائیں گے۔ گناہ گار صاف چھوٹ جائیں گے۔ بس اب تو میری یہ آرزو ہے کہ مجھے نانا جان کے پاس دفن ہونے کی سعادت مل جائے۔ تم اجازت لے لو۔ اگر لوگ مخالفت پر تل جائیں تو خدا کے لیے میرے واسطے فساد نہ کرنا۔ حسینؓ ہم گرداب میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ہم نے ذرا آواز اٹھائی تو بے گناہوں کی گردنیں ماری جائیں گی۔ مجھے جنت البقیع میں دفن کر دینا مگر فساد کو سر نہ اٹھانے دینا۔ چار روز تکلیف سہتے رہے۔ ۲۸ ماہ صفر ۴۹ھ کو انتقال کیا۔ اس وقت ان کی عمر ۴۶ یا سینتالیس سال کی تھی۔

وصیت کے مطابق حسینؓ بھائی کو نانا جان کے قریب دفن کرنے لے چلے۔ مگر مخالفت شروع ہو گئی۔ جس کا پہلے ہی خطرہ تھا۔ مجبوراً انہیں جنت البقیع میں دفن کر دیا۔

رسولِ خدا کو رحلت فرمائے مشکل سے چالیس سال ہوئے ہوں گے۔ ان کے نواسوں کو ان کی وصیت کے مطابق دفن کرنے کی مہلت بھی نہ ملی۔ مرحوم کے خاندان والوں نے ان کی دوسری وصیت کے مطابق کوئی خون خرابہ نہ منظور کیا۔ اور خاموشی سے یہ ذلت برداشت کر گئے۔

امیر معاویہ کو اطمینان ہو گیا۔ شام میں شادیانے بجنے لگے۔ کچھ لوگوں نے حسنؓ کے بعد حسینؓ کو اپنا امام منتخب کیا۔ اور وہ ایک نئے دور کی نئی نئی صعوبتوں کا جواں مردی سے مقابلہ کرنے لگے۔ بڑے بڑے رؤسا تو پہلے ہی کترا کر نکل جاتے تھے۔ اب عام انسان بھی ان کے پاس آتے جاتے خوف کھانے لگے۔ کسی کو ان سے راہ و رسم بڑھانے کی ہمت نہ تھی۔ چاروں طرف جاسوس چھوٹے ہوئے تھے۔ جو ان کے پاس نظر آتا وہی کسی نہ کسی ناکردہ جرم میں دھر لیا جاتا۔ کوچہ کوچہ سرکاری پیادے گھومتے پھرتے۔ جسے چاہتے پکڑ کر کسی عذاب میں پھنسا دیتے۔ نہ ان کی داد تھی نہ فریاد۔ لوگ دبکے ہوئے اپنی جانوں کی خیر منا رہے تھے۔

جب ظلم اس قدر طاقت پکڑ جاتا ہے۔ تو عوام پر ایک عجیب سی مفلوج کن دہشت سی بیٹھ جاتی ہے۔ بے رحم طاقت کے آگے لوگ سہم جاتے ہیں۔ حساس اور خود دار دوسرے ملکوں میں جا کے بس جاتے ہیں۔ گمنام اور پوشیدہ زندگی گزارنے لگتے ہیں۔ ورنہ جان گنواتے ہیں۔

جب مسلمانوں کا یہ حال تھا تو یہودیوں اور عیسائیوں کی حالت کا کیا پوچھنا۔ ان کی حق تلفی کھلے بندوں اسلام کا نام لے کر کی جاتی۔ کسی بھی کورٹ کچہری میں ان کی شنوائی نہ ہوتی۔ جاگیریں ضبط کر کے مخبروں کو عطا ہو جاتیں۔ جو ترکِ وطن نہ کر سکے۔ وہ چوروں کی سی زندگی گزارنے لگے۔ سر اٹھا کر چلنے کی بھی ہمت نہ تھی۔

یہودی اور عیسائی امام حسینؓ کے پاس اپنا دکھ درد لے کر آتے۔ جتنا بھی ہو سکتا وہ ان کی مدد کرتے۔ تسلی دلاسہ دلا دیتے۔ یہ بات دشمنوں کو سخت ناگوار تھی کہ اب بھی لوگ ان سے عقیدت ظاہر کرنے کی ہمت رکھتے تھے۔ ان پر پابندی

بھری رات کی تاریکی میں چھپ چھپ کر آنے لگے۔

مسدوں نے مشہور کرنا شروع کیا کہ حسینؑ تو منکر ہو گئے ہیں۔ عیسائیوں اور یہودیوں سے دانت کاٹی روٹی ہے۔ راتوں کو چھپ چھپ کر ان سے ملتے ہیں۔ اور ورغلاتے ہیں۔ حاکم وقت اور خلیفۃ المسلمین کی بیخ کنی کے منصوبے بناتے ہیں۔ مگر حسینؑ خاموش رہے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ بڑے بھائی کے بعد اب ان کی باری ہے۔ کوئی موقع نہیں دیتے تھے۔ اپنی اور اپنے خاندان کی پوری حفاظت کرتے تھے۔ گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ زیادہ تر وقت مطالعہ میں گزارتے تھے۔ اور بچوں کی تعلیم کی طرف متوجہ تھے۔ پورا خاندان ایک مضبوط مٹھی کی طرح جڑا ہوا تھا۔ اکیلے باہر نہیں نکلتے تھے۔ سب جتا کر جاتے آتے تھے۔ ان کے بہی خواہ دور دور سے ان کی حفاظت کرتے تھے۔ کسی قاتل کو قریب پھٹکنے کی ہمت نہ تھی۔ کھلے بندوں امیر معاویہ ان پر وار نہیں کرنا چاہتے تھے کہ لوگوں کے دلوں میں اب بھی ان کی وقعت تھی۔ ان پر کوئی شبہ قائم کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ لوگ پیٹھ پیچھے امیر معاویہ کو حسنؓ ابن علیؑ کا قاتل گرداننے سے نہیں چوکتے تھے۔ امیر معاویہ بڑے معرکے کے سیاست داں تھے۔ وہ کچی گولیاں نہیں کھیلتے تھے۔ حسینؑ ابن علیؑ کا خاندان ایک مضبوط قبیلہ کی طرح تھا۔ جس کا ہر فرد چوکنا تھا۔ وہ روز سب کو جمع کر کے حالات زمانہ پر بحث مباحثہ کرتے۔ تنگی ترشی بھی تھی۔ فاقے بھی ہو جاتے مگر پیشانی پر بل نہ آتے۔ اسی طرح وقت گزرتا گیا۔ سال بیتتے گئے۔

سراب

امیر معاویہ کو اپنے بیٹے یزید سے عجیب قسم کا عشق تھا۔ وہ ان کے بڑھاپے کے عشق کی نشانی تھا۔ اس کی ماں ان کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ وہ اچانک ان کی زندگی میں داخل ہوئی۔

ایک دن وہ کہیں سفر پر جا رہے تھے۔ راستہ میں ایک نخلستان میں خانہ بدوشوں کا ایک قافلہ نظر آیا۔ اس وقت امیر بادشاہ نہیں تھے۔ مگر خو بو شاہوں جیسی تھی۔ بڑا رنگین مزاج پایا تھا۔ کچھ اکتائے سے خیمے سے نکلے کہ دل پر ایک بجلی سی گری۔ سامنے چند کم سن لڑکیاں پانی میں چہلیں کر رہی تھیں۔ ان میں ایک لڑکی بلا کی حسین تھی۔ نازک اور کمسن۔ دیکھتے ہی ہزار جان سے عاشق ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ وہ قبیلے کے سردار کی لاڈلی بیٹی ہے۔ فوراً اسے بلایا اور اپنے پہلو میں جگہ دی۔ باتوں باتوں میں سودا ہو گیا۔ اشرفیوں کی تھیلیاں انڈیل دیں۔ امیر نے فوراً اس سے نکاح کر لیا۔

انھوں نے اس کے لیے ایک نہایت ہی عالی شان محل بنوایا۔ بیسیوں کنیزیں نئی نویلی دلہن کی خدمت پر مامور کر دیں۔ دور دور کے ملکوں سے زرنگار ملبوسات بیش بہا جواہرات منگوا کر اس کے قدموں پر ڈال دیئے۔ اس محل پر ایسا سماں کہ پرستان کا شبہ ہونے لگا۔ اس کے لیے ہر روز بیرون ممالک سے اونٹوں کی ڈاک کے ذریعے پھل اور پھول آتے۔ سونے اور چاندی کے مزین برتنوں میں عجیب و غریب

کھانے سجائے جانے لگے۔

مگر وہ عجیب لڑکی تھی۔

خاموش پتھر کی مورتی کی طرح ٹکٹکی لگائے نہ جانے خلا میں کیا ڈھونڈا کرتی تھی۔ دور افق پر نظریں جمائے ٹھنڈی آہیں بھرا کرتی۔ بس اس کی غزالی آنکھوں سے موتیوں کی لڑیاں ٹوٹنے لگتیں۔ زر و جواہر سے اسے وحشت ہوتی۔ اطلس و دیبا کے ملبوسات وہ نوچ کر پھینک دیتی۔ مرغن کھانوں کی قابیں دیکھ کر اسے ابکائی آنے لگتی۔

ایک دن اس کی ایک لونڈی نے اس سے پوچھا۔

"میری اچھی ملکہ! تمہیں کیا دکھ ہے؟"

وہ چپ رہی۔

"شہزادی! تمہیں کیا چاہیئے؟"

"کچھ نہیں!" اس نے بے دلی سے کہا۔

"پھر آپ اداس کیوں رہتی ہیں؟"

"پتہ نہیں۔!"

"یہ عالی شان محل۔۔۔"

"ایک سنہرا پنجرہ ہے۔"

"یہ مخمل و کمخواب کے ملبوسات اور زر و جواہر۔۔۔۔"

"یہ سنہری زنجیریں ہیں، جن میں جکڑی ہوئی ہوں۔"

"پیاری شہزادی! یہ پھل پھول جو دور دور کے ملکوں سے خاص آپ کی خاطر منگوائے جاتے ہیں؟"

"ان سے زیادہ خوشبودار اور میٹھے میرے جنگل کے بیر ہوتے تھے۔" جھاڑیوں میں جب جوہی کی مہکار پھوٹتی تھی تو ہرن مست ہو جاتے تھے۔"

"یہ کفرانِ نعمت ہے شہزادی! یہ بیسیوں قسم کے کھانے۔۔۔۔"

میری ماں کے ہاتھ کی پکائی جو کی روٹی اور ساور اس پر پنیر کا ٹکڑا زیادہ لذیذ ہوتا تھا۔ تم نے میری ماں کے ہاتھ کا بنا پنیر کبھی نہیں چکھا۔"

"میرا یہاں دم گھٹتا ہے۔ وہ کھلے مرغزار، جھلملاتے چشمے، ہرے بھرے جنگل، وہ کھجور کے جھومتے گاتے اونچے پیڑ۔۔۔۔"

"ملکہ! آپ نے وہ فانوس نہیں دیکھا جو کل ہی آقا نے آپ کے خاص حجرے کے لیے بھیجا ہے۔"

"وہ کچے چمڑے کا خیمہ! اگر تیل یا چربی مل گئی ہو گی تو اس وقت میری ماں نے دیا جلا دیا ہو گا۔۔۔ وہ شاید اس وقت مجھے یاد کر رہی ہو۔"

"مگر ملکہ! آقا تم پر جان چھڑکتے ہیں۔ تم سے کتنا عشق ہے۔"

"تمہارے اس ظالم سٹنڈے بڈھے آقا نے مجھے اشرفیوں کی تھیلی دے کر خریدا ہے مگر میرا دل نہیں خریدا جا سکتا۔ میرا دل تو میرے پاس بھی نہیں۔ وہ تو میں نے پچھلے بہار کے میلے میں اس البیلے نوجوان کو دے دیا تھا۔ جو قبیلہ کی شان اور جان ہے۔ وہ دبلا پتلا نشیلی آنکھوں والا جادوگر جب عود کے تاروں کو چھیڑتا ہے کہ کنواریوں کے دل گانے لگتے ہیں۔ ہونٹ پھڑکنے لگتے ہیں اور روم روم میں رقص جھومنے لگتا ہے۔"

"ہے ہے ملکہ۔ خدا نے تمہیں سب کچھ دیا اور۔۔۔۔"

"خدا نے مجھے سب سے سخت سزا دی ہے۔ اور کچھ نہیں دیا۔"

اس لونڈی نے انعام و اکرام کی لالچ میں جا کے سب امیر معاویہ سے جڑ دیا۔ ان کا خون کھول گیا۔ بہت خفا ہوئے۔

"نامراد، احسان فراموش بدوی! مجھے سٹنڈا کہتی ہے۔" انہیں جلال آگیا۔ جی چاہا۔ اسی وقت اس کی گردن مروڑ دیں۔ مگر وہ ان کی بیوی تھی۔ مجبور تھے۔ اسے جینے کا ارمان تھا۔ اس کا خون بہاتے کلیجہ کٹنے لگا۔ جی پگھل کر آنکھوں کے رستے بہہ نکلا انہوں نے اسے واپس اس کے ماں باپ کے پاس بھیج دیا کہ جب تک توبہ

نہیں کرے گی۔ وہ یں سڑتی رہے گی۔ اس وقت یزید ماں کے پیٹ میں تھا۔

وہ واپس جانے کے خیال سے ہی اٹھی۔ مگر جب وہاں پہنچی تو نقشہ بدل چکا تھا۔ اس قبیلہ وہاں بڑی شان سے بسا ہوا تھا۔ پکے مکان بن گئے تھے۔ اس کا باپ وہاں کا حاکم تھا۔ اس کا شاندار محل تھا۔ اس کی اپنی فوج تھی جس کی مدد سے وہ آس پاس کے قصبوں سے تاوان وصول کرتا تھا۔ اب وہ ایک طاقت ور اور مہذب لٹیرا تھا۔ جس کی شاہی دربار تک پہنچ تھی۔ اس کے بھائی مختلف صوبوں کے حاکم بنا دیئے گئے تھے۔ محل رنڈیوں اور غلاموں سے بھرا پڑا تھا۔ مرغن کھانوں اور شراب کی بو سے اس کا دماغ اڑ گیا۔ اس کا وہ حسین اور دل نواز محبوب جس کے عشق کی جھنکار پردوں کے تار لرزا کرتے تھے۔ اوباش اور بدکار ہو گیا تھا۔ اس کے جسم پر چربی کی تہیں تھیں۔ اور اس کی نشیلی آنکھیں بدمستی سے سرخ انگارے رہنے لگی تھیں۔ وہ پھر اپنے باپ کے محل کی کوٹھری میں جا بیٹھی جو اس نے اسے بیچ کر بنایا تھا۔ دور خلا میں وہ اپنا کھویا ہوا وطن ڈھونڈتی رہی۔ جہاں اس نے بچپن سے جوانی کی سرحد میں قدم رکھا تھا۔ جب یزید پیدا ہوا تو اس کی ماں نے دم توڑ دیا۔ اور اپنے خوابوں کی دنیا میں گم ہو گئی۔

امیر کو پتہ چلا تو بہت کبیدہ خاطر ہوئے۔ وہ کمزور مگر خود سر لڑکی جیت گئی۔ وہ ہار گئے۔ جب یزید دو برس کا ہو گیا تو انہوں نے اسے اپنے پاس بلوا لیا۔ اور بڑے پیار سے اس کی پرورش کی۔

یزید بہت خوب رو تھا۔ بے انتہا تنک مزاج اور خود سر۔ امیر معاویہ کے بے جا لاڈ پیار نے وہ بے لگام اور گستاخ ہو گیا تھا۔ امیر بیٹے کے عاشق زار تھے۔ اس کی ذرا سی خواہش پر دولت پانی کی طرح بہا دیتے۔

سال میں کچھ ماہ کے لیے وہ اپنی ننہیال ضرور جایا کرتا تھا۔ وہاں زندہ دلے دشتہ داروں نے عجیب عجیب عیاشیاں سکھا دیں۔ بڑی چھوٹی سی عمر سے وہ حسن و عشق کے راگ الاپنے لگا۔ اس کے اشعار بدمستی اور بے لگام جوانی کے علم بردار تھے۔

سیر و شکار کا رسیا تھا۔

امیر معاویہ کے دل میں اب بھی اس نوخیز کلی کی یاد محفوظ تھی۔ جسے وہ کبھی زجیت کے جوان کا سنہرا بجرو توڑ کر پھر سے اڑ گئی یہ کوئی نفسیاتی الجھن تھی کہ امیر ڈرتے تھے کہیں اس کا بیٹا بھی ماں کی طرح ان سے روٹھ نہ جائے۔ اس لئے اس کے قدموں پر وہ ساری دنیا کو جھکا دینا چاہتے تھے۔ اس بیٹے کے لیے انہوں نے جتنی بھاگ دوڑ کی جتنے جوڑ توڑ کئے۔ اگر خود اپنے فرائض کی ایمانداری اور انصاف سے ادائیگی کرتے تو آج ان کا شمار دنیا کے عظیم معماروں میں ہوتا۔ اور وہ ایک جلیل القدر ہستی مانے جاتے۔

لوگوں کو پتہ تھا کہ وہ اپنے بیٹے سے والہانہ محبت کرتے ہیں۔ کچھ چاپلوس مصاحین نے باتوں باتوں میں رائے دی کہ اگر وہ اپنی زندگی میں یزید کو اپنا ولی عہد مقرر کر جائیں تو بعد میں خون خرابے نہیں ہوں گے۔ یزید کی مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔

یہ بات امیر معاویہ کو بہت پسند آئی۔ ادھر دوستوں نے اُکسانا شروع کیا کہ حساب سے تو یزید کا ہی ایسا وجود ہے جو امیر کے بعد خلافت کا بوجھ سہار سکتا ہے۔ اگر امیر چاہیں تو اپنی طاقت اور رعب کو استعمال کرکے اپنی زندگی میں اس کا فیصلہ کر سکتے ہیں یزید کو کیوں اس رائے سے اختلافات ہوتا۔ انہوں نے فوراً اپنے والد پر زور ڈالنا شروع کیا۔ اہل شام کو راضی کرنا قطعی دشوار نہ تھا۔ وہ لوگ تو پہلے سے ہی تابع مطیع ہو چکے تھے۔ وہ امیر معاویہ کو خدا کا مقرر کیا ہوا خلیفہ مان کر اپنا دین و ایمان ان کے حوالے کر چکے تھے۔ ان سے بیعت لینا کوئی مشکل کام نہ تھا۔

چنانچہ بڑی زبردست تیاریاں ہو گئیں۔ ایک جلسہ عام کیا گیا۔ سر برآوردہ لوگوں نے یزید کو ولی عہد بنانے کی تجویز ایسے پیش کی۔ جیسے وہ ان کے دماغ میں خود بخود پیدا ہوئی ہو۔ انہوں نے کہا۔

امیر معاویہ بن ابوسفیان خدمت خلق خدا میں ایسے غرق ہو گئے کہ انہیں سلام کے مستقبل کی بھی کوئی فکر نہیں۔ ان کے بعد یہ سارا انتظام جو انہوں نے اس جانفشانی سے کیا ہے سب درہم برہم ہو جائے گا۔ خون خرابے ہوں گے۔ عرض خدا لپٹے حقوق

کی کوشش میں لگ جائیں گے۔ ایک طوفان پھوٹ پڑے گا۔ جس کا خمیازہ عرب قوم کے معصوم اور امن پسند لوگوں کو بھگتنا پڑے گا۔ اس لیے چاہیئے کہ امیر اپنی زندگی ہی میں اپنے ہونہار اور لائق بیٹے کو اپنا جانشین مقرر کر دیں۔ تاکہ خواہ مخواہ کے جھگڑوں کا امکان نہ رہے۔ عرب قوم اور اسلام کی بقا اور بہتری کے لیے یہ امر نہایت ضروری ہے۔

پہلے سے تائید کرنے والے بھی مقرر ہو چکے تھے۔ انھوں نے ساتھ ساتھ یہ بھی طے کیا کہ شاید امیر تکلف فرمائیں گے۔ لہٰذا انہیں اسلام کے نام پر مجبور کیا جائے۔

امیر معاویہ فوراً مجبور ہو گئے۔ یہی ان کی دانست میں اسلامی جمہوریت کا تقاضا تھا کہ شہنشاہیت کو مستحکم کیا جائے۔ بس دھڑا دھڑ بیعت لی جانے لگی۔ جنھیں ذرا بھی اعتراض ہوا ان کے منہ اشرفیوں سے بند کر دیئے گئے۔ جو بخوشی راضی ہو گئے۔ وہ انعام و اکرام سے نوازے گئے۔ لوگ اس وقت بجائے امیر معاویہ سے ٹکر لینے کے ان سے سمجھوتہ کرنے میں زیادہ عافیت محسوس کرتے تھے۔ شام سے مطمئن ہو کر امیر معاویہ نے اس تحریک کو آگے بڑھایا۔ کوفہ میں تھوڑی سی مخالفت ہوئی مگر لوگ طرح طرح کے جھوٹے الزاموں میں گھیر کر نہایت بے رحمی سے کچلے گئے۔ باقی یا تو روپوش ہو گئے یا امیر کے حکم کے آگے سر جھکا دیا اور یزید کی ولی عہدی کو قبول کر لیا۔

مدینہ اور مکے کی طرف سے امیر کو بڑی تشویش تھی۔ مروان جو اس وقت مدینے کے حاکم تھے۔ اس خدمت پر معمور کیے گئے کہ یزید کے لیے لوگوں کی رضامندی حاصل کریں۔ مروان نے جب یہ تجویز عوام کے سامنے رکھی تو انہوں نے کھلی مخالفت نہ کی۔ بس ٹال مٹول سے کام لیا۔ خزانے کا منہ کھول دیا گیا۔ کچھ لوگوں نے انعامات لے لیے مگر بعد میں آپس میں بات چیت کرنے کے بعد واپس کر دیئے۔

لوگوں کا اعتراض تھا کہ یہ بدعت ہے۔ آج تک کسی خلیفہ نے اپنے بیٹے کو ولی عہد مقرر نہیں کیا۔ یہ اسلام نے آواز اٹھائی تھی اور اس کا خاتمہ کر کے جمہوریت کو قائم کیا تھا۔

یہ سن کر امیر معاویہ خاموش ہو گئے۔ وہ تحمل کر رائے عامہ سے ٹکر نہیں لینا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ عرب قوم جذباتی ہے ذرا سے بہانے سے ضد پر تل جائے گی۔ اپنی ذہانت اور سیاسی سوجھ بوجھ پر انہیں کامل عبور حاصل تھا۔

سب سے بڑا خطرہ انہیں حسینؓ ابن علیؓ کی طرف سے تھا۔ وہ رسولِ خداؐ کے نواسے تھے اور بذاتِ خود ایک بردبار اور بلند مرتبہ عالی الشان تھے۔

امام حسنؓ کی شہادت کے بعد حسینؓ ابن علیؓ تن تنہا امیر معاویہ کے رحم و کرم پر رہ گئے۔ امیر بڑے ہوشیار پالیٹیشن تھے۔ بڑے بھائی کے قتل کے بعد وہ ذرا ہی حسینؓ پر حملہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس طرح بات بھونڈی اور واضح ہو جاتی۔ وہ ہوشیاری سے بوند بوند زہر دینے کے قائل تھے۔

انھوں نے بڑی ہوشیاری سے پہلے تو علیؓ بن ابی طالب کی عظیم شخصیت کے نقوش عوام کے ذہنوں سے مٹانے کی کوشش کی۔ انھیں شہید کروا کے ان کے جسمانی وجود سے تو پناہ مل گئی۔ لیکن لوگوں کے دلوں پر اب بھی وہ چھائے ہوئے تھے۔ اب بھی اُن کی عظمت کے لوگ قائل تھے۔ امیر معاویہ کو اپنی شخصیت کو منوانے کے لیے پہلے علیؑ کی فضیلت کو مٹانا تھا۔ چنانچہ تاکید کر دی کہ خطبہ میں علیؓ کا نام نہ لیا جائے۔ ان کے بجائے حضرت عثمانؓ کی اعلیٰ صفات پر زیادہ توجہ دی جائے۔ یہ اس لیے نہیں کہ امیر معاویہ کو حضرت عثمانؓ سے کوئی خاص عقیدت یا انسیت تھی۔ اگر وہ خود کو علیؓ کے مقابلے میں پیش کرتے تو لوگ انھیں مطلبی اور چھوٹا سمجھتے اور ان کی نیت پر شبہ کرنے لگتے۔ انھوں نے نہایت دانشمندانہ طور پر ایسی حدیثیں تیار کروائیں۔ جن کی رو سے حضرت عثمانؓ کی فضیلت ظاہر ہوتی تھی۔ علیؓ کے ذکر کو یکسر ختم کر دیا۔

اس موقع پر لوگوں نے نئی نئی حدیثیں گھڑ گھڑ کر لاکھوں کما لئے اور آگے قدم بڑھا تو علیؓ کو نظر انداز کرنے کے بجائے ان کی عیوب بیان کرنے شروع کر دیے۔ صاف الفاظ میں بُرا بھلا کہنے سے بھی نہ چوکے۔ جن لوگوں نے اس رویئے پر اعتراض کیا ان کی بری طرح خبر لی گئی۔ اس طرح علیؓ بن ابی طالب کا کردار وقتی طور پر مبہم ہونے لگا

ملک گیری کی ہوس انسان کو درندہ بنا دیتی ہے۔ خدا جانے کیا ہو جاتا ہے کہ اپنی منزل کا فیصلہ کر کے انسان اندھا دھند آگے بڑھنے لگتا ہے۔ راستے میں جو بھی آئے اسے روندڈالتا ہے۔ دنیا میں جتنے مظالم حکومت سلطنت کی لالچ میں عوام پر ڈھائے گئے ہیں ان کا شمار ممکن نہیں۔ ان کے خیال سے انسانیت کا سر ندامت سے جھک جاتا ہے۔ جب ظلم اپنے عروج پر آتا ہے تو کسی میں اس سے ٹکرانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ کچھ بےدلی پژمردگی آڑے آجاتی ہے۔ لوگ خاموش لیٹے رہتے ہیں۔ پڑوسی کی گردن ماری جاتی ہے۔ گھر جلایا جاتا ہے۔ بچوں کو زندہ جلایا جاتا ہے معصوم لڑکیوں کی آبروریزی ہوتی ہے۔ تو لوگ ہم کر اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے دبک جاتے ہیں کہ شکر ہے یہ ان پر نہیں بیتی۔ زندہ کچھ دیکھنے کی ہمت رکھتے ہیں نہ سننے کی۔

اور ظالم شیر ہو جاتا ہے۔ ایک ایک قدم انتہا کی طرف بڑھا جاتا ہے۔ دل آہستہ آہستہ پتھر ہو جاتا ہے۔ بھیانک ترین ظلم دیکھ کر بھی متاثر نہیں ہوتا۔ اسے جائز بلکہ اپنے مفاد کے لیے ضروری سمجھتا ہے۔ امیر معاویہ کے زمانے میں زمانۂ جاہلیت کی بھولی بسری وحشیانہ سزائیں پھر سے زندہ ہو گئیں۔ اسلام نے جن باتوں اور حرکتوں کی مذمت کی تھی۔ وہ جائز ہو گئیں۔ زندہ انسان کی کھال اتروا کر کڑھاتے ہوئے تیل میں پھونک دینا گدّی سے زبان کھنچوا لینا، ایک ایک عضو الگ کر کے کئی کئی دن تڑپا کر مارنا۔

اور یہ مظالم چوراہے پر سب کے سامنے کئے جاتے تاکہ لوگوں کو عبرت ہو اور دل پتھر ہو جائیں۔ لطیف جذبات کا گلا گھٹ جائے۔ نفسیاتی طور پر بے حس ہو جائیں اتنے خوف زدہ ہو جائیں کہ صرف جان بچانے کے لیے خود وحشیانہ حرکتوں پر تیار ہو جائیں۔ دل ایسے ہو جائیں کہ باپ بیٹے کا ماتم نہ کرے۔ بھائی بھائی کا گلا کاٹ دے۔ کٹھ پتلیوں کی طرح حکم مانے۔

کوفہ میں علیؓ کے چاہنے والے بہت تھے۔ اس لیے سب سے زیادہ ظلم انہیں کی جانوں پر ٹوٹے۔ ان میں سر اٹھانے کی سکت نہ رہی۔ باہر نکلتے خوف آتا۔

لونڈی غلام کے سامنے کھل کر بات کرتے ڈرتے کہ کہیں جا کر مخبری نہ کر دیں۔ مخبری کا پیشہ بے حد مقبول ہو گیا۔ جھوٹی سچی ہر اطلاع کی قیمت ملنے لگی۔ مقصد انسان کشی تھا جھوٹی گواہی پر ظلم ہوتے دیکھ کر لوگ مسحور سے ہو جاتے ہیں۔ عقل گم ہو جاتی ہے خود اپنے اوپر بھروسا نہیں رہتا۔

چن چن کر ایسے لوگ مارے گئے۔ جو عالم اور فاضل تھے۔ جنہیں لوگ مانتے تھے ان کے قول اور فعل پر بھروسہ کرتے تھے۔ جنہوں نے ضمیر فروشی سے انکار کر دیا تھا۔ تاکہ لوگ ان کی رہنمائی سے محروم ہو کر بھیڑ بکری کی طرح ناقص العقل رہ جائیں۔ باشعور مدبر بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ وہ فاشست نظام کا عوام کے سامنے پول کھول دیتے ہیں

بڑی حیرت کی بات تھی کہ حسینؓ ابن علیؓ کا خاندان اب تک اس آگ کے شعلوں سے دامن بچائے بیٹھا تھا۔ وہ از حد محتاط تھے۔ مگر بے خبر نہ تھے۔ ان کے پاس آنے جانے والوں پر پہرہ تھا۔ جو ان سے زیادہ میل جول بڑھاتا۔ وہ اچانک غائب ہو جاتا۔ حسینؓ سب جانتے ہوئے بھی دم بخود تھے۔ لوگ ان کی اس خاموشی پر بے حسی کا طعنہ دیتے۔ وہ سر جھکا کر سن لیتے۔

رسول خدا کی وفات کے بعد انہوں نے بہت کچھ دیکھا۔ وہ جانتے تھے اکثریت مظلوم ہے۔ اقلیت کے ہاتھ میں تلوار ہے۔ ان سے بے سوچے سمجھے ٹکر لینا خودکشی ہے۔ طاقت اندھی ہے۔ اکثریت جنتی ہے۔ ان لوگوں کو ختم کرنے کا بہانہ ڈھونڈ رہی ہے۔ جن کی طرف سے خطرہ ہے۔

امیر معاویہ تو دل سے چاہتے تھے کہ حسینؓ کوئی ایسی حرکت کریں کہ ان کے پورے خاندان کو مٹا دینے کا کوئی بہانہ مل جائے۔ سر اٹھا رہا اور سب کو کچل دیا جائے حسینؓ کی اس خاموشی سے انہیں بڑی وحشت ہو رہی تھی۔

امیر معاویہ نے بڑی کوشش کی کہ ابو الفضل عباس کو اپنی طرف توڑ لیں انہیں پیغامات بھجوائے۔

"دکیا کرنے میں پیچھے بیٹھے ہو۔ کسی صوبہ کی گورنری سنبھال لو۔ اسلام کی نا دستیجار

میں ہے۔ آؤ اور پتوار سنبھالو۔"

مگر انھوں نے حسینؓ کا ساتھ چھوڑنا منظور نہ کیا۔

علی اکبرؓ کی تعریفوں کے پل باندھے گئے۔ ان کو سبز باغ دکھائے گئے اگر وہ باپ کو چھوڑ کر امیر معاویہ کے کیمپ میں آجاتے تو یزید کی پوزیشن بہت مضبوط ہو جاتی علی اکبرؓ ہم شکل رسولؐ تھے۔ کم سن مگر انتہا سے زیادہ بردبار اور جری تھے۔ ان کی شہ سواری اور تلوار کی کاٹ کی دھوم تھی۔

"جو بھیڑ اپنے گلے سے جدا ہو گئی اسے بھیڑیا کھا جائے گا۔" انھیں اپنے دادا کے قول پر یقین تھا۔

"اتحاد تمہارا آخری ہتھیار ہے۔" انھوں نے یہی کہا تھا۔ حسینؓ نے اپنی اولاد کو بہت گہری تعلیم دی تھی۔ دنیا کی کوئی طاقت انہیں بہکا نہ سکی۔ وہ ایک دوسرے کا ہاتھ چھوڑنے پر راضی نہ ہوئے۔

امیر معاویہ پر یزید کی ولی عہدی کا جنون سوار تھا۔ بڑے وسیع پیمانے پر پروپیگنڈا جاری تھا۔ یزید کو اپنے حقدار ہونے کا یقین تھا بے شمار دولت اس کے قدموں میں تھی، انتہایت حسین اور وجیہہ تھا۔ عمدہ کپڑوں کا شوقین، نئے نئے فیشن ایجاد کرتا۔ شاعری میں حسن و عشق کے ایسے نقشے کھینچتا کہ لوگ مسحور ہو جاتے۔ شکار کا شوقین تھا۔ درجنوں اعلیٰ نسل کے کتے یورپ سے منگوائے تھے۔ شراب اور عورت کا رسیا تھا۔

اس کے محل میں ہر خطے کی زینت کے حسن اور رعنائی کا نمونہ موجود تھا۔ امیر نے بیٹے کا شوق دیکھ کر دور دور ممالک سے حسن کے نمونے منگا کر اسے بخشے تھے۔

یزید کے محل میں جنسی تماشیوں کے عجیب و غریب مظاہرے ہوا کرتے۔ محل کے بیچوں بیچ ایک ... سنگ مرمر کا حمل تھا۔ جسے طرح طرح کی شرابوں سے بھر دیا جاتا۔ پھر برہنہ حسینائیں اس میں غوطے لگائیں۔ چہلیں کرتیں۔ جام بھر بھر کر حاضرین کی پیاس بجھاتیں۔ شراب میں نہائی حسینہ کی دل فریبی پر یزید نے ایسے فحط فشاں اشعار کہے کہ سامعین ہوش سے پاگل ہو گئے۔

امیر معاویہ کی کوششیں جاری تھیں۔ جب اس سال یزید حج کے لیے روانہ ہوا۔ تو انہوں نے اس کے ساتھ اشرفیوں کے توڑے بھی کر دیئے تاکہ وہ لوگوں کو اپنا خیر خواہ بنا سکے۔ اس کا بہت خاطر خواہ اثر ہوا اور یزید کے بانکپن اور سخاوت کے گھر گھر چرچے ہونے لگے۔ حساس اور باشعور حیرت زدہ تھے کہ اسلام کن مدارج سے گزر رہا ہے۔

مگر وہ طبقہ جو امیر کی آنکھوں میں کانٹوں کی طرح کھٹکتا تھا۔ پھر ان کے آڑے آیا۔ ان لوگوں نے جب سخاوت کی آڑ میں چھپے ہوئے اصلی مقصد پر غور کیا تو چہ می گوئیاں شروع ہو گئیں۔ لوگ اشرفیاں واپس پھینک گئے کہ۔۔۔۔۔۔

"ہمارے ضمیر بکاؤ نہیں۔"

امیر معاویہ بہت جھنجلائے مگر وہ پھونک پھونک کر قدم رکھنے کے قائل تھے۔

ہٹلر نے اپنی کتاب مائین کیمپ میں لکھا ہے کہ اگر پتھر پر مسلسل ایک بوند ٹپکتی رہے تو ایک وقت ایسا آتا ہے کہ پتھر میں گڑھا ہو جاتا ہے۔ ایک بات خواہ وہ کتنی بھی مہمل ہو بار بار دہرائی جائے تو کان عادی ہو جاتے ہیں۔ بھولے بھالے دل رام ہو جاتے ہیں۔ جھوٹ اور فریب سب سے بڑی سچائی بن جاتے ہیں یزید کی مہم ناکام بھلا نہ رہی۔ ایک رخ تو پڑ گیا۔ اب اس کی سچائی کا سوال تھا۔ مروان نے ایک عظیم الشان جلسہ مدینہ میں کیا۔ اور مجمع کو مخاطب ہو کر کہا۔

"لوگو! امیر معاویہ اب بہت ضعیف ہو چکے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں اپنی زندگی میں کسی قابل اور دانا شخص کو اپنا جانشین مقرر کر دیں۔ تاکہ خدا اور اس کے نیک بندوں کی اعلیٰ پیمانے پر خدمت ہو سکے۔ بیعت کے لیے فضول وقت برباد نہ ہو لوگ ہنگاموں سے بچے رہیں۔ مطلب پرستوں کو سر اٹھانے کا موقع نہ ملے اور عوام خون خرابے کا شکار نہ ہو۔ ولی عہدی کے لیے کوئی لائق ترین خدا ترس انسان چنا جائے جو انصاف پسند خلفائے راشدین کے نقش قدم پر چل کر اسلام کی عظمت کو دوبالا کر دے۔ ایسا مثالی انسان اس وقت صرف ایک نظر آتا ہے۔ میرا مطلب

امیر معاویہ کے نیک نہاد فرزند ارجمند یزید بن معاویہ سے ہے۔ یقیناً تم سب ہمارے ہم خیال ہوں گے؟"

مگر "ہم خیالی" سے انکار کرنے والوں کا حشر دیکھ چکے تھے اس لیے آنکھیں چرائے گم سم بیٹھے رہے۔

مگر عبدالرحمٰنؓ بن ابوبکرؓ خلیفۂ اول کے فرزند۔ حضرت عائشہؓ ام المومنین کے برادر خاموش نہ بیٹھ سکے۔ انھیں طیش آگیا۔ پکار کر بولے۔

"مروان! خدارا دوزخ کی آگ سے ڈر تو پرلے درجے کا جھوٹا ہے اور تیرا آقا تجھ سے بھی چار ہاتھ آگے ہے۔ یزید نہایت پاجی ہے۔ ناچ رنگ، شراب و کباب کے سوا اسے کسی شے سے دلچسپی نہیں۔ کفر بھرے اشعار کہتا ہے۔ اور فاسق فاجر ہے۔"

مروان نے کہا۔

"یہ سب یزید کے دشمنوں نے اسے خواہ مخواہ بدنام کرنے کے لیے بے پرکی خبریں اڑائی ہیں۔ سراسر بہتان!"

"کمینے! تو سمجھتا ہے میں بہتان تراش ہوں۔ ملعون! تیری یہ مجال کہ میری نیت پر شک کرے۔"

یہ کہہ کر انہوں نے مروان کی ٹانگ پکڑ کر منبر پر سے گھسیٹ لیا۔

"اے دشمن اسلام! تو اس منبر پر بیٹھنے کے لائق نہیں۔"

ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ امیر کے سپاہیوں نے عبدالرحمانؓ کو چاروں طرف سے نرغے میں لے لیا۔ تلواریں سونت کر قتل پر آمادہ ہو گئے۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ کو خبر پہنچی تو فوراً آئیں اور مروان کو للکارا

"اے مردود! تو میرے بھائی پر ہاتھ اٹھانے کی ہمت رکھتا ہے۔ یاد کر رسول خدا نے بارہا تیری صورت پر لعنت بھیجی تھی۔"

حضرت عائشہؓ کے عقیدت مند ہر چہار طرف موجود تھے۔ ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

مروان دبک کر منبر سے اُتر آیا۔ فوراً اس نے ایک قاصد کے ذریعے امیر معاویہ کے حضور میں اس واقعے کی اطلاع پہنچائی کہ:

"عراق اور حجاز کے کچھ لوگ یہاں روڑا اٹکا رہے۔ میں نے معلوم کیا ہے کہ ان لوگوں کا حسینؓ ابن علیؓ سے بہت میل جول ہے۔ یہ لوگ ہمارے دشمن ہیں وقت آنے پر دھوکہ دیں گے۔"

امیر معاویہ کو جس بات کا ڈر تھا۔ وہی ہوئی۔ آلِ رسولؐ کا وجود ان کے لیے بہت بڑا خطرہ تھا۔ مگر وہ کسی طرح بھی حسینؓ کو اس ہنگامے سے وابستہ نہ کر پاتے مگر وہ جانتے تھے کہ مدینے کے لوگوں کی باغیانہ اسپرٹ ان ہی کے دم سے ہے جب تک وہ زندہ ہیں بغاوت کا جذبہ زندہ رہے گا۔ انھوں نے حسینؓ کو ایک طویل خط لکھا۔

"حکومت کے خلاف ہنگاموں کی ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے۔ وہ یہ کہ تمہیں وہم ہے کہ خلافت کے اصلی حقدار تم ہو۔ میں ان ریشہ دوانیوں کا مطلب اچھی طرح سمجھتا ہوں خیریت اسی میں ہے کہ اس خیال خام کو دل سے نکال دو۔ حسنؓ ابن علیؓ کے عہد کا تو پاس کرو۔ اگر میرے اصولوں سے اختلاف کیا تو مجھ سے کسی مروت کی امید نہ رکھنا۔ میں اپنی حفاظت کرنا جانتا ہوں۔ مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کی تو پچھتاؤ گے۔ ان باتوں سے کچھ نہ ہوگا۔ بے کار مسلمانوں میں پھوٹ پڑے گی۔ لوگ بہکائے میں آکر خون خرابے پر تیار ہو جائیں گے۔ امت محمدیہ اور دین اسلام کو نقصان پہنچے گا۔ خود اپنی جان خطرے میں ڈال رہے ہو۔ اس کی ذمہ داری مجھ پر عائد نہیں ہوتی۔"

حسینؓ ابن علیؓ نے بڑے غور سے اس خط کو پڑھا۔ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سے مشورہ لیا۔ سب کی رائے سے جواب مرتب کیا گیا۔

"تم نے جو کچھ میرے بارے میں سنا ہے۔ وہ تمہارے بیمار دماغ کی پیداوار معلوم ہوتی ہے۔ یا شاید تمہارے دل کا چور تم سے ایسی بے بنیاد باتیں کہلوا رہا ہے۔ مروان کی تحریر جو خود تمہاری ہے اس کی ناکامی کا الزام تم مجھ پر رکھنا چاہتے ہو۔ حالانکہ میرا اس سے

دور کا بھی واسطہ نہیں۔

تمہارا رویّہ انسانی ذہن کے لیے کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں۔ تم سمجھتے ہو عرب قوم تمہارے ساتھ ہے۔ حالانکہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تمہاری "ہر دلعزیزی" کا راز وہ کثیر فوج ہے جسے تم نے بڑی جاں فشانی اور زر پاشی کے بعد کیا ہے۔ مگر تمہارا یہ لشکر اس بات کی ہرگز دلیل نہیں کہ تم حق پر ہو اور تمہیں عوام کا اعتماد حاصل ہے۔

تمہارے ہاتھ کیسے کیسے برگزیدہ علماء کے خون سے آلودہ ہیں۔ جس نے بھی تمہاری فرعونیت کے خلاف آواز اٹھائی اسے تم نے صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دیا۔ تم نے اپنی ساری قسمیں توڑ دیں۔ سارے وعدے جھلا دیئے۔ اور بے قصور انسانوں کو ہولناک سزائیں دے کر ہلاک کیا۔ ہاتھ پیر کاٹ کر انہیں لوہے کی سلاخوں سے اندھا کیا خاندان کے خاندان شہید کروا دیئے۔

پھر بھی ایسے لوگ موجود ہیں اور بڑی تعداد میں موجود ہیں جو جسمانی موت کو روحانی موت پر ترجیح دیتے ہیں۔ تم اپنی ہوسِ ملک گیری کو اسلام کی بہتری کا نقاب پہنا رہے ہو۔ خود تم نے جو عروج حاصل کیا ہے۔ آزاد رائے کو اس میں کوئی دخل نہ تھا۔ تم نے دولت اور سیاسی جوڑ توڑ کے بل بوتے پر خلافت حاصل کی ہے اور اس خلافت کو اپنی جائز کمائی گردان کر اپنے بیٹے کو سونپنے کے خواب دیکھ رہے ہو تم اسلام کی حمایت کی ڈینگیں مارتے ہو۔ حالانکہ تم نے اسلام کی صورت مسخ کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔

"معاویہ! خدا سب دیکھ رہا ہے عرب قوم بھی اندھی نہیں، تم سیاسی چالوں سے اپنے بیٹے کو جو انسان کہلائے جانے کا بھی حق دار نہیں اپنا جانشین بنانے پر تلے ہوئے ہو۔ اسلام کی اتنی بڑی توہین کرتے وقت تمہیں خوف بھی نہیں آتا۔ تم بہت غلط راستے پر جا رہے ہو۔ تمہاری بزرگ تمام

کرنا اور تمہیں یوں ہر طرح کی چھوٹ دینا اسلام سے غداری اور گناہِ عظیم ہے؟

یہ خط پاکر معاویہ غصّے سے پاگل ہو گئے۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ خود مدینے جائیں۔ لوگوں کو اونچ نیچ سمجھائیں۔ خاص طور پر حسینؓ ابن علیؓ کو کسی طور سے شیشے میں اتاریں کہ وہ ان کے مخالفین کے قبلہ و کعبہ ہیں۔ اگر وہ قابو میں آ جائیں تو پھر کسی کو یزید کی ولی عہدی سے انکار نہ ہو گا۔ امیر بڑے کروفر سے مدینے آئے۔ بڑی شاندار دعوتیں دیں۔ جن میں مخصوص اصحاب کو مدعو کیا۔ باتوں باتوں میں کسی نے یزید کی ولی عہدی کا ذکر بھی چھیڑ دیا۔ فوراً کسی نے یزید کی مدح خوانی شروع کر دی۔ مخالفت کی کسی نے ضرورت محسوس کی نہ کسی کو مصیبت سر لینے کا شوق تھا۔

حسینؓ ابن علیؓ نے سنی ان سُنی کر دی۔ نہ کسی کو ان کی رائے معلوم کرنے کی ہمت ہوئی نہ انہوں نے اپنے میزبان کو رائے دینا ضروری سمجھا۔ بات ٹل گئی۔

مگر حسینؓ احتیاطاً مع اپنے خاندان کے مکہ روانہ ہو گئے۔

اب میدان صاف تھا۔ حسینؓ اور ان کے ہم خیال اصحاب کی موجودگی میں تکلف ہو رہا تھا۔ اب جو دعوتیں ہوئیں خوب کھل کر ہوئیں۔ جلسوں میں بڑی تفصیل سے یزید کی خوبیوں پر روشنی ڈالی گئی۔ صاف صاف واضح کر دیا گیا کہ خلیفۂ وقت جو کچھ کر رہے ہیں خدا اور اس کے رسولؐ کے احکامات کی پابندی ہے۔ یہ قطعی فیصلہ ہے۔ اگر یزید کی ولی عہدی سے کھلتے انکار کیا تو اسے دشمنِ اسلام سمجھا جائے گا۔ خلیفۂ وقت کی مخالفت اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکامات کی مخالفت ہو گی۔ اسلام کی بہبودی کی خاطر انہیں راہِ راست پر لانے کے لیے سخت سے سخت رویہ اختیار کیا جائے گا۔ ورنہ اسلام کی اینٹ سے اینٹ بج جانے کا خطرہ ہے دین کی حفاظت کے لیے جو خون ریزی ہو گی۔ اس کے ذمہ دار وہ لوگ ہوں گے جو لالچی اور خود غرض ہیں اور اپنے ذاتی مفاد کے لیے دشمنی پر تلے ہوئے ہیں۔ اور خود خلافت کا حقدار سمجھتے ہیں۔

یہی باتیں جلسوں اور جلوسوں میں بار بار ساتھی دفعہ دہرائی گئیں کہ بھولے بھالے انسان

پھر جرم سے محسوس کرنے لگے۔ اپنی عاقبت تاریک نظر آنے لگی - مگر کچھ لوگ اب بھی ایسے موجود تھے جو امیر معاویہ کی گھن گرج سے ڈر گئے، مگر دل میں اور زیادہ بدظن ہو گئے۔ یزید کی ولی عہدی کے سوال کو ٹال کر کھسک لیے۔ کھلم کھلا نہ مخالفت کی نہ بیعت کی۔ امیر ان کی اس ہوشیاری پر خون کے سے گھونٹ پی کر رہ گئے۔

وہ عبداللہ بن عباسؓ سے بڑے تپاک سے ملے بڑی معاملت کی باتیں کیں۔ اپنے احسانات یاد دلائے۔ اور سمجھایا کہ حسینؓ ابن علیؓ کے جھگڑے میں کیوں پڑتے ہیں۔ عاقبت بگاڑنے سے کیا فائدہ؟ ان کا انجام ظاہر ہے۔ ان کے والد علیؓ ابن طالب نہ جیت پائے۔ تو ان کی کیا حقیقت ہے۔ مجھ سے ٹکرائے تو پاش پاش ہو جائیں گے۔

عبداللہؓ بن عباسؓ نے غور سے باتیں سنیں پھر کہنے لگے۔

"حسینؓ اپنے والد علیؓ ابن طالب کے سچے جانشین ہیں۔ اگر آزمائش منظور ہے تو آزاد انتخاب کے اصول کو عمل میں آنے دو۔ میرا خیال ہے وہی منتخب ہوں گے۔ اور تمہارا بیٹا ناکامیاب رہے گا۔ اس کا حسینؓ سے کیا مقابلہ؟ یا امیر حسینؓ کو بے کار پریشان نہ کرو۔ رسولِ خدا کے ایک تو وہی قریب ترین عزیز رہ گئے ہیں۔ عوام ان کی برتری کے دل سے قائل ہیں۔ وہ اس عہدے کو خوش اسلوبی سے سنبھال لیں گے۔ تمہارا لاابالی بیٹا کیا کھا کر ان سے مقابلہ کرے گا۔"

اس کھلی مگر حقیقت پر مبنی مخالفت پر امیر معاویہ کا خون کھول اٹھا۔ مگر وہ بڑے زبردست مدبر تھے۔ بڑی نرمی سے بولے۔

"ہو سکتا ہے آپ کی رائے میں کچھ حقیقت ہو مگر شام میں یزید کے بہت چاہنے والے ہیں۔ جو بارسوخ ہیں۔ وہ تو میری بھی حکم عدولی پر تل جائیں گے اب تو ملک کی اکثریت یزید کی ولی عہدی کو مانتی ہے۔ اگر حسینؓ نے اپنا حق جتانے کی کوشش کی تو ہنگامے ہوں گے۔ وہ سر پھرے خون کی ندیاں بہا دیں گے۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ یزید کو لوگ کتنا چاہتے ہیں۔ نوجوانوں میں تو اسے مجھ سے بھی زیادہ ہر دل عزیزی حاصل ہے۔ وہ من چلے بہت طاقت ور ہیں۔ مقابلے پر آ گئے تو مسلمان مسلمان کا خون کرنے

گئے گا۔"

"خون خرابے سے بہر صورت احتراز کرنا چاہیئے۔"

عبداللہؓ بن عباسؓ آنکھوں سے معذور گوشہ نشین قسم کے انسان تھے خون خرابے کے تصور سے کبیدہ خاطر ہوگئے۔ امیر معاویہ نے انھیں اپنے لیے خطرناک نہ پاکر یزید کی جانشینی کو تسلیم کرنے پر زور ڈالا۔ ان کی خاموشی کو ہی غنیمت سمجھا۔

اہل مدینہ بغیر کسی ناخدا کے طوفان کے تھپیڑے سہتے رہے اور مجبوراً جان چھڑانے کو امیر معاویہ کے آگے جھک گئے۔

مدینہ میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کرکے انھوں نے مکہ کا رخ کیا۔ حسینؓ ابن علیؓ اور عبدالرحمانؓ بن ابو بکرؓ کو خلعتیں اور تحائف بھیجے جو انہوں نے شکریے کے ساتھ واپس کر دیئے۔ امیر معاویہ نے بڑے صبر سے اس گستاخی کو ٹال دیا۔ اور ان سے براہ راست گفتگو کی خواہش ظاہر کی۔

لوگوں کے کان ان کی طرف لگے ہوئے تھے۔ کیا باتیں ہوں گی۔ کیا فیصلہ ہوگا۔ قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ حسینؓ کیا طے کرتے ہیں۔ اگر سمجھوتہ ہوا تو کن شرائط پر ہوگا

حسینؓ ابن علیؓ کو بلاوا پہنچا تو سارے خاندان میں کھلبلی مچ گئی۔ سب گرد جمع ہوگئے۔ اکیلے جانا مناسب ہے یا نہیں۔

"میں ایک انسان سے ملاقات کرنے جا رہا ہوں کسی شیر یا چیتے کی کچھار میں نہیں جا رہا ہوں۔" انھوں نے خاص طور پر عباسؓ ابوالفضل کو سنانے کے لیے کہا۔

عباسؓ نے باپ کی وصیت کو کبھی ایک لمحے کے لیے فراموش نہیں کیا تھا۔ جب چار دن تک زہر میں بجھے ہوئے خنجر کے مارے کرب میں مبتلا ہو کر وفات پائی تھی تو انھیں حسینؓ کے سپرد کیا تھا مگر ساتھ ہی حسینؓ کی حفاظت کرنے کی بھی تلقین کی تھی۔ عباسؓ ایک لاثانی شہسوار اور تلوار کے دھنی تھے۔ خفیہ طور پر انھوں نے سو جوانوں کی ایک جمعیت تیار کی تھی۔ یہ نوجوان عرب کے بہترین سپاہیوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ جمعیت ان کا لوہا مانتی تھی۔ عباسؓ کے ساتھ ان بہادر نوجوانوں نے بھی حسینؓ کی حفاظت کی قسم

کھائی تھی۔ حسینؓ کو علم بھی نہ ہوتا اور یہ سپاہی عباسؓ کی سرداری میں دور ہی دور رہ کر ان کی حفاظت کرتے۔ جب بھی حسینؓ کسی کام سے باہر نکلتے تھوڑے فاصلے پر ساتھ ساتھ چلتے۔ مسجد میں داخل ہوتے تو ان کے آس پاس صفوں میں موجود رہتے۔ مسلح اور چاق و چوبند! انھیں لوگوں کے خوف سے کسی کو حسینؓ پر اچانک حملہ کرنے کا موقع نہ ملا حسینؓ کو بہادروں کے اس کا کچھ تھوڑا سا پتہ تھا۔ انھوں نے عباسؓ سے باز پرس کی۔ مگر انھوں نے خاموشی اختیار کر لی۔

"برادر! میں کسی ملک کا بادشاہ نہیں جس کی حفاظت کے لیے مسلح دستے کی ضرورت ہو۔ مجھے ڈر بھی کس کا ہو سکتا ہے۔ سبھی تو میرے اپنے ہیں۔" حسینؓ کہتے مگر عباسؓ نے کبھی کوئی دلیل پیش کی نہ کوئی حجت کی۔ ایک یقین تھا۔ جس پر وہ عمل کرتے تھے۔

حسینؓ ابن علیؓ تنہا امیر معاویہ سے ملاقات کر گئے۔ بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں۔ پھر خاموشی حائل ہو گئی۔ بڑی نرمی سے امیر بولے۔

"اگر ٹھنڈے دل سے سنو تو کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"میں بغور سن رہا ہوں۔"

"اسلامی ممالک کے معزز اور سربراہ لوگ مجھ پر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ یزید کی جانشینی کا سوال تمام مسلمانوں کے سامنے پیش کروں۔ اب تک میں نے ٹالا۔ مگر اب دباؤ کی شدت بڑھتی جا رہی ہے۔ سب یزید کے شدید مداح ہیں۔ ان کی نظروں میں یزید سے بہتر کوئی نہیں۔"

"اور تمہاری نظروں میں؟" امام مسکرائے۔

"مجبور ہوں مجھے بھی ان کا ہم خیال ہونا پڑ رہا ہے۔ واللہ مجھے بھی یزید سے بہتر کوئی دکھائی نہیں دیتا۔"

"تمہیں اپنے بیٹے کے سوا اگر کوئی نظر نہیں آتا۔ تو یہ تمہاری آنکھوں کا قصور ہے۔"

امیر معاویہ کو غصہ آنے لگا مگر زبردستی مسکرائے۔

"تم ہی کہو اور کون اس لائق ہے؟"

"میرے بھئے تم کیوں انتظار کرتے ہو، آزادانہ انتخاب ہو جانے دو۔ خود ہی پتہ چل جائے گا کہ تمہارے بیٹے سے بہتر کوئی ہے یا نہیں۔"

"میں سمجھ گیا تمہارا اشارہ خود اپنی ذات کی طرف ہے؟"

"اگر ہو بھی تو اس میں ایسی اچنبھے کی کون سی بات ہے۔ ملک اور قوم کی خدمت کی صلاحیت مجھ میں یزید سے زیادہ ہی ہو گی۔ مگر تم ڈرتے کیوں ہو؟ عوام کا فیصلہ مناسب ہی ہو گا۔"

"عوام جاہل اور احمق ہیں۔ وہ سیاسی باریکیوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ میں مانتا ہوں تم بڑے متقی اور پرہیزگار ہو۔ مگر اسلام اس وقت ایسے دور سے گزر رہا ہے کہ کسی اللہ والے کے بجائے بارعب، سخت گیر اور ہر دل عزیز قائد کی ضرورت ہے جو امور سلطنت میں مہارت رکھتا ہو۔ لوگ جس کا حکم مانیں۔ یزید بہت ہر دل عزیز ہے اور لوگ اس سے مرعوب بھی ہیں۔"

"یعنی وہ ایک جابر اور قاہر حکمران بن سکتا ہے۔ جس کے نام سے لوگ لرزیں جس کی ہر نظر ان کی موت کا پیغام ہو جس کی بے رحمی اور فرعونیت ضرب المثل ہو۔ بے شک امیر تم اور تمہارا بیٹا ان صفات کے حامل ہیں۔ تم دونوں کا رعب ہیبت کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ رہی زمانے کی شکایت اور اسلام کے نازک دور سے گزرنے کا سوال تو یہ سب تمہارا ہی کیا دھرا ہے۔"

"یہ الزام ہے"

"امیر یہ حقیقت ہے۔ تم نے نئے سرے سے اسلام میں شہنشاہیت کی بنیاد ڈالی اسلامی اشتراک کا گلا گھونٹا۔ اور عوام پر ظالم اور خون خوار حاکم مسلط کئے۔ اسلام کی سلامتی کی نہیں، تمہیں ان حاکموں کی حفاظت کی فکر کھائے جاتی ہے اسی لیے تمہیں اتنی بڑی فوج رکھنا پڑتی ہے۔ ورنہ انہیں عوام پیروں تلے روند

ڈالیں۔ ان حاکموں کی سلامتی تمہاری اپنی سلامتی ہے۔ تم ایمان دار حق پرستوں سے ڈرتے ہو۔ اگر خلافت کسی نیک نہاد، شریف، خدا ترس کے ہاتھ میں پہنچ گئی تو یہ حاکم من مانی نہ کر پائیں گے۔ ان کے اعمال کا محاسبہ ہو گا۔ مگر تم اور تمہارے حاکم کس قسم کے محاسبے کے لیے تیار نہ ہو گے۔

"یا حسین!" کیسی باتیں کرتے ہو۔ میرے تمام ماتحت انتہائی خدا ترس منصف المزاج اور حلیم الطبع ہیں۔ خدمتِ خلق اُن کا واحد مقصد زندگی ہے۔"

حسینؓ سنجیدہ طبیعت کے انسان تھے۔ بلند آواز سے قہقہہ لگانے کی نہ ان کی عادت تھی نہ زمانے نے کبھی اجازت دی۔ مگر اس وقت وہ اپنی ہنسی نہ روک سکے بے ساختہ ہنس پڑے۔

"واللہ معاویہ تم بڑے ہی دلچسپ انسان ہو۔ تم نے اپنے دربار میں اس قدر مسخرے بھر لیے ہیں کہ ان کی صحبت میں تم بھی تماشا بن گئے ہو۔ کیا واقعی تمہارا ایمان ہے کہ تمہارے حاکم خدا ترس ہیں۔ یا یہ تمہاری لاعلمی ہے۔ بہر دونوں ہی صورتوں میں عام انسان کی بدنصیبی ہے۔ تمہیں اپنے حاکموں کے کرتوتوں کی خبر نہیں۔ وہ تمہاری آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہیں۔ یا تم ان کی پردہ پوشی پر تلے ہوئے ہیں۔ جو بات طشت از بام ہے کیا تم سے چھپی ہوئی ہے۔ تم اتنے نادان ہو تو خلافت کے اہل نہیں۔ جاؤ کسی نابالغ بچے سے پوچھو تو بتا دے گا کہ تمہارے ماتحت جو تمہارے عزیز و اقارب اور دوست ہیں۔ دنیا کے بدترین حاکم ہیں۔ بے کسوں اور مجبوروں کا خون نچوڑ کر اپنے محلوں کی بنیادیں استوار کر رہے ہیں۔ ناچ رنگ، شراب و کباب ان کا واحد مشغلہ ہے۔ یہ تمہارے پاپوش بردار تمہارے بیٹے کی بدکرداریوں کے رازدار ہیں۔ انھیں کے کندھوں پر یہ تمہارا تاج و تخت سجا ہوا ہے۔ انھیں کے بل بوتے پر تم فرعونِ بے سامان بنے اسلام کے اصولوں کو پیروں تلے روند رہے ہو۔"

امیر معاویہ کا چہرہ نیلا پڑ گیا۔ آنکھوں سے چنگاریاں اڑنے لگیں۔ گھٹے

ہونے لگے سے بولے۔
"تم خلیفۂ وقت امیرالمومنین کی ذات پر حملہ کر رہے ہو، حسینؓ ابن علیؓ! تم اپنی اوقات بھول رہے ہو۔"
"میں ایک ایسے شخص کو امیرالمومنین ماننے سے قاصر ہوں جو جان بوجھ کر اسلام کو تباہی کی طرف لے جا رہا ہوں۔ تم اپنی انتہائی عزیز سردار تھے اور تمہارا بیٹا تم سے چار ہاتھ آگے ہے۔ اس کی بدکاریوں کے قصے سن کر تو لوگ کانوں میں انگلیاں دے لیتے ہیں۔"
"یزید کے بارے میں تمہارے اتنے واہیات خیال ہیں۔"
"میں نے جو کچھ کہا وہ سچ ہے۔"
"مگر وہ تو تمہاری بہت تعریف کرتا ہے؟"
"وہ بھی سچ ہے۔" حسین مسکرائے۔
امیر چڑ گئے پر نرمی سے بولے۔
"حسینؓ، ہم تو کوئی غیر نہیں۔ اپنے ہی ہیں۔ یزید تمہارا چھوٹا بھائی ہے۔ تم اسے بس نام کو خلیفہ بن جانے دو۔ ساری طاقت تم اپنے ہاتھ میں رکھنا۔ یزید تمہارے حکم سے سرتابی نہ کرے گا۔"
"تو پھر یہ نام کی خلافت تمہارے بیٹے کے کس کام کی ہوگی؟"
"بس اسے ضد ہے۔"
امیر خلافت مٹی کا کھلونا نہیں جو ایک ضدی مچلتے ہوئے بچے کو منانے کے لیے تھما دی جائے۔"
"تم تو الٹی بحث کرتے ہو۔ یزید خلیفہ ہو جائے گا۔ تو تمہارا کیا حرج ہوگا۔ اصل طاقت تو تمہارے ہاتھ میں رہے گی جو چاہو کرنا۔"
"اصل میں تمہارا مطلب ہے تمہارے بیٹے کے سر پر دستِ شفقت پھیر کر عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی خدمات انجام دوں۔ وہ لوگ جو مجھ پیار

بھروسہ کرتے ہیں اسے امیر! خود دار سمجھ کر اس کے عیوب سے چشم پوشی کریں بلکہ اسے سراہیں۔ معاویہ! میں اتنا بڑا جھوٹ کبھی نہیں بول سکوں گا۔"

مارے غصے کے امیر انگارہ ہوگئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ سامنے حسینؓ نہیں اُن کے والد علیؓ ابن ابی طالب بیٹھے ہیں۔ اور امیر ان کی بلاغت اور فصاحت کے طوفان میں ہاتھ پیر مار رہے ہیں۔ ان کی دلیلوں نے سارے خواب چکنا چور کر دیئے۔ بری طرح برہم ہو اٹھے۔

"حسینؓ خواہ مخواہ ضد کر کے پریشان کر رہے ہو۔"

"تو پھر تم یزید کی ولی عہدی کا بیہودہ خیال دل سے نکال دو۔ آزاد انتخاب پر بھروسہ رکھو۔ یا مجلس شوریٰ مقرر کر دو۔ اس کی رائے پر سب کچھ چھوڑ دو۔ وہ جسے چاہیں تمہارا جانشین مقرر کریں۔ مگر ایک شرط ہے مجلس شوریٰ کے ممبران کا انتخاب ایمان داری اور انصاف کی رو سے ہو۔ تمہارے پٹھو نہ بھر دیئے جائیں۔ عوام کے نمائندے ہوں۔"

"اور شام اور دوسرے ممالک کے بااثر احباب کو کیا جواب دوں۔ وہ تو یزید کے لیے بیعت کر چکے ہیں، وہ تو میرا جینا دوبھر کر دیں گے۔"

"نہیں، اگر وہ حق پرست ہیں تو بھی اسلامی قدروں کی وقعت کریں گے۔ اور تمہارے شکر گزار ہوں گے کہ تم نے انہیں ضمیر فروشی سے بچا لیا۔ وہ بھی خوشی کبھی یزید کی حمایت نہ کریں گے۔ سب اس کی نازیبا حرکتوں سے نالاں ہیں صرف تمہارے خوف سے خاموش ہوگئے ہیں۔"

"حسینؓ! تم ان باریکیوں کو نہیں سمجھتے۔ عرصے سے گوشہ نشین بن بیٹھے ہو۔ تم کیا جانو حکمت عملی کس چڑیا کا نام ہے۔"

"میں نے سستی یا کاہلی کی وجہ سے گوشہ نشینی اختیار نہیں کی۔ تمہاری مصلحتوں کا شکار ہوں۔ میں نے اپنا زیادہ وقت ان باریک گتھیوں کو سلجھانے میں گزارا ہے۔ انہیں تم سے زیادہ سمجھتا ہوں۔ رہی حکمت عملی تو تمہارے اس فن کو میں

گناہ سمجھتا ہوں۔ وہ تمام عیوب اور بے عنوانیاں جو عوام کی ہلاکت کا باعث ہوتی ہیں۔ جنھیں دور کرنے کے لیے اسلام نے کفر سے ٹکر لی۔ تم نے حکمت عملی کی آڑ میں پھر سے زندہ کر دیں۔ تم نے کفر کا رہن سہن اپنا لیا۔ ان کے پرانے دستور، ان کے معاشرے کی گھناؤنی پابندیاں ان کا وحشیانہ نظام جو پوری انسانیت کو چند طاقت ور مطلب پرستوں کا غلام بنا دیتا ہے، ان کا ظلم اور زبردستی تم نے پھر سے اپنا لیا۔ جہاں کل کفار جمے ہوئے تھے آج چند طاقت ور مسلمان ڈٹے ہوئے ہیں۔ ملک ساری دولت جو تجارت کے فروغ کے لیے آزادانہ گھومتی ہے، چند حاکموں کے ہاتھوں میں قید ہے۔ سونا چاندی جو تبادلہ اشیاء کے استعمال میں آتے تھے۔ اب تمہارے محلوں کی سجاوٹ میں لگا دیئے گئے ہیں ساری دولت چند انسانوں کی نجی ملکیت بن گئی ہے۔ کروڑوں ہاتھ خالی ہو گئے، صنعت و حرفت کا خون ہو رہا ہے۔ علم و فن کا گلا گھٹ رہا ہے۔ تم اپنے عیش کا سامان بیرونی ممالک سے منگاتے ہیں۔ تمہارے کاریگر کے ہاتھ شل ہو گئے۔ تجارت ٹھنڈی پڑ رہی ہے۔ بے کاری ملک میں دن بدن بڑھ رہی ہے۔ عام انسان کے منہ کا نوالہ چھن رہا ہے لوگ تمہاری اس طرز حکومت سے نالاں ہیں۔ ان کی زبانیں بند کرنے کے لیے تمہیں زیادہ سے زیادہ فوج اور ہتھیار جمع کرنے پڑتے ہیں۔ جس کے لیے دولت تم ان ہی سے کھینچتے ہو جنہیں یہ ہتھیار موت کے گھاٹ اتارتے ہیں۔

امیر معاویہ کو اپنے بیٹے کی ہر ادا پیاری تھی۔ وہ اپنی حسین اور آزادی کی متوالی ماں کا خون اپنی رگوں میں لایا تھا۔ تندمزاج اور خراج تھا۔ انہیں اس کی ہر ادا پر فخر تھا۔ اس کے کتے بھی اعلیٰ نسل کے تھے۔ اور تازہ گوشت کے سوا کسی چیز کو منہ نہ لگاتے تھے۔ اور انسان سوکھے ٹکڑوں کو ترس رہے تھے۔

اس کا ایک چہیتا بندر تھا۔ جس کا نام اس نے ابا القیس رکھا تھا۔ وہ روز مخمل اور کم خواب کے کپڑے پہنتا تھا۔ اور زرنگار گاڑی میں کوچہ و بازار کی سیر کو نکلتا تھا۔ مگر حسینؓ ابن علیؓ نے یزید کی کچھ ایسی مضحکہ خیز تصویر کھینچی کہ امیر برافروختہ ہو گئے۔

"تم بال کی کھال نکال رہے ہو؟" انھوں نے جھلا کر کہا۔

"یزید خوب مرد ہے۔ عورتیں اس پر فدا ہیں۔ نوجوان اور زندہ دل ہے، ایک شاعر کا دل سینے میں رکھتا ہے۔ اُسے حسن سے عشق ہے یہ تو اس کی نیک دلی کا ثبوت ہے۔ اچھے لباس اور خوشبو کا شوق تو سنّتِ رسول اللہؐ ہے۔"

حسینؓ کے چہرے پر غم واندوہ کی گھٹا چھا گئی۔ گلوگیر آواز میں کہا میں کہا۔

"یہی تو اس دور کا المیہ ہے۔ اسلام اور سنّتِ رسول اللہؐ کو مسخ کر کے اپنی غرض کے لیے کرو، معنی پہنائے جا رہے ہیں۔ تمہاری ان دلیلوں پر تمہارے درباری اور بالوش بادر داد تحسین دیتے ہوں گے۔ لیکن صاحبِ عقل ان باتوں کو خوب سمجھتے ہیں اپنی آنکھوں سے اسلامی روایات کا خون ہوتے دیکھ رہے ہیں اور دم بخود ہیں۔ مگر یاد رکھو امیر، عرب قوم وقتی طور پر کبھی دم مار کر بیٹھ جاتی ہے۔ کھوٹا سکّہ زیادہ دن نہیں چلتا۔ ایک دن صبر کا پیمانہ چھلک جائے گا۔ تمہاری ساری بندشیں بندیاں مفلوج ہو جائیں گی۔ یہ سوئی ہوئی انسانیت جاگ اٹھے گی۔ اور تمہارے ریت کے محل ڈھے جائیں گے، خواب پراگندہ ہو جائیں گے۔"

"مجھے دھمکیاں دے رہے ہو؟"

"نہیں صرف تمہیں آنے والے وقت سے آگاہ کر رہا ہوں۔ تمہارے پاس طاقت ہے، دولت ہے۔ چاہو تو ان صلاحیتوں کو عام انسان کی بہبود پر صرف کر سکتے ہو۔ تم عرب قوم کو بامِ عروج پر پہنچا سکتے ہو۔"

"حسینؓ خدارا مجھ سے جھگڑا نہ کرو۔ میں تم سے صلح چاہتا ہوں۔ اچھے تعلقات چاہتا ہوں۔ میں دوستی کا ہاتھ بڑھا رہا ہوں۔ تم حقارت سے جھٹک رہے ہو۔ میں تمہاری ہر مانگ بھرنے کو تیار ہوں۔ تم اپنی شرائط پیش کرو۔ انشاء اللہ میری طرف سے کوتاہی نہ ہوگی۔"

"بس میری ایک ہی مانگ ہے۔ عرب قوم کو جینے کا حق دو۔ اپنی نیچ کے بل بوتے پر نہیں کھلے میدان میں اپنے بلند کردار کے بل پر۔ اپنی صداقت اور انصاف

پسندی کے سہارے۔ انھیں کچلے بغیر، ان کے دلوں کو جیت لو۔ یہ شہنشاہت ختم کر کے جمہوری نظام قائم کرو۔ جتنا تم اور تمہارے بیٹیا خرچ کرتے ہیں۔ اتنا ہی ہر انسان کو لینے دو۔ نالائق اور نااہل حاکموں کو معزول کرو۔ ملک کی دولت عوام کی بھلائی اور بہبودی کے لیے صرف ہونے دو۔ جیسا کہ رسول اللہؐ اور دوسرے خلفائے راشدین کے زمانے میں ہوتا تھا۔ تب عرب قوم ساری دنیا پر چھائی ہوئی تھی۔

معاویہ چڑ گئے۔

"تمہیں دنیا کا غم کیوں کھائے جاتا ہے۔ حسینؓ ملک گیری کی ہوس دل سے نکال دو۔ مجھ پر فتح نہ پا سکو گے۔ میرے صبر کا زیادہ امتحان نہ لو۔ دوستی سے بڑھائے ہاتھ پر انگارے نہ ڈالو۔ پھر بعد میں مجھے الزام نہ دینا کہ میں نے مروت نہ برتی۔ واللہ میں کتنا برداشت کر رہا ہوں۔ میں نے تم کو خلعت بھیجی تم نے مارے غرور کے واپس کر دی۔ یہ میری سخاوت اور دریا دلی کا جواب ہے؟"

"امیر دنیا کا غم میرے نانا رسول اللہؐ کا غم تھا۔ یہ غم انھوں نے مجھے ورثہ میں دیا ہے۔ میرے نانا کی امت کے دکھ درد میرے دکھ درد ہیں۔ میں اپنے ورثہ سے کیسے منہ موڑ سکتا ہوں۔ میں تمہاری دریا دلی اور سخاوت کی نشانی ایک خلعت کیا کروں گا۔ یہ خلعت میری قوم کی برہنگی کی پردہ پوشی نہیں کر سکتی۔ ذرا آنکھیں کھول کر دیکھو امیر، سڑک پر چلنے والا راہ گیر کس حال میں ہے۔ اس کا لباس پیوند سے داغدار ہے۔ پیر جوتے سے محروم ہیں۔ سنا ہے تمہارا چہیتا بیٹا ایک لباس کو دوبارہ نہیں پہنتا۔ امیر تم نے عرب قوم کی عورتوں کے سر سے ردائیں نوچ لیں۔ اور اپنے محلوں کی رقاصاؤں اور قباؤں کو اطلس و کمخواب پہناتے ہو۔"

"بس تم میری شان و شوکت دیکھ کر جلتے ہو۔" امیر نے چوٹ کی۔ حسینؓ مسکرا دیئے۔

"معاملہ اس کے برعکس ہے۔ تم میری تہی دستی سے جلتے ہو۔ بلکہ ڈرتے ہو۔ اپنی لمبی چوڑی فوج اور سنگین قلعوں کے باوجود تم مجھ فقیر سے ڈرتے ہو کیونکہ خدا نے

مجھے قناعت کی وہ دولت بخشی ہے جس کے مقابلے میں تمہارے سارے زرد جواہر ماند ہیں۔ تمہاری شان و شوکت کھوکھلی ہے۔ لہذا تم مجھ سے میری ریاست نہیں چھین سکتے۔ نہ ہی اسے خرید سکتے ہو۔ اس لیے تم دستِ سوال پھیلانے پر مجبور ہو۔ مگر یہ میرا ورثہ ہے۔ یہ بیچا نہیں جا سکتا۔ جیسے میری رگوں میں دوڑنے والا خون نہیں بیچا جا سکتا۔ نہ اسے مستعار دے سکتا ہوں کیونکہ یہ ورثہ بھی میری ملکیت نہیں۔ میری قوم کی امانت ہے۔

اتنا کہہ کر حسینؓ ابن علیؑ اٹھ کھڑے ہوئے!

حقیقت

حسینؑ ابن علیؑ امیر معاویہ سے ملاقات کر کے باہر نکلے تو ایک طویل سایہ ان کے قدموں پر پڑا۔

"عباسؑ!" انھوں نے اطمینان کی سانس لی۔ اور چھوٹے بھائی کے مضبوط شانے کا سہارا لیا۔ عباسؑ نے اپنے بزرگ بھائی کے ہاتھ کا بوجھ کچھ زیادہ محسوس کیا اور فخر سے ان کا سر بلند ہو گیا۔

دونوں اپنے اپنے خیالات میں غرق خاموش چلتے رہے۔ اُن سے تھوڑے فاصلہ پر کچھ اور قدم بھی چل رہے تھے۔ بظاہر بے تعلق انجان راہ گیروں کی طرح۔ حسینؑ پہچانتے تھے۔ وہ عباسؑ کے دوست ہیں۔ جو ہر جگہ ان کی حفاظت کے لیے سر بکف تیار رہتے ہیں۔ مگر انھوں نے جان بوجھ کر کچھ نہ پوچھا۔ انھیں خود امیر معاویہ پر بھروسہ نہ تھا۔

گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ سب جاگ رہے ہیں۔ گود کے بچے بھی سوئے نہیں۔ مائیں بے کل ہوں تو بچوں کو قرار کہاں۔

امام کو دیکھتے ہی سب ان کے گرد جمع ہو گئے۔ بچے گود میں بیٹھ گئے نوجوان دو زانو ادب سے بیٹھے۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ جیسے چھتنا درخت کے سائے میں سب سستا رہے ہوں۔

حسینؑ ابن علیؑ نے اپنے خاندان کے بچوں کو اپنے نانا اور والد کی طرح ہمیشہ بڑی عزت اور پیار سے دیکھا۔ کبھی فکر مند ہوتے تو بچوں سے یہ بھی نہ کہتے کہ جاؤ بچو کھیلو۔ بلکہ ہر اہم موقع بزرگوں اور نوجوانوں کے ساتھ بچوں کو بھی اہم گفتگو میں شریک کرتے۔ تمام تر حالات سب کو بتاتے، حالات کی نزاکت سب تفصیل سے سمجھاتے۔

بچوں کو زندگی بری خبر سناتے ڈرتے ہیں۔ جھوٹ بول دیتے ہیں۔ اماں ہسپتال گئی ہیں۔ ابا دورے پر گئے ہیں۔ حسینؑ نے بچوں کو برابر اپنے دکھ درد میں شریک کرنا ضروری سمجھا۔ ان کی رائے کو اہمیت دیتے۔ آل رسولؐ کا بچہ بچہ جانتا تھا کہ پورا خاندان ہر لمحہ خطرے میں ہے۔ پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہے۔ اگر دشمن کا بس چل گیا تو بڑے ستم ڈھیں گے۔ طرح طرح کے دکھ سہنا پڑیں گے۔ گردنیں بھی کٹیں گی۔

دو صورتیں ہو سکتی ہیں ڈر سے وقار کھو کر بزدلوں کی موت مریں یا امام کی قیادت میں پوری شان اور وقار سے جانیں دیں۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا دنیا کے کسی کونے میں بھی جا چھپیں ان کا پیچھا نہیں چھوٹے گا۔ ہر طرح کی ذلت اور خواری سہنا پڑے گی۔ موت بچوں کے لیے ایک ایسی حقیقت تھی: جو کسی وقت بھی آ سکتی تھی۔ سوال تھا کس طرح عزت سے موت کو لبیک کہیں اور حق کی خاطر جان دیں۔ کیسی حسین شہادت ہو گی۔

امام نے تفصیل سے اپنے اور امیر کے درمیان ہونے والی بات چیت سنائی سب غور سے سنتے رہے سمجھتے رہے۔ سوال کرتے رہے۔ نہ کوئی خوف سے بے حال ہوا نہ کسی بچے نے سہم کر ماں کے پہلو میں منہ چھپایا۔ یہ سب اعلیٰ تربیت کا فیض تھا بچے اپنی عمر سے پہلے سمجھ دار ہو گئے تھے۔

لڑکے آپس میں باتیں کیا کرتے کہ کس شان سے وہ حسینؑ ابن علیؑ پر سے جانیں قربان کریں گے۔ ان پر آنچ نہ آنے دیں گے۔ قتل ہوں گے مگر سر نگوں نہ ہوں گے۔

لڑکیاں جانتی تھیں سروں سے چادریں چھینی جائیں گی۔ سر بازار رسوا

ہوں گی کہ یہی ان کے مقدر میں لکھا ہے۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ہراساں اور بدحواس ہونے کا عادی نہ تھا۔ موت ایک حقیقت ہے۔ اس سے کیا ڈرنا۔ مگر احتیاط لازمی ہے۔ انھیں اپنے جدامجد علیؓ ابن ابی طالب کی وصیت بھی معلوم تھی کہ صرف اتحاد ہی انہیں ذلت اور گمنامی کی موت سے بچا سکتا ہے۔ اپنے امام کے سائے میں ان کے احکام پر عمل کریں تو ان کا انجام بخیر ہوگا۔ وہ ان کے رشتہ دار ہی نہیں پیشوا بھی تھے بچپن سے وہ انہیں آزماتے آئے تھے۔ کبھی ان کے قول اور فعل میں اختلاف نہ پایا۔ ان کی گود میں پروان چڑھ کر وہ ان کا ہی عکس بن رہے تھے۔ ان کی نفرت و محبت، ان کا شعور اور علم بچوں میں سرایت کر رہا تھا۔

اپنے اور پرائے بچے میں کوئی تفریق نہ تھی۔ حسینؓ کے بچے اپنی ماں سے زیادہ پھوپھی سے مانوس تھے۔ قاسمؓ ابن حسنؓ چچا کو ہی باپ سمجھتے تھے۔ جان پر بچے جان چھڑکتے تھے۔ فرد سے افضل کنبہ تھا۔ تنہا آنا جانا چھوڑ دیا تھا۔ گروہوں میں نکلتے تھے۔ ایک دوسرے پر نظر رکھتے تھے۔

امیر معاویہ نے حسینؓ سے بات چیت کے بعد یہ اندازہ لگالیا کہ وہ ان کے قابو میں آنے والا نہیں۔ حسینؓ منہ توڑ جواب دے کر چلے گئے۔ مدینہ میں کام بن گیا تھا۔ مگر مکہ میں دال گلتی نظر نہ آئی۔ سب کی نظریں حسینؓ پر لگی تھیں۔ امیر نے لوگوں کے تیور دیکھ کر اس وقت یزید کی ولی عہدی پر بیعت لینے کا خیال ترک کر دیا پھر ہموار زمین دیکھ کر سوال اٹھایا جائے گا۔ مکہ والے بڑے خوددار اور بات پر اڑ جانے والے ہیں۔ ان سے منہ زبردستی نہ چلے گی اگر مکہ والے بگڑ بیٹھے تو دوسرے علاقوں کو بھی شہ مل جائے گی۔

۱۵ رجب ۶۰ھ امیر معاویہ بن ابو سفیان مسلسل بیماریوں سے تھک کر وفات پا گئے۔ اس وقت ان کا پیارا بیٹا بھی موجود نہیں تھا۔ وہ اپنی ننہیال شکار کھیلنے گیا ہوا تھا۔

مرتے وقت امیر معاویہ بڑے مضطرب تھے۔ اور زار و قطار رو رہے تھے۔ جو مظالم

لوگوں پر ڈھاتے تھے۔ ان کی یاد سے نہایت پشیمان اور لرزاں تھے۔ بار بار کہتے۔
"یہ میں نے اچھا نہیں کیا۔"

یزید کو خبر ہوئی تو حیران و پریشان بھاگا ہوا آیا مگر اتنے چاہنے والے باپ کا آخری دیدار بھی نصیب نہ ہوا۔ نہ کندھا دینے کی سعادت پائی۔ قبر پہ جا کر زار و قطار رو دیا۔ پھر لوگوں کو مخاطب کر کے کہا۔

"اے شامیو! ہم حق پر ہیں۔ خدا ہمارا مددگار ہے۔ خیر و برکت ہمیشہ ہمارے ساتھ رہے گی۔ ہم انصاف پسند ہیں مگر شر پسند نہیں فرماتے۔ اسلام کے دشمنوں کی سرکوبی میں ہم کوتاہی نہ کریں گے۔ ملک سے غداری کرنے والوں کو ہم سخت سزا دیں گے۔"

شام کے رؤسا اور حاکم اپنے خلیفہ سے یہ سن کر اس کے حضور میں جھک گئے، اور اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔

"بے شک مجھے تمہاری وفاداری پر بھروسہ ہے۔ میرے والد بزرگوار بھی تم لوگوں کی قدر و قیمت جانتے۔ میں انھیں کے نقشِ قدم پر چلوں گا۔ میرے والد ایک عظیم بشیوا اور انصاف پسند پیشوا تھے۔ ایک بہادر اور خوش بیان قائد تھے۔"

نہ جانے کون بھیڑ سے بولا: "جھوٹ، سراسر جھوٹ، تو اور تیرا باپ دونوں لعنتی!"
یہ بے ہودہ کلمات سن کر لوگ بگڑ گئے۔ بولنے والے کی بہت تلاش کی مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ خدا جانے کہاں جان بچا کر غائب ہو گیا۔

پھر یزید کے رشتہ داروں اور مصاحبین نے جی بھر کے مبارک اور دعائیں دیں۔ اس کے بعد نہایت شاندار جلسے ہوئے۔ یزید نے جی کھول کر انعام اکرام سے نوازا پھر ان میں سے قابل ترین نمائندوں کو چن کر ملک کے کونے کونے میں لوگوں سے بیعت لینے کے لیے روانہ کر دیا۔

یزید کے زیادہ تر دشمن امیر معاویہ نے ختم کر دیئے تھے۔ صرف چار اصحاب کی طرف سے خطرہ تھا۔

اوّل حسین ؓ ابن علیؓ۔

دوئم عبداللہؓ بن عمرؓ خلیفہ دوئم عمر فاروقؓ کے بیٹے۔

سوئم عبداللہ بن زبیرؓ۔

چہارم عبدالرحمٰنؓ خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکرؓ کے بیٹے۔

یزید امیر معاویہ کی طرح بڑا سیاست داں نہ تھا۔ اور نہ اتنا صابر اور حکمت عملی پر یقین رکھنے کا عادی تھا۔ وہ اپنی مخالفت کا ایک لمحہ بھی برداشت نہ کر سکتا تھا۔

اس لیے فوراً حاکم مدینہ کو حکم دیا کہ ان لوگوں سے زبردستی بیعت لی جائے۔ خاص طور پر حسینؓ ابن علیؓ کو کہ وہ ان کے سرغنہ ہیں۔ ان پر زیادہ زور ڈالا جائے اگر یہ سب سیدھی طرح نہ آئیں تو ان کے سر کاٹ کر حضور میں پیش کئے جائیں۔ اور مدد کے لیے فوج بھیجی جائے گی۔ تاکہ مکمل طور پر فتنہ فساد کی بیخ کنی کی جا سکے۔

یہ حکم ملتے ہی حاکم مدینہ نے امام حسینؓ ابن علیؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ کو بھیجا۔ یہ دونوں اس وقت مسجد میں تھے۔

"تم چلو، ہم ابھی آتے ہیں۔" یہ کہہ کر انھوں نے حاکم کے سپاہی کو ٹالا۔

"یہ رات کے وقت ہمیں کیوں طلب کیا گیا ہے؟" عبداللہ بن زبیرؓ نے پوچھا۔

"معلوم ہوتا ہے امیر معاویہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ ابھی خبر عام نہیں ہوئی ہے۔ یزید کی خواہش ہوگی کہ امیر کی موت کی خبر پھیلنے سے پہلے پیر جمائے جائیں۔ شاید بیعت لینے کے لیے بلایا ہے۔"

"پھر کیا ارادہ ہے؟"

"میں ہرگز بیعت نہیں کروں گا۔ امیر نے میرے بھائی کے ساتھ عہد کیا تھا کہ کسی خلیفہ کو اپنا جانشین خود منتخب کرنے کا کوئی حق نہیں۔ یہ اسلامی اصول کی توہین ہے۔"

"یہ زبردستی کی بیعت حرام اور گناہ ہے۔"

اس طرح باتیں کرتے دونوں اپنے اپنے گھر پہنچے۔ عبداللہ بن زبیرؓ تو چپکے سے غائب ہو گئے۔ اور حسینؓ ابن علیؓ نے گھر پہنچ کر حسب عادت اپنے پورے کنبے کو جمع کیا۔ ان کے سامنے حاکم تھر ولید کے بلاوے کا مسئلہ پیش ہوا۔

عزیز و اقارب پر افروختہ ہو گئے ۔ قاسمؑ بن حسنؑ نے تلوار کھینچ لی۔ علی اکبرؑ بھی اٹھ کھڑے ہوئے ۔ عباسؑ کی پیشانی پر بل پڑ گئے ۔

"آپ اس نابکار حاکم کے ہاں نہیں جائیں گے۔" سب نے یک زبان ہو کر کہا عونؑ اور محمدؑ کو بھی جلال آ گیا ۔ وہ بھاگے ہوئے اپنی ماں زینبؑ بنت علیؑ کے پاس پہنچے ۔

"جلدی ہمارے نیمچے عنایت کیجئے ۔ ماموں جان کو حاکم مدینہ نے طلب کیا ہے اس گستاخی پر آج ہم خون کے دریا بہا دیں گے ۔ آج بھی اگر ہم اپنے ماموں جان کے کام نہ آئے تو پھر اس زندگی کا مصرف کیا ہے ؟"

بچوں کی زبانی یہ خبر سن کر زینبؑ کا رنگ زرد ہو گیا ۔ دل میں ایک ٹیس سی اٹھی اور زار و قطار رونے لگیں ۔ آخر وہ بری گھڑی آ ہی گئی ۔ جس کا دل کو دھڑکا لگا ہوا تھا ۔ ٹھنڈی سانس بھری اور کلیجہ تھام کر رہ گئیں ۔

"حاکم مدینہ کی نیت میں فتور ہے ۔ وہ بھائی کا دشمن ہے ۔ آخر انھوں نے کون سا جرم کیا ہے ۔ کون سا گناہ سرزد ہو گیا ہے ۔ لوگو ! ذرا میرے بھائی کو تو بلا دو ۔ آخر معلوم بھی تو ہو کہ کیا بات ہے جو لوگ اتنے پریشان ہو رہے ہیں ۔ اگر وہ اکیلے گئے ۔ تو میں حشر کر دوں گی ۔ اگر ان کا بال بھی بیکا ہوا تو اپنی جان دے دوں گی ۔ اگر خطرہ ہے تو سب مسلح ہو کر جائیں ۔ مجھے بھی ساتھ لے جائیں ۔"

اتنے میں حسینؑ تشریف لے آئے ۔ ان کا منہ دیکھ کر بہن بے اختیار رونے لگیں ۔

"ارے زینبؑ روتی کیوں ہو ؟ حاکم نے بلایا ہے مگر کسی کی مجال نہیں جو ابن علیؑ پر ہاتھ اٹھائے ۔ میں قصوروار بھی نہیں ۔"

"میرا جی ڈر رہا ہے ۔"

"واللہ فکر کی کوئی بات نہیں ۔ ہم اکیلے نہیں جائیں گے ۔"

چلتے چلتے زینبؑ نے عباسؑ کو بلا کر تاکید کر دی ۔

"دیکھو بھائی کو دم بھر کے لیے اکیلے نہ چھوڑنا ۔ جب ولید سے بات کریں تو

شا ہوسے نماز ملاتے کھڑے رہنا۔ اس مردود کے قول اور فعل کا کوئی بھروسہ نہیں۔
جاؤ تمہیں اللہ کو سونپا۔"

بہن کو سمجھا بجھا کر حسینؑ تیار ہوئے۔ چالیس اصحاب اور عزیزوں کو ساتھ لیا اور حاکم مدینہ کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

ادھر مدینہ کے حاکم کا عجیب حال تھا۔ یزید کا خط دیکھ کر پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ دل میں سوچا۔ بادشاہ نرالا احمق ہے۔ میں فاطمہؑ کے لال پر کیوں کر ہاتھ اٹھاؤں گا۔ رسول اللہؐ کے نواسے کو کس دل سے شہید کروں گا؟ اور پھر سمجھ میں نہیں آتا۔ ان پر کون سا جرم عائد کروں؟ نہ انھیں خلافت کی ہوس نہ حکومت کا دعویٰ۔ طلبی تو لازمی ہے۔ اگر ذرا بھی کوتاہی ہو گئی تو خود اپنے بھائی بھتیجے تاک میں بیٹھے ہیں کہ موقع ملے تو کسی الزام میں دھر لیں۔ اور دربار میں جا کر شکایت کر دیں

حسینؑ جب حاکم کے در پر پہنچے تو ساتھیوں سے کہا۔

"تم یہیں ٹھہرو۔ میرے ساتھ چلنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

سب تو خاموش ہو گئے مگر عباسؑ بضد ہو گئے۔

"آقا! مجھے ساتھ لے چلئے۔ بہن کا یہی حکم ہے کہ میں ایک لمحہ کے لیے بھی آپ کا ساتھ نہ چھوڑوں۔ آپ اکیلے نہ گئے تو مارے فکر کے ہم لوگ بے حال ہو جائیں گے۔"

"نہیں عباسؑ! ہم تنہا جائیں گے۔ تم باہر ہوشیار رہو، کچھ نہ ہوگا۔"

ولید کمزور طبیعت کے تھے۔ ان کی نگرانی کے لیے مروان کو تعینات کر دیا گیا تھا۔ ولید کی طرف سے ذرا بھی کوتاہی ہو تو رپورٹ کریں۔ عجیب زمانہ تھا۔ ہر عہدے دار پر جاسوسوں کا پہرہ تھا۔ خلیفہ کو کسی پر پوری طرح بھروسہ نہ تھا۔

ولید نے بڑی عزت سے حسینؑ کو خوش آمدید کہا۔ اور یزید کا خط پیش کیا۔ حسینؑ نے امیر معاویہ کی وفات پر اظہار افسوس کیا۔ اور پرسہ دیا۔

"پھر آپ کی طرف سے کیا جواب ہے؟" ولید نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"کس بات کا جواب طلب کرتے ہو؟"

"خلیفہ پر بیعت کرنے کا۔ شاید آپ نے پورا خط نہیں پڑھا۔"

"میں نے پورا خط پڑھا۔ تمہیں میرا جواب معلوم ہے۔ میں جان دے سکتا ہوں جھوٹی بیعت نہیں کر سکتا۔ زمانہ کی گردش نے بے بس کر دیا ہے۔ مگر میری کچھ ذمہ داریاں بھی ہیں، کچھ فرائض ہیں۔ عوام مجھ پر بھروسہ کرتے ہیں۔ میری رائے کی قدر کرتے ہیں میں یزید کو خلافت کا اہل نہیں سمجھتا۔ جس شخص کی بدکاریوں کے چرچے ہیں۔ دنیا اس سے نالاں ہے۔ میں اسے اپنا آقا کیسے مان سکتا ہوں۔ بیعت کے لیے یقین اور بھروسے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے یزید پر بھروسہ نہیں۔"

"سوچ لیجیے۔"

"میں برسوں سے سوچ رہا ہوں۔ مجھے یہ حق حاصل ہے۔ کہ میں بیعت کروں یا نہ کروں۔ اگر اکثریت یزید کے ساتھ دل سے ہے تو ہماری بیعت کے بغیر بھی وہ حکومت کر سکتے ہیں۔ ہمیں ضمیر فروشی کی ضرورت نہیں۔"

یہ کہہ کر امام اٹھ کھڑے ہوئے۔

مروان نے ولید سے کہا۔

"تم نے شاید پورا خط نہیں پڑھا ولید! پھر سے ذرا غور سے پڑھو۔"

"یہ تم نے کیسے سمجھا؟"

"کیونکہ تم نے خط کے آخری حصے کا ذکر بھی نہیں کیا۔ جو بہت اہم ہے۔ یہ دیکھو ذرا آنکھیں کھول کر دیکھو۔ لکھا ہے۔"

"اگر حسینؓ ابن علیؓ بیعت سے انکار کریں تو ان کا سر قلم کر کے ہمارے سامنے پیش کیا جائے۔"

"ملعون! تیری یہ مجال کہ مجھے قتل کی دھمکی دے؟"

امام کی اونچی آواز سنتے ہی سبھی ساتھی جو کان لگائے دروازے پر کھڑے تھے۔ تلواریں کھینچ کر اندر آگئے۔ اس وقت ولید اور مروان صرف دو تھے۔ اور نہتے تھے۔ ادھر چالیس جوان مرد غصہ میں بھرے ہوئے تھے۔ بڑی مشکل سے حسینؓ نے انہیں ٹھنڈا کیا

"نہیں یہ شرافت اور جواں مردی کے خلاف ہے۔ بہادر نہتوں پر وار نہیں کرتے۔

"یا حسین، گستاخی معاف، ان شاہی ٹکڑوں پر پلنے والے کتوں کو ختم کر دینا ہی درست ہے۔"

مگر امام سب کو سمجھا بجھا کر لے آئے۔ ان کے جانے کے بعد مروان نے کہا۔

"تم نرے احمق ہو ولید، تم نے اتنا نادر موقع کھو دیا۔ حسینؓ بڑی آسانی سے قتل کیے جا سکتے تھے۔ وہ اور ان کے ساتھی بھی۔ بس تمہارے حکم کی دیر تھی۔ سب کا صفایا ہو جاتا۔ قصہ ختم ہو تا۔"

"میں حسینؓ کے خون سے ہاتھ نہیں رنگنا چاہتا" ولید نے جواب دیا۔

"تمہیں اپنے خلیفہ کی خوشنودی کی رتی بھر پرواہ نہیں۔"

"نہیں۔ حسینؓ کو قتل کر کے میں خوشنودی حاصل نہیں کرنا چاہتا۔ آخر ایک دن مرنا ہے۔ خدا کو منہ دکھانا ہے۔"

"کیا فضول بکتے ہو، ولید جیسے کی باتیں کرو۔ تمہاری ان حرکتوں کی خلیفہ کو خبر ہو گی تو جانتے ہو کیا ہو گا؟"

ولید ایک دم لرز کر بیٹھ گئے۔ پسینے چھوٹنے لگے۔ انھیں معلوم تھا خلیفہ کو صرف جانوروں کے شکار کا ہی شوق نہ تھا۔ انسانوں کو انتہائی کرب کی حالت میں تڑپا کر مارنے کو بھی ایک فن کی حدوں تک پہنچا دیا تھا۔

جب عیش و عشرت سے انسان تھک جاتا ہے۔ تو اسے نئے ہنگامے چاہئیں۔ نغمہ و رقص کے بجائے اذیت زدہ انسان کی چیخوں اور رقص بسمل میں لطف آنے لگتا ہے۔ ذرا منہ کا مزہ ہی بدل جاتا ہے۔

بلاوا

جب یہ خبر کوفہ پہنچی کہ امیر معاویہ کا انتقال ہو گیا اور ان کا ظالم بیٹا تخت پر بیٹھ گیا تو لوگوں کے حواس گم ہو گئے۔ لیکن یہ خبر سن کر کہ حسینؓ ابن علیؓ نے بیعت سے انکار کر دیا ہے۔ ان کے چہرے کھل اٹھے۔ ٹوٹی ہوئی آس پھر سے بندھ گئی۔

گو علیؓ ابن طالب کے پرستاروں کو کچل دیا گیا تھا۔ مگر اب بھی ایسے لوگ موجود تھے۔ جو دل پر دو امید لگائے بیٹھے تھے کہ کوئی راستہ نکل آئے گا۔ ان کے جینے کے سامان ہو جائیں گے۔

پوشیدہ طور پر سب سلمان بن صرد کے مکان پر جمع ہوئے۔ اور یہ طے کیا کہ اگر اس وقت مل کر سب کے سب حسینؓ کی پیروی کریں۔ انہیں کوفہ بلا کر اپنا خلیفہ مان لیں۔ تو ساری مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔ لہٰذا سب کی رائے سے ایک پیغام لکھا گیا۔ جس میں حسینؓ سے درخواست کی گئی۔ وہ کوفہ آ جائیں۔ لکھا تھا۔

"ہمارے سر پر کوئی امام نہیں۔ آپ تشریف لا کر ہم بدنصیبوں کو سہارا دیجئے اگر آپ آ گئے تو ہم پوری طرح اپنی وفاداری کا ثبوت دیں گے۔ آپ کے واسطے جانیں قربان کر دیں گے۔ ہم موجودہ حاکم کو نکال باہر کریں گے۔ خدارا جلدی پہنچئے ورنہ اسلام کا نام و نشان مٹ جائے گا۔ اور اس تباہی و بربادی کے ذمہ دار آپ ہوں گے۔ کیونکہ آپ رسول خداؐ کے نواسے ہیں۔ اور ان کی امت پر برا وقت آن پڑا ہے۔ آپ کے سوا ہمیں اس وقت اپنا کوئی ہمدرد نظر نہیں آتا جلد سے جلد تشریف لائیے کہ ہم آپ کے منتظر ہیں۔"

یہ خط حسینؓ ابن علیؓ کے نام بھیجا گیا۔ جس پر تمام معززاشخاص کے دستخط تھے۔

اس کے بعد خطوں کا تانتا لگ گیا۔ اور لوگ عرضیوں پر عرضیاں بھیجنے لگے۔

حسینؓ نے ان خطوط کا بغور مطالعہ کیا۔ اور سوچ میں پڑ گئے۔ یہ بات تو صاف ظاہر ہو گئی تھی کہ اب مکہ میں رہنا ممکن نہیں۔ دشمن انہیں چاروں طرف سے گھیر کر وار کرنے کے منصوبے بنا رہا ہے۔ کہیں تو جانا ہی ہوگا۔

مگر کوفہ روانہ ہونے سے پہلے کسی معتبر شخص کو بھیج کر اصلیت کا پتہ لگایا جائے یہ خط کہیں کسی قسم کی چال تو نہیں کوئی دھوکا تو نہیں!

لہٰذا انہوں نے اپنے چچازاد بھائی مسلمؓ بن عقیل کو بلایا۔

"مسلم! تم کوفہ جا کر حالات کا مطالعہ کرو۔ ہم اتنے میں تیاری کرتے ہیں۔ تمہارا جواب اگر اطمینان بخش ہوا تو ہم فوراً روانہ ہو جائیں گے۔"

مسلمؓ بن عقیل اسی دن روانہ ہو گئے۔ ان کے دو چھوٹے بچے عون اور ابراہیم کوفہ میں اپنی ننھیال گئے تھے۔ سوچا ان سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ اگر حالات موافق نہیں تو انہیں بھی واپس لے آئیں گے۔

عون اور ابراہیم آٹھ اور نو برس کی عمر کے تھے۔ اپنی ننھیال میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

سفر طویل بھی تھا۔ اور دشوار بھی۔ مسلم بن عقیل کے ساتھ دو راہنما بھی تھے۔ جو ریگستان کو بخوبی پہچانتے تھے۔ یکایک جنوب کی طرف سے مٹیالے بادل اُمڈنے شروع ہوئے۔

"مسلم بن عقیل! ہم مصیبت میں گھرنے والے ہیں۔"

ایک ساتھی نے کہا۔

"یہ بادل کیسے ہیں؟"

"یہ بادل نہیں یہ بادِ سموم و ریت کا طوفان ہے۔ جسے خمسین کہتے ہیں۔ یہ موت کا پیغامبر ہے۔"

اس سے کوئی نخلستان قریب نہیں؟ خمسین کا نام سن کر مسلمؓ بن عقیل کا

کا رنگ زرد ہو گیا۔

"مگر ہم پہنچ نہیں سکتے۔ طوفان بڑی شدت سے ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔ آدھ گھنٹے میں ہم گھر جائیں گے۔ اور ختم ہو جائیں گے۔"

"اب کیا کرنا چاہیے۔"

"کچھ نہیں صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ تیزی سے طوفان کی طرف بڑھیں اور اس کو پار کرنے کی کوشش کریں۔ ہم اس سے بھاگ کر نہیں جا سکتے۔ وہ ہمیں جا لے گا اور چشم زدن میں دبوچ لے گا۔"

"لیکن طوفان کی طرف بڑھنا بھی تو موت کے منہ میں جانا ہے۔"

"بس یہی ایک طریقہ ہے۔ اکثر لوگ بچ گئے ہیں۔ شاید ہم سے کوئی بچ جائے۔ ہم طوفان کو چیرتے ہوئے گزر جائیں۔ اس کے پار سکون ہو گا۔"

تینوں نے اونٹ تیزی سے اڑاتے ہوئے طوفان کی طرف بڑھا دیئے۔ طوفان سے ٹکرا کر وہ پاش پاش ہو گئے۔ جسم کے کپڑے تک غائب ہو گئے۔ پسی ہوئی آگ کے تھپیڑوں نے انھیں پٹخنا شروع کیا۔ اونٹ بے قابو ہو گئے۔ جہاں اونچے ٹیلے تھے۔ وہ گڑھے اور غار بن گئے۔ جہاں نشیب تھا۔ وہاں اونچے پہاڑ بن گئے۔ انھوں نے ورزنی ہاتھوں سے آنکھیں بچائیں۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ عماموں کے ڈھاٹے سے کوئی بچاؤ نہ مل سکا۔ ریت منہ، ناک، اور کانوں میں بھر گئی۔ حلق چھلنے لگے۔ پھیپھڑے پھٹنے لگے۔

جب انھیں ہوش آیا تو ریت میں آدھے دفن تھے۔ طوفان آگے نکل چکا تھا۔ چاروں طرف قبر کا سناٹا طاری تھا۔ چاند کی دھندلی روشنی میں انھوں نے دیکھا۔ ان کے چاروں طرف کچھ لوگ بیٹھے ہیں۔ کچھ کھڑے ہیں۔

یہ وہ کہاں آ گئے۔ مسلم نے بمشکل ریت سے اپنی جان چھڑائی۔ دیکھا کے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ ان کے گرد جو لوگ تھے ان کے صرف ڈھانچے رہ گئے تھے۔ ادر زنانہ عبائیں

جو لوگ دب کر مر چکے تھے۔ ریت ہٹ جانے سے وہ ظاہر ہو گئے تھے۔ وہ ویسے ہی بیٹھے، اکڑے اور لیٹے تھے۔ جیسے ریت نے انہیں برسوں دفن کیا تھا۔

ان کے دوست اور اونٹ غائب تھے۔ پانی کی چھاگلیں منوں ریت کے نیچے دب چکی تھیں۔ مسلم بن عقیل نے ادھر ادھر سے چیتھڑے سمیٹ کر ستر پوشی کی۔ بشکل گھسٹتے ہوئے ان ڈھانچوں کی جھل سے نکلے اور ایک طرف چلنا شروع کر دیا۔

وہ نہ جانے کتنی دیر گرتے پڑتے گھسٹتے آگے بڑھتے رہے۔ انہیں زندگی بڑی پیاری تھی۔ وہ حسینؓ کے قاصد تھے۔ انہیں جواب کا انتظار ہو گا۔ حسینؓ کے خیال سے ان کے مردہ جسم میں جان آ گئی۔ وہ گرتے پڑتے گھسٹتے رہے۔

ہونٹ پھٹ کر خون بہہ رہا تھا۔ زبان سوکھے چمڑے کی طرح منہ میں بے جان اور کھردری ہو رہی تھی۔ مگر انہیں موت سے لڑنا تھا۔ مگر ابھی وہ نہیں مر سکتے۔ بیہوش ہو جاتے۔ پھر رات کی اوس انہیں ہوش میں لے آتی اور آگے رینگتے رہے۔

جیسے صدیاں بیت گئیں۔ نہ جانے کتنے پہر رات آ گئی۔ راستہ بھر انہیں انسانوں اور اونٹوں کے ڈھانچے ملے۔ اُن کے ساتھی منوں ریت کے نیچے دب چکے تھے۔ پھر یہی طوفان آئے گا۔ اور وہ اسی طرح ڈھانچوں کی صورت میں ظاہر ہوں گے۔

مگر اب ان میں دم نہ رہا تھا۔ وہ ریت کے ڈھیر پر گر کر بے ہوش ہو گئے۔ یکایک انھوں نے اپنے چہرے پر بارش کی بوندیں محسوس کیں۔ بڑی مشکل سے ریت بھری آنکھیں کھولیں۔ ایک دھندلا سا سایہ ان پر جھکا ہوا تھا۔ زندہ انسان کا قرب محسوس ہوا۔ اور وہ پھر بیہوش ہو گئے۔

دوبارہ جب آنکھ کھلی تو ایک ٹیلے پر لیٹے ہوئے تھے۔ لوگ ان کے گرد بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ کسی نے ان کے ہونٹوں سے تازہ دودھ کا پیالہ لگا دیا اور حلق میں سلگتی ہوئی ریت کی لکیر مٹنے لگی۔

لیلیٰ نے تمہاری جان بچائی اجنبی! تم بڑی عمر لے کر آئے ہو۔"

ایک ضعیف مرد نے مسکرا کر کہا۔ "عمیں سے بچ کر زندہ نکل آنا ایک معجزہ ہے!"

"میں ایک اہم خدمت انجام دینے کی غرض سے کوفہ جا رہا ہوں۔ راستے میں ہم بھٹک گئے۔ میرے ساتھی طوفان میں فنا ہو گئے۔"

"حیرت ہے کہ تم بچ گئے۔"

مسلمؓ بن عقیل نے تفصیل سے اپنا حسب نسب بتایا۔ وہ لوگ بہت خوش ہوئے وہ دنیا سے کٹے ہوئے ایک چھوٹے سے قبیلے کی صورت میں رہتے تھے۔ لاعلم اور بھولے بھالے انسان۔ کہنے کو مسلمان تھے۔ مگر نماز روزہ کے اصولوں سے بھی ٹھیک طرح سے واقف نہ تھے۔ مسلم کئی دن چلنے پھرنے کے قابل نہ رہے تھے۔ آرام کرنا ضروری تھا۔ لیلیٰ نے ان کی بڑی جان فشانی سے تیمار داری کی۔ اس کی ہرنی جیسی آنکھوں کا پیغام پا کر مسلمؓ نے سر جھکا لیا۔ وہ ایک بہت ہی اہم خدمت انجام دینے جا رہے تھے۔

"میں کوفہ سے واپسی پر پھر یہاں آؤں گا۔ اگر زندگی نے وفا کی تو ہم پھر ملیں گے۔"

انھوں نے لیلیٰ سے وعدہ کیا۔

روانہ ہوتے وقت قبیلے کے لوگوں نے انھیں، اونٹ، کھانا پانی اور بھی ہر طرح کے آرام کا سامان دیا۔ دور تک انھیں خدا حافظ کہنے گئے۔ لیلیٰ نے ان کی عبا کا گریبان آنسوؤں سے بھگو دیا۔

"مجھے بھی ساتھ لے چلئے۔"

"اس وقت موقع مناسب نہیں۔ میں بہت مشغول رہوں گا۔ جب فیصلہ ہو جائے گا۔ اور امن ہو جائے گا۔ تب میں تمہارے پاس واپس آ جاؤں گا۔"

"کہتے ہیں کوفہ والے بھروسے کے انسان نہیں۔ میرا جی ڈرتا ہے۔ آپ وہاں جا رہے ہیں۔ کوئی آفت ناگہانی نہ نازل ہو جائے۔ میرے قبیلے میں آپ کو بڑے وفادار اور محبت والے دوست ملیں گے۔ بڑے سکون کی زندگی ہے یہ۔"

"ہاں تمہاری یہ چھوٹی سی جنت بڑی دل فریب ہے۔ یہاں رہ جانے کو جی چاہتا ہے۔ مگر میں حسینؑ کی خدمت پر مامور ہوں۔ انھیں نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ اس وقت بہت پریشان ہیں۔ ان پر چاروں طرف سے دباؤ پڑ رہا ہے۔" مسلمؓ نے لیلیٰ کو سمجھایا بجھایا

"کاش وہ بھی ہماری اس حسین جنت میں آجائیں۔ یہاں دنیا کے ہنگاموں سے دور بڑے آرام سے رہ سکیں گے۔ یہ جگہ کوفہ سے محفوظ ہے۔ یہاں انھیں کوئی پریشان نہ کر سکے گا۔ ہم اپنی جانیں ان کے لیے وقف کر دیں گے۔"

لیلیٰ کی محبت کی کسک دل میں لیے کوفہ روانہ ہو گئے۔

مسلمؑ بن عقیل جب کوفہ پہنچے تو لوگوں نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ وہ لوگ جو سہمے اور ڈرے بیٹھے تھے۔ دلیری سے باہر نکل آئے۔ ہمتیں بندھ گئیں۔ لوگوں نے انھیں چاروں طرف سے گھیر کر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ حسینؑ ابن علیؑ کب تشریف لا رہے ہیں۔ ہم چشم براہ ہیں۔ اٹھارہ سو آدمیوں نے اسی دن حسینؑ کے لیے مسلمؑ کے ہاتھ پر بیعت کی اور لوگ جوق در جوق قریب کے قصبوں سے آتے گئے۔ وہ بھی لوٹ آئے جو ظالم کے خوف سے بھاگ کر آس پاس کے گاؤں میں روپوش ہو گئے تھے۔

لوگوں کی دلیری اور بڑھنے لگی۔ کیونکہ حاکم شہر خاموش و بیکار ہوا بیٹھا ہوا تھا۔ مسلمؑ کی کامیابی کی خبریں مل رہی تھیں۔ مگر وہ خاموش بیٹھا تھا۔ اور تماشا دیکھ رہا تھا۔

یہ حاکم کی ایک چال تھی۔ اسے حسینؑ ابن علیؑ کے آنے کا انتظار تھا۔ اس کے بعد وہ ان کے مداحوں کی مزاج پرسی کرے گا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کون حسینؑ کے حامی ہیں۔ سرکاری جاسوس چھوٹے ہوئے تھے جو حاکم کو پل پل کی خبر دے رہے تھے لوگ چوک بازار میں کھلے بندوں حسینؑ کے نام کے نعرے لگا رہے تھے۔ جاسوس انکے نام اور پتے زائچوں میں لکھ رہے تھے۔

مسلمؑ بن عقیل نے حسینؑ کو اسی دن ایک مراسلہ لکھا۔ اور ایک تیز رفتار قاصد روانہ کیا۔

"آقا جتنی بھی جلدی ہو سکے آپ کوفہ تشریف لے آئیے۔ یہاں حالات موافق ہیں۔ لوگ آپ کی خاطر ہر طرح کی قربانی کرنے کو تیار بیٹھے ہیں۔ آپ کے نام پر مسلسل بیعت ہو رہی ہے۔ حاکم گم سم سہما ہوا بیٹھا ہے۔ اس سے پہلے کہ دمشق خبر پہنچے۔

آپ یہاں تشریف لے آیئے اور اپنے چاہنے والوں کی راہ نمائی کیجیے۔"
مسلمؓ بن عقیل کا مراسلہ پا کر حسینؓ ابن علیؓ نے فیصلہ کر لیا کہ مکہ کو خیرباد کہنے کا وقت آگیا ہے۔ دوستوں نے ہچکچاہٹ ظاہر کی۔
"آقا کوفہ والے بھروسے کے آدمی نہیں۔ دھوکا دینا ان کی پرانی عادت ہے آپ مکہ چھوڑ کر نہ جایئے۔ یہاں آپ کے دوست اور غم خوار ہیں۔ یہ آپ کا وطن ہے۔"
"آپ میرا یہاں رہنا محال ہے۔ بادشاہ کو جب میرا جواب پہنچے گا تو میرے خاتمہ کے لیے وہ جنگ کشی ہوگی۔ اگر مجھ پر حملہ ہوا تو میرے ساتھی ساتھ دیں گے۔ میں نہیں چاہتا خون خرابہ ہو۔ اور میرے ساتھ اور جانیں بھی جائیں۔ مسلمان کے ہاتھ مسلمان کا خون مکہ کی گلی کوچوں میں بہے گا۔ تو مکہ کی عزت زائل ہو جائے گی۔" امام نے جواب دیا۔
"اور جو کوفہ والوں نے دغا کی تو؟"
"تو بھی میری موت یقینی ہے۔ مگر میں مکہ سے ایک بالشت ہٹ کر مرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ اس مقدس شہر میں رسول خداؐ کے عزیزوں کا خون نہ بہے گا۔ تاریخ کے صفحات میں یہ نہ آئے کہ رسول خداؐ کے پچاس سال بعد ہی مسلمان ان کا مقام بھول گئے۔ مرنا ہی ہے تو جیسے یہاں ویسے کوفہ میں۔ پھر ممکن ہے کوفہ والے میرے ساتھ وفا کر جائیں۔ وہ لوگ اتنی شدت سے قسمیں دے کر بلا رہے ہیں۔ ان لوگوں پر اعتبار نہ کرنا مناسب نہیں۔"
حج میں صرف دو دن باقی تھے۔ مگر امام نے حج کا ارادہ ترک کر دیا۔ کیوں کہ انھیں پتہ تھا کہ ان کے قتل کے لیے بڑا زبردست جال بچھایا گیا ہے۔ تیس جلاد اپنی آستینوں میں زہر میں بجھے ہوئے خنجر چھپائے حج کے ہنگامے میں اس تاک میں لگے ہوئے تھے کہ موقع ملے اور حسینؓ کا خاتمہ کر دیں۔ قاتل بھیڑ میں غائب ہو جائے۔ اور کسی بے گناہ کو قتل کے جرم میں پھنسا دیا جائے۔ حج کے دوران کسی کو شبہ بھی نہ ہوگا۔ سب کا دھیان فرائض حج کی ادائیگی کی طرف لگا ہوگا۔
اس کے بعد ہنگامے شروع کر دیئے جائیں گے۔ اور چن چن کر آل رسولؐ

اور امن کے طرف داروں کو اسی بہانے سے ختم کر دیا جائے گا۔ اس طرح وہ کانٹا جو یزید کے پہلو میں کھٹک رہا ہے نکل جائے گا۔ پھر حسینؑ کے نام لیوا بھی سرنگوں ہو جائیں گے۔

"میں یوں گمنامی کی موت نہیں مرنا چاہتا۔ میرے قاتلوں کو دنیا دیکھے گی اور پہچانے گی۔" امام نے فرمایا اور سفر کی تیاریاں شروع کر دیں۔

لوگوں نے کہا۔

"خیر آپ جا رہے ہیں تو جائیے۔ مگر خدارا عورتوں اور بچوں کو اپنے ساتھ نہ لے جائیے۔ ہم یہاں ان کی اچھی طرح حفاظت کریں گے۔ آپ کو خیریت سے پہنچ جائیں گے۔ وہاں کے حالات درست ہو جائیں گے۔ پھر ان لوگوں کو بلا لیجیے گا۔

امام کی چہیتی بہن زینبؑ نے جو سنا تو بآواز بلند کہا۔

"اے ابن عباسؓ! کوئی جائے نہ جائے میں ضرور جاؤں گی۔ میں اپنے بھائی کے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

"میرے سب عزیز میرے ساتھ جائیں گے۔ میں اُن میں سے کو بھی اپنے سے الگ نہیں کر سکتا۔ جو بھیڑ اپنے گلے سے جدا ہو جاتی ہے وہ بھیڑیئے کے منہ کا نوالہ بن جاتی ہے۔ جو میرا انجام ہوگا۔ وہ ان کا بھی ہوگا۔ میں جانتا ہوں ہم دنیا کے کسی کونے میں چھپ جائیں۔ ہمارے دشمن ہمیں ڈھونڈ نکالیں گے جب تک رسول خداؐ کے خون کا اک قطرہ بھی زندہ رہے یزید کو اس کی طرف سے خطرہ محسوس ہوتا رہے گا۔ میرے بعد جو ہونا ہوگا۔ مرنا ہی ہے تو کیوں نہ سب ساتھ مریں۔"

زینبؑ کے شوہر عبداللہؓ بن جعفر بھی حسینؓ کے ساتھ چلنے کی تیاریاں کرنے لگے مگر انھوں نے انہیں روک دیا۔

"میری خواہش ہے کہ آپ یہیں رہیں۔"

"یا حسینؓ! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں آپ کا ساتھ نہ دوں۔"

"آپ یہاں رہ کر بھی میرا ساتھ دے سکتے ہیں۔ جو لوگ نہیں جا رہے ہیں، آپ ان کی نگرانی کیجیے۔ آپ کی جان کو کوئی خطرہ نہیں۔ بادشاہ کو آپ کی ذات سے پرخاش نہیں۔ کم از کم آپ یہاں کی خبریں تو مجھے پہنچاتے رہیں گے۔"

زینبؓ نے جو سنا ان کے شوہر نہیں جا رہے ہیں تو مضطرب ہو گئیں۔ یہ شاید انہیں بھی نہ جانے دیں۔ ان کے پاس جا کر آنسو بہانے لگیں۔ انھوں نے بڑی نرمی سے پوچھا۔

"کیوں بھئی! ہم نے کیا خطا کی جو آنسو بہائے جا رہے ہیں؟"

"میرے بھائی جا رہے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے بچپن سے ہم بہن بھائی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوئے۔ کس دل سے انہیں جانے دوں اور خود یہاں آرام سے بیٹھی رہوں مگر آپ کے حکم کے بغیر ایک قدم نہیں اٹھا سکتی۔ فرمایئے میرے لیے کیا حکم ہے؟"

عبداللہؓ بن جعفر نے انہیں نظر بھر کے دیکھا۔ زیر لب مسکرائے۔

"اے بنت علیؓ! تم جانتی ہو۔ تمہارے آنسو ہم کو بے قرار کر دیتے ہیں۔ خدا را انہیں خشک کر ڈالو۔ اپنی حالت غیر نہ کرو۔ ہم نے تمہیں اختیار دیا۔ خواہ بھائی کے ساتھ جاؤ۔ خواہ یہاں رہو۔ ہمیں کوئی شکایت نہ ہو گی۔ تم ہماری شریک زندگی ہو۔ تمہاری جدائی ہمیں شاق گزرے گی۔ مگر حسینؓ کو وہاں تمہاری محبت کی بہت ضرورت ہو گی۔ ان کے بچے تمہیں بہت پیار کرتے ہیں۔ پھر ہم خود بہت جلد تمہارے پاس آ رہے ہیں۔ اللہ نہ روؤ تمہارے آنسو ہم برداشت نہیں کر سکتے۔"

ویسے تو میں نہ جاتی مگر زمانہ بڑا خراب ہے۔ دل میں طرح طرح کے شک پیدا ہوتے ہیں۔ اللہ بھائی کو یہ سفر راس لائے۔ بھائی کے ساتھ نہ گئی تو سارے وقت دل ان ہی میں پڑا رہے گا۔ باولی ہو جاؤں گی۔ وہم کے مارے زندگی حرام ہو جائے گی۔ ساتھ رہی تو اطمینان رہے گا۔"

شوہر کی اجازت پا کر زینبؓ کی جان میں جان آئی۔ کہنے لگیں۔ عون اور محمد کو ساتھ لے جاؤں؟"

"تمہارے بغیر وہ بہلا رہنے والے ہیں۔ تم لوگ جا کے اپنی خیریت سے اطلاع دینا۔ جیسے ہی صغرا بیٹی کی طبیعت سنبھلی ہم بھی روانہ ہو جائیں گے۔ جاؤ زینبؑ تمہیں خدا کو سونپا۔"

اور زینبؑ سفر کی تیاریوں میں مشغول ہو گئیں۔

سفر

سارے شہر میں غم واندوہ کی گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ گھر گھر چرچا ہے کہ پیغمبر اسلام کے نواسے حسینؑ ابن علیؑ مدینہ چھوڑ کر رخصت ہو رہے ہیں۔ سادات کی بستی اجڑنے کی خبر ہے۔ لوگوں کے دل بیٹھے جا رہے ہیں۔ ہوا ماتم کناں ہے اور فضا سوگوار ہے۔

سب تیار ہو چکے ہیں۔ سامان بندھ چکا ہے۔ لوگ جوق در جوق ملنے اور خدا حافظ کہنے چلے آرہے ہیں۔ حسینؑ کے قدموں سے لپٹ کر رو رہے ہیں وہ انہیں اٹھا کر سینے سے لگاتے ہیں۔ تسلی دیتے ہیں۔

"زندگی نے وفا کی تو پھر ملیں گے۔"

عباسؑ کے دوست اور جان نثار انھیں حسرت سے تک رہے ہیں۔ وہ صحبتیں، وہ مشغلے سب خواب ہو جائیں گے۔ ان کے جانے سے ساری دل چسپیاں خاموش ہو جائیں گی۔

قاسمؑ کے ہم سن الگ منہ لٹکائے آنکھوں میں آنسو بھرے کھڑے ہیں۔ سب کے دل بیٹھے جا رہے ہیں۔ سناٹا ہے۔ علی اکبرؑ سا مہمان نواز پیارا دوست روز روز نہیں ملتا۔ یہ وجیہہ اور بردبار شخصیت بھلائے نہ بھولی جائے گی۔ زندگی میں ایک خلا پیدا ہو جائے گا۔ محفلیں سنسان ہو جائیں گی۔ علمی مباحثے پھیکے پڑ جائیں گے۔ زینبؑ بنت فاطمہؑ کے اوپر تلے کے بچے عونؑ اور محمدؑ اپنے ہم مکتب بچوں میں گھرے کھڑے ہیں۔ آنسو ضبط کر رہے ہیں۔ زبردستی مسکرا رہے ہیں۔

"تم لوگ جا رہے ہو۔ تمہارے بغیر مکتب میں خاک لطف آئے گا۔ بہت یاد

آؤ گے، ہمیں بھلا نہ دینا۔"

"تمہیں کیسے بھلا سکیں گے۔ ان گلی کوچوں کو کیسے بھولیں گے" دونوں بھائی تسلی دیتے ہیں۔

اتنا مشکل سفر ہے اس بلا کی گرمی پڑ رہی ہے۔ بڑی تکلیف ہو گی۔ تم لوگ نہ جاؤ۔ تمہارے بھی تو نہیں جا رہے ہیں۔

لیکن امی تو جا رہی ہیں۔ تھوڑے دن بعد بابا جان آ جائیں گے۔ ہمیں جانا چاہیئے ماموں جان جا رہے ہیں۔ امی جان جا رہی ہیں۔ ماموں جان نے ہمیں کس پیار سے پالا ہے۔ بھلا سوچو تو، وہ جائیں اور سفر کی صعوبتیں اٹھائیں۔ اور ہم یہاں مزے سے آرام کریں۔ ان کے احسانوں کا بدلہ چکانے کا یہی تو ایک موقع ہے اور اگر کبھی خدا نہ خواستہ کسی نے ان پر ٹیڑھی نظر ڈالی تو ہم سینہ سپر ہو جائیں گے۔"

لوگ چلے آ رہے ہیں۔ جب حسینؓ مکہ یا مدینہ میں ہوتے تھے۔ تو ان سے ملنے چلنے پر سرکاری پابندیاں تھیں۔ لوگ ڈرتے تھے۔ مگر اب تو وہ جا رہے تھے۔ لوگ ڈر، خوف بھول کر ان سے ملنے دوڑے چلے آ رہے ہیں۔ خدا جانے زندگی وفا کرے کہ نہ کرے۔ ان سے نہ جانے کب ملاقات ہو۔

لوگوں میں ایک غم کی لہر دوڑی ہوئی تھی۔ ہر آنکھ پر نم تھی۔ نواسۂ رسولؐ کی جانے کی خبر سن کر دوکانیں بند ہو گئیں۔ بازار سنسان پڑے تھے۔ گھر گھر چپکے چپکے ان کی جدائی کا غم ہو رہا تھا۔ یثرب اجڑ رہا تھا۔ رسولؐ کا پیارا نواسہ اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور تھا۔ کیسی بے کسی تھی۔ ہر چہار طرف ویرانی چھائی تھی۔ لوگ حسینؓ کا نام لے کر خاموش آنسو بہا رہے تھے۔

ورشا و مدینہ جا رہے ہیں۔ اب کون ہماری خبر لے گا۔ مفلس اور محتاج رو رہے تھے۔ امام سب کو تسلی دے رہے تھے۔

"اللہ تم سب کا محافظ اور نگہبان ہے۔ میری قسمت میں یہ سفر لکھا ہے۔ نصیب کے لکھے کو میں اور تم نہیں مٹا سکتے۔ اگر خدا نے چاہا ۔۔۔۔۔۔ اور زندگی رہی تو پھر ملیں گے

خواتین کے پاس عورتیں غول در غول آ رہی تھیں۔

"ہائے مولا! کیا نامراد وقت ہے۔ فاطمہؑ کا لال جا رہا ہے۔ اس کی روح کیسی بے قرار ہو گی۔ ہائے زینبؑ بی بی تم چلی گئیں۔ تو ہماری خبر کون لے گا۔ اب کون محبت سے تسلی دے گا۔ کون برے وقت آ کر ہماری ڈھارس بندھائے گا۔

شادی بیاہ ہو کوئی غمی ہو ہر موقع پر زینبؑ کے دم سے دلوں کو اطمینان تھا۔ دکھ بیماری میں جا کر تیمار داری کرتیں۔ راتوں کو جاگتیں۔ ہر طرح کا سہارا دیتیں۔ عورتیں گلے مل کر زار و قطار رو رہی تھیں۔

"ہائے بہن! بزرگوں کا بسا یا گھر اجاڑ کر جا رہی ہو۔ مدینہ میں تم لوگ نہ رہے تو خاک اڑ جائے گی۔ امام کو سمجھاؤ، کمبخت کوفہ والے ہمیشہ کے فریبی اور جعلساز ہیں۔ ایک سے ایک کمینہ اور ظالم بھرا پڑا ہے۔ سب ہی تو آل علیؑ کے جانی دشمن ہیں۔ تو ملعونوں نے شیر خدا کو شہید کیا تھا۔ اب وہیں تم لوگ جا رہے ہو۔ یہ کہاں کی دانشمندی ہوئی۔

زینبؑ ایک ایک کو گلے لگاتیں۔ پیار کرتیں اور سمجھاتیں۔

"اب تو دنیا کا گوشہ گوشہ ہم پر تنگ ہے۔ تقدیر میں یہی لکھا ہے۔ یثرب چھوٹ رہا ہے۔ اب مدینہ بلکہ ہمیں ہم لوگوں کی زندگی دو بھر ہے۔ میرے بھائی اپنی خوشی نہیں مجبور ہو کر جا رہے ہیں۔ وہ جائیں اور یہاں رہوں۔ مزے سے جان بچائے بیٹھی رہوں۔ یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا۔ اماں کی قبر چھوڑ کر جانے کا جو دل پر صدمہ ہے۔ وہ کچھ میں ہی جانتی ہوں۔ جب بہت دل ویران ہوتا تھا تو ان کے مزار پر آنسو بہا کر اپنا دکھ درد سنا کر جی ہلکا ہو جاتا تھا۔"

"مگر مسافت اس زمانے میں بہت دشوار ہے۔ دوسرے اگر کوفہ والوں نے حسب عادت پھر دغا کی تو کیا ہو گا؟"

"جو منظور خدا ہے وہی ہو گا۔ مجھے فاقہ فقیری سہنے کی عادت ہے مگر اب بھائی کی طرف دیکھتی ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اماں ہر روز خواب میں نظر آتی ہیں، حیران و

پریشان۔ آنکھوں میں آنسو بھرے۔ جیسے ان کی روح بے قرار ہو۔ رو رو کر مجھ سے کہتی ہیں۔ زینبؑ بھائی کا ساتھ نہ چھوڑنا۔ اسے میں نے تمہیں سونپا ہے۔ میری جان میرے تنہا اور اکیلے بیٹے کا خیال رکھنا۔ اگر تم اس کی ہم سفر اور غم خوار رہو گی تو اس کے دکھوں کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ ویسے خدا نگہبان ہے۔ مگر تم نے اگر حسینؑ کا ساتھ چھوڑا تو میری روح کو چین نصیب نہ ہو گا۔ تم اپنے آپ کو میری جگہ سمجھو۔"

بیبیاں بے اختیار آہ و زاری کرنے لگیں۔ زینبؑ نے کہا۔

بڑی مشکل کا سفر ہے کوئی منزل بھی نظر نہیں آتی۔ جہاں بے فکری اور سکون کی امید ہو۔ مگر اپنی ماں کی وصیت کو کیسے ٹال سکتی ہوں۔ یہی تو میرا ایک بھائی بچا ہے۔ وہ نہیں تو میرا میکہ اُجاڑ ہے۔ اب تو جو بھی سہنا پڑے گا۔ خوشی سے سہوں گی۔

اتنے میں حسینؑ آگئے! بولے۔

"زینبؑ ایک ٹک روتی رہو گی۔ بس اب ان لوگوں کو رخصت کرو۔ سامان تیار ہے۔ ہودج اور محمل تیار ہیں۔ ابھی سویرا ہے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ بچوں کا ساتھ ہے۔ جلدی سے نکل لیے تو ٹھنڈے ٹھنڈے سفر طے ہو جائے گا۔"

"میں تیار ہوں بھائی۔"

"تو پھر اصغر کا پالنا منگواؤ۔ مگر دیکھو صغرا کو ہمارے جانے کی خبر نہ ہو۔ وہ سو رہی ہے اسے جگانا مناسب نہیں۔"

"بھائی ہماری بچی سے بغیر ملے چلے جائیں گے۔ غریب کا کلیجہ پھٹ جائے گا۔ رو رو کر جان دے دے گی۔ بھائی ایسا غضب بھی نہ کیجیے گا۔ کون کہتا ہے کہ صغرا سو رہی ہے وہ تو کل رات سے بے قرار تڑپ رہی ہے۔ ہلکان ہونے سے غش آ جاتا ہے۔ پھر ذرا دیر میں چونک اٹھتی ہے۔"

"مگر اس سے رخصت لینے کے خیال سے جی بیٹھا جاتا ہے۔ ایک تو بیمار دوسرے

سے روئی تو دم ہی نکل جائے۔ اس سے ملنے سے کیا فائدہ۔ تم جاؤ اور ادھر ادھر کی باتیں کر کرکے دل بہل جائے۔

"ساری رات زانو پر سر رکھے سمجھاتے بیتی ہے۔ سب سے جدا ہونے کے خیال سے بکھری جاتی ہے۔"

اتنے میں بانو کی آواز آئی۔

"ہائے رگو! ذرا دیکھو تو میری بچی کو کیا ہو گیا؟"

زینبؑ بھاگی ہوئی گئیں۔

"گھبراؤ نہیں غش آ گیا ہے۔"

"کہیں مر تو نہیں گئی۔"

"نہیں نہیں، ابھی ہوش میں آ جائے گی۔ انھوں نے بچی کے منہ پر پانی چھڑکا۔

"آگ لگے اس نامراد سفر کو، بچی کو چھوڑتے دل مسلا جاتا ہے۔ اس بیمار کو کس پر چھوڑ کے جاؤں۔"

"اللہ والی ہے۔ ام البنین سے یہ مانوس بھی ہے۔ وہ اسی کے مارے ساتھ نہیں جا رہی ہیں۔ ورنہ اپنے بیٹوں کی وجہ سے جانے پر مصر تھیں۔ بھائی نے سمجھایا۔ اماں آپ ضعیف ہیں۔ ہمارے قدم وہاں خیریت سے جم جائیں تو پھر انشاءاللہ عباس آکر آپکو اور صغرا کو لے جائیں گے۔"

"میرا تو جی الٹ پلٹ ہوا جاتا ہے۔ مگر واقعی ساتھ لے جانا بھی مشکل ہے۔ سکینہ کو یا کبرا کو یہیں چھوڑ جاؤں، اس کا جی بہلا رہے گا۔"

"نہیں بھائی کا حکم ہے کسی بچی کو یہاں نہ چھوڑا جائے۔ صغرا کی تو مجبوری ہے اور سکینہ کی ابھی عمر کیا ہے۔ ماں کے لیے ہڑکے گی۔ اور پھر وہ اپنے چچا عباس سے ایسی ملی ہوئی ہے کہ دم بھر کو اُن کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی۔ کبریٰ کو اس لیے نہیں چھوڑ سکتے ہیں کہ میں ذرا سکون میں تو پہلی فرصت میں بڑے بھائی کی وصیت پوری کرنے کے ... قاسمؑ اور کبریٰ کا نکاح کر دیں۔

"یہ تو ٹھیک خیال ہے۔ مگر کیا کروں۔ ادھر جانے کی تیاری ہے۔ ادھر اس کا یہ حال ہو رہا ہے۔ مجھے تو اس کی جان کی فکر کھائے جاتی ہے۔"

سب صغراؔ سے رخصت ہونے کے لیے جمع ہوئے۔

"صغو! ذرا آنکھیں تو کھولو، ہم جا رہے ہیں۔ ہم سے گلے نہ ملوگی۔"

بڑی بہن کبریٰؔ نے بہن کی بخار سے جلتی پیشانی چوم لی۔

"ہمیں پیار تو کر لو۔" سکینہؔ لپٹنے لگیں۔ "دیکھو تو اصغرؔ تمہیں کیسے ٹکر ٹکر دیکھ رہے ہیں۔ بابا جان بھی آ گئے۔"

حسینؓ نے بیمار بچی کو بانہوں میں سمیٹ کر سینے سے لگا لیا۔ آس پاس کھڑے لوگ ہچکیوں سے رونے لگے۔

"جانِ پدر! دوست روانگی میں دیر ہو گئی تو آفتاب کی تمازت ناقابلِ برداشت ہو جائے گی۔"

بیمار بچی نے نظر بھر کے باپ کو دیکھا۔ کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ دم بھر کو آنکھیں بند کرکے منہ ان کے سینے میں چھپا لیا۔ پھر بڑے ضبط سے مسکرا کر کہا۔

"بابا! اللہ نگہبان۔ خیریت سے جائیں۔ ہم روئیں گے بھی نہیں۔"

"حسینؓ نے بالوں سے اشارے سے پوچھا۔ "اکبرؔ کہاں ہیں۔ کہو بہن سے رخصت ہو لیں۔"

اکبرؔ مضطرب ہو کر آگے بڑھے۔

"ذرا اسے پیار سے سمجھاؤ روئے نہیں۔ ہلکان ہو جائے گی۔"

اکبرؔ نے بہن کو پُرنم آنکھوں سے دیکھا۔ جی کڑا کرکے مسکرائے۔

"کیوں گڑیا! کیا ہم سے خفا ہو؟ بھئی ہمارا کیا قصور ہے؟"

"آپ سے خفا ہو کر ہم کیسے جیوں گی بھیا! اللہ سفر راس لائے۔ میرے ویرن۔ ہم سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔"

"وعدہ نہ لو، بس حکم دو میری لاڈلی۔ ہم سر آنکھوں پر بجا لائیں گے۔"

"میرے بغیر شادی نہ کر دیجئے گا؟"

"ہرگز نہیں کریں گے، اور کچھ؟"

"پیاری سی دلہن ڈھونڈ کے ہمیں بلوا لینا۔ پھر ہم آکر تمہیں دولھا بنائیں گے۔"

"ضرور، تمہارے بغیر ہماری مجال نہیں کہ ہم دولھا بن سکیں۔"

"ہم اپنا نیگ نہ چھوڑیں گے۔ پر جو ہم اچھے نہ ہوئے اور مر گئے تو تم اپنی دلہن کو ہماری تربت پر ضرور لانا۔ ہمارا نیگ ہماری تربت پر رکھ دینا۔ ہماری روح خوش ہو جائے گی۔"

"ایسی باتیں کرو گی تو اللہ جانتا ہے نہ ہم شادی کریں گے نہ دلہن لائیں گے۔ سمجھیں۔"

"عباس چچا کہاں ہیں۔ جانے سے پہلے ہم سے ملنے کی فرصت بھی نہ ہو گی۔ ہاں بھئی ان کی لاڈلی سکینہ تو ساتھ جا رہی ہیں۔ ہم یہاں اکیلے مرتے ہیں۔ انھیں کیا پرواہ بس سکینہ ان کی لاڈلی ہیں۔ ہم کوئی نہیں۔ وہ ہیں کدھر، اللہ ہم انہیں دور ہی سے دیکھ لیتے۔" "یہ ہم اور دست بستہ اپنی شہزادی صاحبہ سے ملنے کے انتظار میں کب سے کھڑے ہیں۔" عباس آگے بڑھے۔ صغرا نے ساختہ بازو پھیلا دیئے۔ انہوں نے بچی کو سمیٹ لیا۔

"آپ ہمیں چھوڑ کر جا رہے ہیں؟ دیکھ لیجئے گا۔ ہم مر جائیں گے۔ مگر تب تو آپ کو آنا ہی پڑے گا۔ ہمارے جنازے کو کاندھا دینے تو آ جائیں گے؟"

"تم اچھی ہو جاؤ گی بیٹا۔ ہم وعدہ کرتے ہیں۔ جیسے ہی کوفہ میں امن اور سکون ہوا ہم دنیا کے سب سے تیز ناقہ پر سوار ہو کر تمہیں لینے آ جائیں گے۔ وعدہ کرو اتنی کا حکم مانو گی دوا پابندی سے پیو گی۔ ہم آئے تو موٹی تازی ہنستی ہوئی ملو گی۔ بس تھوڑے دن کی تو بات ہے۔"

"اللہ ہمیں بھی لے چلئے چچا جان!"

"پھر وہی ضد۔ بی بی تم سے سفر کی صعوبتیں برداشت نہ ہو سکیں گی۔ راستے میں دم توڑ دو گی۔"

"آپ سے دور جینے سے تو بہتر ہے آپ کی بانہوں میں دم نکل جائے۔ ہم یہاں مر گئے

ڈوری کاندھا دینے والا بھی نہ ہوگا۔ ہم بہت روئیں گے چچا جان۔"

"بی بی! تم مرنے کے بعد کیسے روؤگی؟" سکینہ نے بھول پن سے پوچھا۔

"ہم زندہ رہیں یا مردہ روتے ہی رہیں گے۔ ہماری روح روتی رہے گی۔"

"مریں تمہارے دشمن، چلو سکینہ بیمار بہن سے نہ الجھو۔"

"ہم انھیں پیار کئے بغیر تو ہرگز نہ جائیں گے۔ سکینہ منہ پھلا کے بولیں۔

صغرا مسکرادیں۔

"ہائے ستی، تیرا ہر بات پہ لڑنا بہت یاد آئے گا۔ وعدہ کرو اکبر بھائی کی شادی میں سارا نیگ ہڑپ نہیں کرجاؤگی۔ ہمیں حصہ کرکے بلا لینا۔"

"ہم وعدہ کرتے ہیں، اگر تمہارے بغیر شادی ہوئی تو ہم اتنا روئیں گے۔ اتنا روئیں گے کہ دولھا میاں گھبرا کر دلہن چھوڑ کر تمہیں لینے بھاگیں گے!" سب ہنس پڑے۔

"او میری مینا بس بہت باتیں سنوار چکیں۔ چلو بہن کو پیار کرو اور آگے بڑھو۔ اصغر کو الوداع کہنے دو گی کہ نہیں؟" بانو نے ہنس کر کہا اور ننھے اصغر کو لئے پاس آئیں۔ ان کا ننا سا ہاتھ ماتھے سے لگا کر کہا۔

"لو بی بی اصغر تمہیں سلام کرتے ہیں۔" اصغر نے بہن کو دیکھا، ہمک کر ہاتھ پھیلا دیئے۔

صغرا نے پیارے بھیا کو اپنے بخار میں جلتے سینے سے لگا لیا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

"میرے بھیا، میرے چندا تمہاری ہزاری عمر ہو۔ امی جان انہیں ہمارے پاس چھوڑ جائیے۔ ہم ایک دم اچھے ہو جائیں گے۔ ان کا بہت خیال رکھیں گے۔ آپ کو ذرا بھی فکر کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ ہم انہیں اپنے ہاتھوں سے نہلا کر نیا کرتا پہنائیں گے۔ بکری کا تازہ تازہ دودھ پلائیں گے۔ ان کی نرگسی آنکھوں میں سرمہ لگائیں گے ان کے ننھے ننھے پیر آنکھوں سے لگائیں گے بس امی انہیں دیکھ کر ہم بھی اٹھیں گے۔ سب بخار بھاگ جائیگا

"کیسے چھوڑ جاؤں حنیدا ! ابھی خیر سے چھ مہینے کے بھی نہیں۔ کٹوری سے دودھ پینا بھی نہیں آتا۔ تم کیسے سنبھالو گی؟"

"امی امی ! ہم سنبھال لیں گے۔ سفر میں تو یہ پھول کملا جائے گا۔ جھلس جلا کی گرمی ہو گی۔ لُو چلے گی۔ ریت اُڑ کر ان کے ریشمی بالوں میں بھر جائے گی۔ یہ گلابی گال جھلس جائیں گے۔"

"ضد نہ کرو میری جان اتنا بچہ بغیر ماں کے کیسے رہے گا۔" پھوپھی نے چمکار کر سمجھایا۔

"ٹھیک کہتی ہیں پھوپھی اماں، مگر وعدہ کیجیے امی بھول لیں گی نہیں۔" دو چار مہینے میں بڑے ہو جائیں گے۔ تب ہمیں پہچانیں گے بھی نہیں۔ آپ انھیں روز بتاتی رہیے گا کہ یہاں مدینہ میں ان کی ایک بدنصیب بہن دن رات اُن کی یاد میں آنسو بہاتی ہے۔ غارت ہو یہ بیماری، مجھے اس وقت ہی گھیرنا تھا کہ یہاں پڑی اکیلی سڑتی رہوں۔ اچھا بابا جان ایک دفعہ اور ہمیں پیار کر لیجیے۔"

حسینؑ نے پھر صغرا کو سینے سے لگا کر چوما اور تسلّی دی۔

"آپ جا رہے ہیں، ہمیں یہاں چھوڑے جا رہے ہیں۔ ہمارا جسم یہاں ہوگا۔ مگر روح آپ کے قدموں میں رہے گی۔"

محمل دروازے سے لگا دیے گئے۔ قناتیں تانی گئیں۔ عباسؑ نے اونچی آواز سے پکارا:

"اپنی چھتوں پر نہ چڑھیں اور ناقہ سوار ادھر سے نہ گزریں کہ بے پردگی ہوگی۔ حرمِ رسولؐ محملوں میں سوار ہو رہی ہیں۔"

سب سے پہلے زینبؑ سوار ہوئیں۔ حسینؑ نے بازو تھام کر بہن کو سہارا دیا عباسؑ نے جھک کر جوتیاں سنبھالیں۔ علی اکبرؑ نے بڑھ کر دونوں ہتھیلیاں جوڑ کر پیر کو سہارا دیا۔ پھر بانو بھی اسی اسی طرح اصغر کو گود میں لیے شوہر اور بیٹوں کے ہاتھ آرام سے محمل میں بیٹھ گئیں۔

حسینؑ نے چاروں طرف حسرت سے نظر ڈالی۔ یہ وطن کی گلیاں، یہ کوچے جن میں بچپن گزرا، جوانی بیتی، چھوٹ رہی تھیں۔ خدا جانے ان کی دوبارہ زیارت نصیب ہو کہ نہ ہو۔ نانا کے مزار پر رات بہت دیر تک بیٹھے رہے تھے۔ کتبے سے سر ٹکا کر باتیں کی تھیں۔

"نانا جان! آپ کا حسینؑ دربدر کی خاک چھاننے کے لیے وطن چھوڑ رہا ہے۔ آپ کی پیشین گوئی سچ ہے۔ ہمیں کہیں سکون میسر نہیں۔ کاش آپ کے قدموں میں جان دینے کی سعادت نصیب ہو جاتی۔"

پھر پو پھٹنے سے پہلے ماں سے رخصت ہوئے تھے۔

"چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ ہے۔ منزل کا کوئی پتہ نہیں۔ دیار غیر میں کیا بیتے گی۔ کچھ پتہ نہیں۔ جو کچھ ہونے والا ہے۔ اس کا بھی اندازہ ہے۔ احترام خانہ کعبہ کا خیال نہ ہوتا تو آپ کے قدموں سے کبھی جدا نہ ہوتا۔ جب دل کو وحشت ہوتی تھی۔ آپ کے اور نانا جان کے مزار پر کچھ سکون مل جاتا تھا۔ زمانے کو اتنی سی مہربانی بھی گوارا نہ ہوئی۔ بے سہارا جا رہا ہوں۔ خدا مددگار رہے تو صحرا بھی وطن بن جائے گا۔ یہ وطن تو اب دیار غیر بن چکا ہے۔"

حسینؑ نے سب دوستوں کو الوداع کہا۔ آخری بار وطن کی زمین اور آسمان کو چشم پرنم دیکھا اور قافلے کو آگے بڑھنے کا حکم دے دیا۔

قافلہ

سفر بڑی خوش اسلوبی سے کٹنے لگا۔ جس راہ سے آلِ رسولؐ کا قافلہ گزرجاتا بہار کھل اٹھتی۔ دشت و صحرا لہلہانے لگتے۔ جہاں پڑاؤ ڈالتے عارضی مختصر سا قصبہ بس جاتا۔ آس پاس کے لوگ زیارت کے لیے ٹوٹ پڑتے۔ دوکانیں سج جاتیں۔ قہوہ خانے بند جاتے۔

عوام خون کا سا گھونٹ پی رہے تھے۔ بے قصور آلِ رسولؐ کی ہتک سب کو ناگوار گزر رہی تھی۔ حسینؑ وطن چھوڑنے پر مجبور کئے گئے اور لوگ بے بسی سے گم سم دیکھتے رہے۔

اور تو کچھ بس نہیں تھا۔ لوگ ڈھیروں اناج، دودھ، پنیر اور کھجوریں، مشروبات اور مویشی تحفہ میں لے کر آتے۔ حسینؑ خیمہ سے نکل کر آجاتے۔ بے مثال مجمع جمع ہوجاتا۔ غریب محتاج جو ان کی قدم بوسی کو آتے وہ سامان انہیں تقسیم کر دیا جاتا۔ لوگ التجا کرتے۔

"یا حسینؑ! ہمیں لاوارث چھوڑ کر نہ جائیے۔ ہم غریبوں کے گھر حاضر ہیں یہ لہلہاتے کھیت، ترو تازہ میوے کے درخت، جھیلیں اور آبشار سب ہی خدا کی دی ہوئی نعمتیں موجود ہیں۔ یہیں قیام کیجیے۔ ہم آپ کے لیے اپنی جانیں دینے میں بھی دریغ نہ کریں گے۔ ہماری عورتیں بنت علیؑ پر جان دیتی ہیں۔ ہم آپ کی خدمت کا موقع پاکر اپنے کو خوش بخت سمجھیں گے۔"

امام کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ ان کا شکریہ ادا کرتے۔ ان کے حق میں دعائے خیر کرتے اور سمجھاتے۔

"بھائیو، میں تمہارا ممنون ہوں۔ مگر اس وقت یہ سفر ٹالا نہیں جا سکتا۔ کوفہ والوں نے بلایا ہے۔ میں ان کی محبت سے دی ہوئی دعوت کو ٹھکرا نہیں سکتا۔ کیوں کہ میں نے ان کی دعوت قبول کر لی ہے۔ وہ لوگ میرا انتظار کر رہے ہیں۔ تم وقت کی نزاکت کو نہیں سمجھتے۔ خلیفہ مجھ سے بدظن ہیں۔ تمہارے یہاں قیام کیا تو ملک گیری کا الزام دیں گے کہ تمہاری مدد سے میں ایک نئی حکومت قائم کرنے کا خواب دیکھ رہا ہوں۔ یہاں فوجیں ٹوٹ پڑیں گی۔ تم امن پسند لوگ خانماں برباد ہو جاؤ گے۔ یہاں کا سارا امن اور بہاریں ختم ہو جائیں گی۔ میری وجہ سے تم لوگ بھی اپنا سکون کھو بیٹھو گے۔"

"کوئی پرواہ نہیں ہم خلیفہ سے ٹکر لیں گے۔"

اسی کا تو مجھے خدشہ ہے۔ تم ٹکرانے سے نہ چوکو گے۔ خلیفہ کو خون بہانے کا عذر مل جائے گا۔ اس کا الزام مجھ پر تھوپا جائے گا۔ تاریخ کے صفحات حسینؓ کو لالچی قرار دیں گے میں اور تم ان کی بے پناہ فوج کا مقابلہ کرتے ہوئے ختم ہو جائیں گے۔ یہی تو وہ چاہتے ہیں جو میں نہیں ہونے دوں گا۔ اگر زندگی نے وفا کی اور جیتے بچے تو اس محبت اور جان نثاری کا لطف اٹھانے ایک دن ضرور تمہارے پاس آ جائیں گے۔"

لوگوں کو سمجھا بجھا کر حسینؓ آگے روانہ ہو جاتے۔ اگر ان کی نیت کچھ اور ہوتی تو وہ بڑی آسانی سے ان قبیلوں کو ساتھ لے کر ایک عظیم فوج تیار کر سکتے تھے۔ اور اکثریت ان کے ساتھ آ جاتی۔ مگر وہ خون خرابے سے بچنا چاہتے تھے۔ اگر مسلمان آپس میں لڑنے لگے تو تباہ ہو جائیں گے۔

جوں جوں آگے بڑھتے گئے۔ سفر کی صعوبتیں بڑھتی گئیں۔ بنجر اور پتھریلا علاقہ شروع ہو گیا۔ بلا کی گرمی تھی کہ صبح تڑکے سے ہی آگ برسنے لگی۔ دور دور سبزے کا نام نہ تھا۔ سب کے چہرے جھلس کر سنولا گئے تھے۔ چشمے خشک پڑے تھے۔ کنویں سوکھ چکے تھے۔ کلیجے پھکے جاتے تھے۔

جہاں ذرا سا نخلستان مل جاتا۔ سب کی جان میں جان آ جاتی۔ دیوانوں کی طرح پانی پر ٹوٹ پڑتے۔ ڈھالیں، تلواریں اور زرہ بکتر انگاروں کی طرح سلگتے تھے۔ سب پانی

جب ڈبو کر ٹھنڈے کیے جاتے، گھوڑوں اور اونٹوں میں جان پڑ جاتی۔ تازہ دم ہو کر سبزے پر حسرت کی نظر ڈالتے۔ پھر جلتی ریتیلی دنیا میں قدم بڑھانے لگتے۔ بچے سفر کی طوالت سے تھک کر رونے لگتے۔ یکساں میلوں ریت دیکھ کر وحشت ہونے لگتی۔

ایک دن ایک ہرنی نظر آئی۔ دو بچے اس کے ساتھ تھے۔ قلانچیں بھرتی نکل گئی۔ بچے خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔ ذرا دیر کا شغلہ ہو گیا۔ کئی بار ہرنی اور بچے نظر آئے۔ پھر نہ جانے کدھر غائب ہو گئے۔ بچے اداس ہو گئے۔

"یہ ہرنی کوفہ میں ہماری آمد کی خبر دینے گئی ہے؟" عون نے محمد سے کہا۔

"یقیناً" اور بہت تیز گئی ہے تاکہ لوگ ہمارے آنے کی تیاریاں کریں۔"

بچے سوچ کر جی بہلانے لگے۔

مگر آگے چلے تو ہرنی پھر ملی۔ اب اس کے پاس ایک بچہ تھا۔ وہ بڑی بے چین نظر آ رہی تھی۔ قافلہ کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ سب کو بڑا تعجب ہوا کہ دوسرا بچہ کہاں گیا امام کے سامنے مقدمہ پیش ہوا۔ انھوں نے فوراً قافلے کو رکنے کا حکم دیا۔ ایک چشمے کے کنارے پڑاؤ پڑ گیا۔ ہرنی اب بھی پریشان کھڑی تھی۔

"یہ کیا قصہ ہے؟" سب نے سوچا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا دوسرا بچہ کسی انسان نے پکڑ لیا ہے۔ یہ اس کی تلاش میں ہمارے ساتھ لگی ہوئی ہے۔" حسینؑ نے کہا۔

"مگر ہم نے تو اس کے بچے کو چھوا بھی نہیں۔" بچے بولے۔

"اتنا وہ نہیں سمجھتی، بس انسان کی بو سونگھ کر ساتھ ہو گئی ہے۔ تم لوگ ٹھہرو۔ علی اکبرؑ تم ہمارے ساتھ آؤ، دیکھیں ہرنی کیا چاہتی ہے۔" مگر بچوں نے ضد کی ہم ساتھ چلیں گے۔

حسینؑ نے ہرنی کی طرف گھوڑا بڑھایا تو وہ پلٹ کر ایک سمت چلنے لگی۔ وہ رک گئے تو وہ بھی ٹھہر کر انھیں حسرت سے دیکھنے لگی۔

"یہ جانتی ہے کہ اس کا بچہ کہاں ہے۔ ہمیں اس کے پاس لے جانا چاہتی ہے چلو

دیکھیں یہ ہمیں کدھر لے جاتی ہے۔"

"سفر بہت کھوٹا ہوگا۔"

"مگر ہرنی کو یوں چھوڑتے دکھ ہوتا ہے۔ اس کی مدد کرنا ہی ہوگی۔"

"بابا جان کہیں کوئی خطرہ نہ ہو۔" علی اکبرؑ نے کہا۔ "آپ لوگ یہیں ٹھہریں۔ میں اکیلا جاتا ہوں۔"

"جانور دھوکے باز نہیں ہوتے۔ یہ صفت تو حضرت انسان میں ہی پائی جاتی ہے۔ چلو، کوئی ڈر کی بات نہیں۔ اگر کوئی جنگلی جانور کھا جاتا تو اسے صبر آ جاتا۔ ضرور اس کا بچہ کسی انسان کی قید میں ہے۔ اور ابھی زندہ ہے۔"

علم حیوانات پر بچوں سے باتیں کرتے چلے جاتے تھے کہ آبادی آ گئی۔ سامنے ایک گھر پہ ہرنی ٹھہر گئی اور دروازے پہ کھُر مارنے لگی۔

"واللہ کمال ہے۔ یہ جانور کتنے سمجھدار ہوتے ہیں۔ اس کا بچہ اسی گھر میں ہوگا۔"

امام نے بڑھ کر دستک دی۔ ایک شخص نے دروازہ کھولا۔

"آپ کون ہیں؟" اس شخص نے پوچھا۔

"میں حسینؑ ابن علیؑ ہوں، گزر رہا ہوں۔ یہ میرے بچے ہیں۔"

"یا حسینؑ! میں نے اڑتی اڑتی خبر تو سنی تھی۔ مگر یہ خبر نہ تھی کہ میری خوش قسمتی سے آپ میرے غریب خانہ تک تشریف لائیں گے۔ یا حسینؑ مجھے اپنی خدمت کی سعادت بخشئے۔ نان جو کے سوا کچھ نہیں پیش کر سکتا۔ اتفاق سے آج ایک ہرن کا بچہ ہاتھ آ گیا۔ میں اسے ذبح کرکے ابھی کباب تیار کرتا ہوں۔ میں نے سوچا تھا ذرا بڑا ہو جائے گا۔ تو کام میں لاؤں گا۔ مگر وہ عجیب جانور ہے جب سے لایا ہوں۔ کوشش کرکے ہار گیا دانہ پانی کو منہ نہیں لگاتا۔"

"تمہاری مہمان نوازی کا شکریہ۔ ہمارے ساتھ بہت بڑا قافلہ ہے۔ وہ ہم لوگوں کا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"آقا! یہ کیا ظلم ہے۔ میرے دروازے پہ حسینؑ ابن علیؑ تشریف لائیں اور میں

ان کی خدمت سے محروم رہوں۔ خالی ہاتھ رخصت کردوں؟

"ہم خالی ہاتھ نہیں جائیں گے۔ تم اگر کوئی تحفہ دینا چاہیئے ہو تو وہ ہرن کا بچہ ہمیں دے دو۔"

"ہرن کا بچہ تو کیا آقا میری جان حاضر ہے۔" وہ شخص بھاگا بھاگا آیا اور بچہ لے آیا۔ بچہ قلانچیں بھرتا ہوا اپنی ماں کے پاس دودھ پینے لگا۔ امام کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو آگئے۔ بچے تالیاں بجانے لگے۔

تمہارا کیا نام ہے عزیزم! ہمارے غمگین دل کو تم نے بڑی مسرت بخشی۔"

اس شخص سے شکریہ کے بعد رخصت ہو کر حسینؑ قافلے سے آن ملے یہ دیکھ کر بچوں کی خوشی کی حد نہ رہی کہ ہرنی بھاگی نہیں۔ قافلے کے ساتھ چلتی رہی۔ جہاں بھی قیام ہوتا۔ بچے اس سے کھیلتے۔

قافلہ چلتا رہا۔ راستے میں بہت سے لوگ ساتھ ہو لیے۔

کوفہ

ادھر کوفہ میں حاکم قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔ لوگوں پر یہ ظاہر کیا کہ وہ ان سے خائف ہے۔ لوگ اور نڈر ہو گئے اور بڑی تیزی سے مسلمؓ کے ہاتھ پر امام حسینؓ کے لیے بیعت کرنے لگے۔

مخبروں نے آ کر اطلاع دی کہ حج سے دو دن پہلے حسینؓ ابن علیؓ اچانک کوفہ کی طرف روانہ ہو گئے ہیں۔ اور اب قافلہ راستہ میں ہے۔

اب حاکم نے اپنا اصلی رنگ نکالا۔ شہر کے چپے چپے پر فوجی تعینات کر دیئے۔ ایک دم منادی کرا دی کہ جو کوئی بھی مسلمؓ بن عقیل سے کوئی واسطہ رکھے گا۔ یا انہیں پناہ دے گا۔ وہ ملک کا غدار اور دشمن گردانا جائے گا۔ اور سخت ترین سزا کا مستحق ہو گا۔ اس کے ساتھ ہی مار دھاڑ شروع ہو گئی۔ مشتبہ گھروں پر چھاپے پڑنے لگے۔ ان کے گھروں میں آگ لگا دی گئی۔ لوگوں کو سر بازار قتل کیا گیا۔ ایک دم بے خبر شہریوں پر اس شدت سے قہر ٹوٹا کہ سب سہم کر دبک گئے۔ خاص خاص لوگوں کو یا تو جیل میں ڈالا یا قتل کر کے عبرت کے لیے ان کے سر مسجد پر نصب کر دیئے گئے۔ جو بچے کھچے لوگ بچے اُن میں سے صاحب حیثیت لوگوں کو بلا کر حکم دیا کہ تم اپنے اپنے محلوں کے چال چلن کے ذمہ دار ٹھہرائے جاتے ہو۔ اگر کسی نے بھی نافرمانی کی۔ تو تم جواب دہ ہو گے۔ ان غداروں کے ساتھ تمہیں اور تمہارے بال بچوں کو بھی اذیتیں دے کر مارا جائیگا۔

یکایک ایسا طوفان پھٹ پڑا کہ لوگ اپنے لمبے چوڑے وعدے اور وفاداری کی قسمیں بھول گئے۔ اور منہ چھپا کر بیٹھ رہے۔ شہر کی ایسی ناکہ بندی کی گئی کہ کوئی خبر باہر

نہ جانے پائے۔ امام بے خبر بڑھتے چلے آئیں۔ ایک دم انھیں چاروں طرف سے گھیر کر سارے قافلے کو نیست و نابود کر دیا جائے۔

حسینؓ کا قافلہ موت کی طرف بڑھتا رہا۔ جب حاجر میں پہنچے، تو انہوں نے اہل کوفہ کے نام ایک خط لکھا اور تیز رفتار قاصد کو روانہ کر دیا۔

یہ خط حسینؓ ابن علیؓ کی طرف سے برادران اسلام کے نام ارسال کیا جاتا ہے۔ بعد سلام و حمد و ستائش باری کے واضح ہو کہ میرے بھائی مسلمؓ بن عقیل کا خط ملا۔ تمہارے اتحاد اور عزم کی پختگی کا حال معلوم کر کے مسرت ہوئی۔ خدا سے دعا ہے۔ وہ تمہارے ارادوں میں کامیابی عطا فرمائے۔ جب یہ خط تمہیں ملے تو تم لوگ اپنے سارے انتظامات مکمل کر لو۔ اور تیزی اور دانش مندی سے اپنا نظام درست کر لو۔ چند روز کے بعد تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں۔ انشاءاللہ!"

یہ خط حسینؓ نے قیس بن مسہر صیداوی کے سپرد کیا۔ اور انہیں تیز رفتاری سے جانے کی تاکید کی۔

مگر دشمن کا جال بڑی چابک دستی سے پھیلایا گیا تھا۔ قادسیہ پہنچ کر قاصد کو گرفتار کیا گیا۔ اور کوفہ بھیج دیا گیا۔ اور حاکم کوفہ ابن زیادہ نے انھیں فوراً شہید کر دیا۔

امام نے احتیاطاً عبداللہؓ بن یقطر کو جو ان کے دودھ شریک بھائی تھے مسلمؓ بن عقیل کے پاس روانہ کیا۔ مگر وہ بھی منزلِ مقصود پر پہنچنے سے پہلے شہید ہو گئے۔

حسینؓ جب وطن سے روانہ ہوئے تھے تو قافلہ مختصر تھا۔ مگر راستے میں لوگ ملتے گئے۔ وہ ساتھ ہوتے گئے۔ وہ جو اپنے ہی علاقہ میں بدحال تھے۔ ساتھ ہو لیے۔ بڑی تعداد ایسے غرض مندوں کی آ گئی۔ جو سمجھتے تھے حسینؓ کوفے دعوت پا کر جا رہے ہیں۔ وہاں ان کا شاندار استقبال ہو گا۔ شاہی مرتبہ ہو گا۔ حسینؓ شہنشاہ بن جائیں گے۔ ان کے دربار میں عیش کرنے کے مواقع ملیں گے۔

امام نے انہیں سمجھایا کہ یہ سب خیالِ خام ہیں۔ وہ شہنشاہیت کی ہوس میں نہیں جا رہے ہیں۔ انہوں نے کہا۔

اور پھر میرے ساتھ ہزاروں قسم کے خطرات ہیں۔"

لوگ سمجھے امام انھیں ٹالنے کے لیے کہہ رہے ہیں اور ساتھ لگے رہے۔ قافلہ دھیرے دھیرے بڑھتا رہا۔

ادھر ابن زیاد نے ایک اور چال چلی۔ وہ پیچھے سے شہر سے نکل گیا اور قافلے کی صورت میں اپنی فوج کو مرتب کیا۔

امام سفر میں سیاہ لباس پہنا کرتے تھے۔ مسافر گرد و خاک سے بچنے کیلئے منہ پر عمامہ کا شملہ لپیٹ لیتے تھے۔ ابن زیاد نے سیاہ لباس پہنا۔ اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ منہ پر شملے لپیٹ لیں۔ خود بھی اپنا چہرہ چھپا لیا۔ اور اس طرح ڈھونگ رچا کر شہر میں داخل ہوا کہ لوگ سمجھے حسینؓ ابن علیؓ آ گئے۔

سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔ لوگ خوشی سے ناچنے لگے۔ ابن زیاد پر سکے پھینکنے لگے۔ جو چھپے بیٹھے تھے۔ وہ دلیر ہو گئے۔

ابن زیاد خاموشی سے بڑھتا چلا آیا۔ اپنے فوجیوں کو حکم دیا غور سے دیکھو اور پہچان لو۔ حسینؓ ابن علیؓ کے طرف دار، سب کھل کھیلنے بے خوف نکل پڑے ہیں ایک ایک پر نظر رکھو۔ کوئی بچ کر نکلنے نہ پائے۔ لوگ لشتم پشتم بھاگے، امام کی سلامتی کے نعرے لگاتے ساتھ ہو لئے۔

جب یہ قافلہ مسجد کے قریب پہنچا۔ تو ابن زیاد نے چہرے پر سے شملہ ہٹایا۔ لوگ ہکا بکا ہو گئے۔ ایک دم خوف زدہ ہو کر بھاگے۔ مگر فوجیوں نے ایک ایک کا خاتمہ کر دیا۔ حسینؓ کے حامی یا قتل کر دیئے گئے۔ یا قید میں ڈال دیئے گئے۔ حسینؓ کو خوش آمدید کہنے والا کوفہ قبرستان بن گیا۔ مسلمؓ بن عقیل ہانی بن عروہ کے ہاں روپوش ہو گئے۔

ان کی تلاش میں جاسوس لگے ہوئے تھے۔ بہت لوگوں پر ستم توڑے مگر کسی نے انکا پتہ نہ بتایا۔ دراصل کسی کو پتہ ہی نہ تھا کہ مسلم کہاں چھپے ہوئے ہیں۔

تب پھر حکمت عملی کام میں آئی۔

ایک اجنبی ادھر ادھر پوچھتا پھر رہا تھا۔

"مسلمؓ بن عقیل کہاں ہیں۔ ان کے لیے پیغام لایا ہوں۔"

"کیا پیغام ہے؟" لوگوں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"ان کے لیے دس ہزار دینار ان کے ایک دوست نے بھیجے ہیں، اور کہا ہے یہ دولت سرکاری افسروں میں رشوت کے طور پر بانٹ کر راہ فرار کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے پورے دس ہزار دینار سامنے انڈیل دیئے۔ لوگوں کو اس کی ایمان داری کا یقین ہو گیا۔ صرف وعدہ نہیں نقد لایا ہے اگر بے ایمان ہوتا تو مار بیٹھتا۔

انہوں نے مسلمؓ کی تلاش شروع کر دی۔ ان کی بھلائی کے لیے انھیں تلاش کرنا ضروری تھا۔

"تم روپیہ چھوڑ جاؤ اور جا کر اس محسن کا شکریہ ادا کرو۔ اور کہو سب انتظام ہو جائے گا۔"

"میں ابھی جا کر ان کی خیریت کی اطلاع دیتا ہوں اور افسروں سے بھی خفیہ طور پر بات چیت کرتا ہوں تاکہ وہ جلد از جلد یہاں سے نکل جائیں۔" ادھر وہ شخص گیا۔ ادھر فوج نے چھاپہ مارا، دس ہزار درہم قبضے میں کئے۔ اور لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ انہیں اذیتیں دیں۔ مگر انہیں واقعی معلوم نہ تھا کہ مسلمؓ کہاں چھپے ہوئے ہیں۔

مگر کسی طرح مسلمؓ بن عقیل کو اطلاع مل گئی۔ اور جب شب میں ہانی بن عروہ کے یہاں چھاپہ پڑا تو وہ پچھلے دروازے سے جا چکے تھے۔

ان کے دونوں بچے قاضی شریح کے یہاں پناہ گزین تھے۔ انہوں نے سوچا نہ ان کا کسی کو پتہ ہے اور نہ بچوں سے کسی کو پرخاش ہو گی۔ انہیں وہیں حفاظت سے رہنے دیا جائے۔ ورنہ اپنے ساتھ ہی وہ موت کے غار کی طرف بڑھتے چلے تو غضب ہو جائے گا۔

رات کی تاریکی میں مسلمؓ بن عقیل چھپتے چھپاتے گلی کوچوں کی خاک چھانتے رہے۔

تھک کر چور ہو گئے۔ ابھی تک وہ محفوظ تھے۔ نہ انہیں کسی نے پہچانا تھا نہ توجہ دی تھی۔ انھوں نے سنا، کئی جگہ لوگ ان کی باتیں کر رہے تھے۔ انھیں معلوم ہو گیا کہ ان کی جان انتہائی خطرے میں ہے۔

مگر ان سے زیادہ وہ امام اور ان کے قافلے کی جانیں خطرے میں تھیں۔ مسلم کو اپنی جان کی پرواہ نہ تھی۔ وہ اسی فکر میں تھے کہ کسی طرح کوفہ سے نکل کر امام کے قافلے تک پہنچ جائیں اور انھیں خطرے سے آگاہ کر دیں۔ ورنہ وہ بے خطر موت کے منہ میں چلے آئیں گے۔

تاریکی میں انہیں اور مکانوں سے الگ ایک مکان نظر آیا۔ حالت اتنی خستہ ہو رہی تھی کہ قدم اٹھانا دشوار تھا۔ بھوک اور پیاس کی تکلیف ناقابل برداشت تھی۔ مسلسل اڑتالیس گھنٹے سے حلق میں پانی کی بوند بھی نہیں گئی تھی۔ کسی سے مدد مانگنے کی ہمت نہ تھی۔ ہر طرف موت منہ پھاڑے کھڑی تھی۔ یہ مکان چونکہ شہر سے دور تھا۔ شاید وہاں کے رہنے والے انہیں نہ پہچانیں، حالات سے بھی لاعلم ہوں اور انھیں چند گھنٹوں کے آرام کا سہارا مل جائے۔

ڈرتے ڈرتے دستک دی۔ ایک ضعیف عورت باہر نکلی اور اپنی کمزور آنکھوں سے دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔

"کون ہو؟"

"ایک پریشان حال مسافر۔ ایک رات آرام کے لیے اگر قیام کی اجازت مل جائے تو بڑی مہربانی ہوگی۔ صبح ہونے سے پہلے روانہ ہو جاؤں گا۔"

"بہت تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہو۔ کہاں سے آئے ہو۔ کہاں جانے کا ارادہ ہے؟ میں آنکھوں سے معذور ہوں، ذرا ادھر روشنی میں آؤ۔ تمہاری صورت تو دیکھوں۔"

"مسلم" خاموشی سے آگے بڑھے۔ بڑھیا نے سر سے پاؤں تک دیکھا۔

"کسی اچھے خاندان کے چشم و چراغ معلوم ہوتے ہو نوجوان۔ تمہیں دیکھ کر آپ

آپ دل کھنچا جاتا ہے۔ یاد نہیں پڑتا۔ تمہیں کہاں دیکھا دیکھا ہے۔ میں بھی سٹھیا گئی ہوں تم تو اس وقت شاید پیدا بھی نہ ہوئے ہوں گے۔ جب میں ایسی گلی گزری تھی۔ شیرِ خدا حضرت علیؑ ابنِ ابی طالب ادھر سے گزرے تھے۔ میں نے بھی ایک نظر دیکھا تھا۔ تمہیں دیکھ کر نہ جانے کیوں وہ یاد آ گئے۔

"میں ان کے خاندان سے ہوں۔ وہ میرے چچا تھے۔" مسلمؑ بن عقیل نے سر جھکا کر کہا۔ ضعیفہ کا اعتقاد دیکھ کر ان کے دل سے خوف مٹ گیا۔ "حسینؑ ابنِ علیؑ میرے چچا زاد بھائی ہیں۔" "یا خدا! تم مسلم بن عقیل ہو؟ میرا نام طوعہ ہے۔ آلِ رسولؐ کی پرستار ہوں۔ میری خوش نصیبی ہے کہ تم نے میرے غریب خانے کو عزت بخشی۔ خدا غارت کرے، ملعون تمہاری جان کے دشمن ہو گئے ہیں۔ میری بوڑھی زندگی کی کیا حقیقت ہے؟ مگر یہاں تمہارا کوئی بال بیکا نہ کر پائے گا۔"

"میں یہاں حسینؑ ابنِ علیؑ کا وکیل بن کر آیا تھا۔ حالات بگڑ گئے۔ اب سپاہی میری تلاش میں لگے ہوئے ہیں۔"

"لعنت ہو ان سپاہیوں کی صورت پر، اندر آ جاؤ۔"

اس نے انہیں ہاتھ منہ دھونے کو پانی دیا۔ پھر طشت میں کھانا لگا کر سامنے رکھ دیا آرام دہ بستر بچھا دیا۔

جب تک جی چاہے رہو۔ یہاں کوئی نہیں آتا۔ میرا ایک پوتا ہے۔ اسے بھی بڑھیا کے پاس آنے کی فرصت نہیں۔"

بس چند گھنٹے آرام کر کے روانہ ہو جاؤں گا۔" مسلم نے ہاتھ منہ دھو کر پانی پیا اور کچھ حلق سے اتارا۔ دو نوالے کر خدا کا شکر ادا کیا اور لیٹ گئے۔

قسمت کی خوبی دیکھئے جس پوتے کو کبھی بڑھیا کے پاس آنے کی فرصت نہ ملتی تھی آن نکلا بڑھیا کو حجرے سے نکلتے دیکھ کر پوچھا۔

"کھانا کس کے لیے لے گئی تھیں؟"

ایک تھکا ہارا مسافر ہے۔ غریب نے دو نوالے کھائے سے، بیٹا یہ کھانا تو کھا لے۔"

"میں یہ گھاس پھوس چھوتا بھی نہیں، میں مسلم بکرے کے کباب اڑا رہا ہوں۔ کون ہے تمہارا مہمان؟ کوئی چوڑا اچکا نہ ہو۔"

بہت حلیم انسان ہے بچے، مگر بے چارا آفت میں پڑ گیا ہے۔ رات کے رات رہیگا صبح چلا جائے گا۔"

"پھر وہی بک بک، میں پوچھتا ہوں، کون ہے، کیا نام ہے؟"

"آہستہ بول بیٹا! تھکا ماندا سو رہا ہے۔ آنکھ کھل جائے گی!"

"تم نہیں بتاتیں تو میں خود جا کے پوچھے لیتا ہوں۔"

"نہیں نہیں، بتاتی ہوں۔ بیٹا ہمارے نصیب جاگ اٹھے۔ ہمارے ہاں آج پیغمبر خدا کے خاندان کا ایک فرد مہمان ہے۔"

کون؟"

"مسلمؑ بن عقیل، بیٹا کسی کو بتانا نہیں۔ تجھے میری قسم۔"

"میں کیوں بتاؤں گا؟ میری ان سے کوئی دشمنی ہے۔" پوتے نے مکاری سے کہا۔

جب بڑھیا سو گئی تو وہ چپکے سے اٹھا۔ اور اٹھ کر شہر کی طرف بھاگا۔ اس نے جا کر ساری تفصیل بتائی۔ ابن زیاد ڈھائی ہزار سپاہیوں کو لے کر مسلمؑ کو گرفتار کرنے روانہ ہو گیا۔ صبح تڑکے جب ضعیفہ وضو کا پانی لے کر حجرے میں پہنچی تو دیکھا مسلمؑ بن عقیل پریشان پسینہ میں شرابور بیٹھے ہیں۔

"کیا بات ہے صاحبزادے! کیا نیند نہیں آئی؟"

"نہیں اماں بڑی اچھی نیند آئی مگر صبح ہوتے ہوتے عجیب خواب دیکھا کہ میرے چچا علیؑ بن ابی طالب کھڑے ہیں اور مجھ سے کہہ رہے ہیں: اٹھو مسلم! اتنی نیند اچھی نہیں۔ میری آنکھ کھل گئی، مجھے دیر ہو گئی مجھے اپنی جان کی ذرہ برابر پرواہ نہیں۔ دکھ یہ ہے حسینؑ ابن علیؑ بے خبر چلے آرہے ہیں۔ انھیں اطلاع دینا ضروری ہے۔"

وضو کرکے نماز پڑھی۔ ابھی بیٹھے تھے کہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آنے لگی۔ بڑھیا نے دیکھا پوتا غائب ہے۔ سب معاملہ سمجھ گئی۔ اور سر پیٹ لیا۔

"اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔" مسلمؑ نے تسلی دی۔

"میری اولاد نے آلِ رسولؐ کے ساتھ دغا کی۔ یا خدا میرے بڑھاپے کو کالک لگ گئی۔ میری ساری عمر کی عبادت خاک میں مل گئی۔"

"نہیں! بیٹے کا گناہ کا جواب تم سے طلب نہیں کیا جائے گا۔"

ڈھائی ہزار کا لشکر ایک آدمی کی گرفتاری کے لیے صرف دکھاوے کے لیے تھا کہ کوئی حمایتی سر اٹھانے کی ہمت نہ کرے۔

مسلمؑ بن عقیل باہر شمشیر زن تھے۔ مصلے سے اٹھ کر تیار ہو گئے۔

"میں تنہا ہوں، حسینؑ کا ایلچی ہوں۔ میرا قتل تم پر کسی طرح بھی جائز نہیں۔"

"تو پھر تلوار ڈال دو۔"

"تلوار میرے خاندان میں آج تک کسی نے کسی کے سامنے نہیں ڈالی۔ یہ میری زندگی ہے۔ میں اس کی تحقیر نہ کروں گا۔ تم لوگ واپس لوٹ جاؤ اور مجھے جانے دو۔"

"تو پھر تیار ہو جاؤ۔ موت کے لیے۔" ادھر سے تیروں کی بارش شروع ہو گئی مگر مسلمؑ حجرے میں محفوظ تھے۔

"مکان کو آگ لگا دو!" سردار نے حکم دیا۔

"نہیں، یہ مکان اس ضعیفہ کا ہے جو میری محسنہ ہے۔" یہ کہہ کر مسلمؑ تلوار سنبھال کر نکل پڑے۔

لوگوں کو اتنے سخت مقابلہ کی امید نہ تھی۔ اچانک مسلمؑ ان پر بجلی کی طرح گرے اور صفیں کاٹتے چلے گئے۔ مگر کہاں ایک کہاں پوری فوج، مسلمؑ زخموں سے چور ہو کر گر پڑے۔ اس سے قبل کہ سپاہی ان پر وار کرتے، پچیس جوان ان پر ٹوٹ پڑے۔ ان کا نقاب پوش سردار سیاہ لباس میں طوفان کی طرح صفوں کو تتر بتر کرنے لگا۔ مگر جلد ہی سب کو ختم کر دیا گیا۔ سردار جب گھوڑے سے گرا۔ تو اس کا خود الگ ہو گیا۔ اور لمبے لمبے بال بکھر گئے۔

"لیلیٰ!" مسلمؑ نے لپک کے اسے سنبھالا۔ "یہ کیا کیا تم نے؟"

"میں خوش نصیب ہوں کہ آپ کی آغوش میں دم نکلے گا۔ یہی میری آخری خواہش تھی۔"
لیکہ نے ان کی بانہوں میں دم توڑ دیا۔ وہ سر جھکائے بیٹھے رہے۔ سپاہی بھی دم بخود سے رہ گئے۔ پھر مسلمؑ نے تلوار سنبھالی اور لیکہ کے قاتلوں پر ٹوٹ پڑے۔ لمحوں میں انہیں ختم کر دیا گیا۔ پھر ان کی لاش کو رسی سے باندھ کر سارے شہر میں گھسیٹا گیا۔ تاکہ دیکھنے والوں کو عبرت ہو۔ جسم کی ہر طرح بے حرمتی کی گئی اور قلعہ کی فصیل سے نیچے دلدل میں پھینک دی گئی۔ جہاں ہانی بن عروہ کی لاش تھوڑی دیر پہلے پھینکی گئی تھی۔

طوعہ کے مکان کو آگ لگا دی گئی۔ اس کا پوتا اسی دم انعام اکرام لے کر پہنچا اور اپنی شان دکھانے لگا۔ مگر سپاہیوں نے لوٹ مار شروع کر دی تھی۔ اسے مار پیٹ کر انعام اکرام چھین لیا۔ اور جلتے مکان میں دھکیل دیا۔

دو پھول

جب مسلمؑ بن عقیل کے بچوں نے سنا کہ ان کے باپ شہید کر دیئے گئے ہیں اور انکی لاش کی بے حرمتی کی گئی تو دونوں غم اور خوف سے بے چین ہو کر ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ "اب کیا کریں؟" ابراہیم نے بڑے بھائی عونؑ سے پوچھا۔

"سب سے پہلے تو ہمیں قاضی صریح کا گھر چھوڑ دینا چاہیئے۔ کیونکہ اب سپاہی ہماری تلاش میں ہوں گے۔ ہمیں یہاں پایا تو گھر والوں کی مصیبت آ جائے گی۔ مہمان نوازی کی ہمیں یہ سزا نہیں دینا چاہیئے۔"

دونوں قاضی کے پاس گئے۔ وہ بے چارے خوف سے تھر تھر کانپ رہے تھے اتنی ہمت نہ تھی کہ معصوم بچوں کو گھر سے نکال دیں۔ دوسری صورت میں جانتے تھے کیا انجام ہوگا۔ بچے جو پہنچے تو شرم سے گردن جھکا لی۔

"آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ آپ پر کوئی آنچ نہ آئے گی۔" عونؑ نے کہا۔

"میں بہت شرمندہ ہوں بچو! اپنی طرف سے نہیں۔ اپنے معصوم بچوں کی جان کا خوف ہے۔ تمہیں بھی نہ بچا سکوں گا۔ یہ درندے نہ جانے تم لوگوں کی کیا گت بنائیں گے۔ تم تیار ہو جاؤ۔ میں تمہیں اپنے بیٹے کے ساتھ چپکے سے نکلوا دوں گا۔ وہ تمہیں حفاظت سے لے جائے گا۔ سنا ہے کئی قافلے جا رہے ہیں۔ وہ تمہیں مدینہ تمہارے چچا کے پاس پہنچا دیں گے۔"

یہ کہہ کر اس نے فوراً اپنے بڑے بیٹے کو بلایا۔ اور اس سے کہا۔ بچوں کو قافلہ سالار کے سپرد کر دینا۔ کہنا بخیریت تمام پہنچ گئے تو بہت انعام و اکرام ملے گا۔ آج کل دنیا بس پیسے؛

سنو دیکھتی ہے۔ ساری عزت ختم ہو چکی ہے۔"

انہوں نے رو رو کر بچوں کو دعائیں دیں اور رخصت کیا۔

قاضی کا بیٹا عون اور ابراہیم کرے کر چھپتا چھپاتا مسافر خانے پہنچا تو قافلہ روانہ ہو چکا تھا۔ صرف گرد و غبار نظر آ رہا تھا۔

"دیکھو بس اس غبار کی طرف بڑھتے چلے جاؤ تیز قدم اٹھاؤ گے تو جلدی ہی پہنچ جاؤ گے۔ اگر کسی نے مجھے تمہارے ساتھ دیکھ لیا۔ تو پہچانے جاؤ گے اور سب کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ تمہاری جانیں بھی جائیں گی۔ اور میرا خاندان برباد ہو جائے گا۔

"بس بھائی! آپ کی اتنی عنایت بہت ہے۔ آپ فکر نہ کیجئے۔ ہم بخیریت قافلے تک پہنچ جائیں گے۔" یہ کہہ کر دونوں رخصت ہوئے اور تیزی سے قافلے کی طرف بھاگنے لگے۔

بچوں کی عمر نو اور دس برس تھی۔ بھاگتے بھاگتے دم پھول گئے۔ مگر غبار کو نہ پکڑ پائے قافلہ نہ جانے کب کا گزر چکا تھا۔ صرف غبار حلق تھا۔ ایسے غبار تو ہوا میں بہت سے نظر آ رہے تھے۔ شاید کوئی قافلہ نہیں گزرا تھا۔ آندھی چلی تھی جس کی وجہ سے ہر چہار طرف غبار ہی غبار تھا۔

بچے تھک کر سستانے لگے۔ پو پھٹتے ہی لوگ جاگ جائیں گے۔ ڈر کے مارے دونوں جھاڑیوں میں چھپ گئے۔ دور سے اذان کی آواز آ رہی تھی۔ وہیں ریت پر تیمم کیا اور خدا کی بارگاہ میں سر بسجود ہو گئے۔

لوگ آنے جانے لگے تھے۔ چند لوگ ان کے بالکل قریب سے گزرے۔ ان لوگوں کی باتوں سے پتہ چلا کہ ان کی تلاش شروع ہو گئی ہے۔ قاضی شریح کو جیل میں ٹھونس دیا گیا۔ ان کا بیٹا افسروں کو رشوت دیتا بھاگا پھر رہا ہے۔

بچوں کے سروں پر بڑے بڑے انعام لگائے گئے تھے۔ لوگ سارے کام چھوڑ کر ان کی تلاش میں گھوم پھر رہے تھے۔

وہیں جھاڑیوں کی آڑ میں دونوں کو نیند آ گئی۔ ایک دم آنکھ کھلی تو چاروں طرف سپاہیوں کے نرغے میں۔

انھیں ابن زیاد کے پاس لے گئے۔ وہ اس وقت کسی اہم مشورے میں مشغول تھا۔ انہیں جیل میں ڈال دیا گیا۔

اس جیل کا محافظ بڑا دین دار آدمی تھا۔ پڑھا بھی بہت تھا۔ اسے موجودہ سیاست کی چالوں کا پتہ تھا کوئی ہمدردی۔ اس جیل میں عموماً چور ڈاکو اور قاتل ہی رکھے جاتے تھے سوچا۔ ان بچوں نے شاید کوئی شرارت کی ہوگی۔ کسی نے مذاق میں دھمکانے کو جیل میں بند کروایا ہے۔ گھنٹہ دو گھنٹہ میں چھوڑ دیے جائیں گے۔

"کیوں بچو! اب تو شرارت نہیں کرو گے" اس نے یوں ہی بچوں سے کہا۔

"ہم نے کوئی شرارت نہیں کی۔ بچوں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"ہمیں بے وقوف بناتے ہو۔ بتاؤ کیا بد معاشی کی تھی۔ کیا حاکم کے باغ سے پھل چرائے تھے۔ یا اس کے پرندوں کو پریشان کیا؟ ضرور تم نے اس کے حوض کے شفاف پانی میں ریت جھونکی ہوگی یا اس کے اصطبل میں اینٹ پھینک کر گھوڑوں کو بھڑکایا ہوگا۔"

"نہیں ہم نے کچھ نہیں کیا۔"

"ہنہ، کچھ نہیں کیا تو کیا سپاہیوں کا دماغ خراب ہے۔ جو اتنے اتنے سے بچوں کو فضول پکڑے پھریں۔"

"شاید آپ نہیں جانتے کہ ہم کون ہیں۔"

"کون ہو؟ تم ہی بتاؤ۔"

"ہم مسلمؑ بن عقیل کے بیٹے ہیں۔"

"مسلمؑ بن عقیل ان پر خدا کی رحمت ہو۔ امام حسینؑ ابن علیؑ کے وکیل ہیں۔ میں یہاں جیل میں خود ایک قیدی بن گیا ہوں۔ کچھ خبر نہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ امام کب تشریف لا رہے ہیں۔ ان کی قدم بوسی کے لیے تو میں ضرور جاؤں گا۔"

"بڑے میاں نہ جانے کن خوابوں کی دنیا میں رہتے ہیں۔" عون نے ابراہیم سے کہا۔

"بے چارے کو کچھ پتہ نہیں۔"

تب بچوں نے ساری تفصیل سنائی۔" بوڑھے آدمی کو دھوکا نہیں دینا چاہیے اسلیے

جھوٹ بول کر رہائی حاصل کرنا ٹھیک نہیں۔"

بڑے میاں سن کر رونے لگے۔

"یا خدا! دنیا کس رخ جا رہی ہے؟ ابھی پیغمبر اسلام کو رحلت کئے پچاس برس ہوئے ہیں کہ لوگ ان کی تعلیم مسخ کرنے لگے۔"

"ہماری وجہ سے تم پر آفت نازل ہو جائے گی۔

"اب اس سے بڑی آفت کیا نازل ہوگی۔ میری آنکھوں کے سامنے قیامت برپا ہے۔ بچو! نہ میرا کوئی آگے ہے نہ پیچھے بس جیل خانے کے دروازے پر بیٹھا موت کا انتظار کر رہا ہوں۔ موت اور آگئی تو رہائی پا جاؤں گا۔ تم چلے جاؤ۔ اور خدا کرے تم آرام سے امام کے حضور میں پہنچ جاؤ۔ ان سے میرا سلام عرض کرنا اور کہنا کہ مرنے سے پہلے ان کے دیدار کی آرزو ہے۔ خدا قبول کرے۔"

بچے وہاں سے چھوٹ کر پھر ادھر اُدھر بھٹکنے لگے۔ موقع مل جاتا تو دو گھونٹ پانی حلق سے اتار لیتے۔ کہیں کچی پکی کھجوریں مل جاتیں تو کھا لیتے۔ جیل خانے جاتے وقت کسی نے پیروں سے جوتے بھی چھین لئے تھے۔ گرم ریت اور پتھروں پر چلتے پھرتے پیروں میں آبلے پڑنے لگے۔ خاردار جھاڑیوں میں پناہ لینے سے کپڑے بھی تار تار ہو گئے۔

"بھائی! بھوک لگ رہی ہے۔" عون نے بڑے بھائی سے کہا۔

"ٹھہرو! ابھی کھجور کا پیڑ ملے گا۔ تو جی بھر کے کھا لینا۔"

"کھجوریں پکی نہیں، بہت بدمزہ ہیں۔"

"تھوڑے دنوں میں پک کر مزے دار ہو جائیں گی۔"

"بھائی"

"ہاں"

"اماں یاد آرہی ہے۔"

بڑا بھائی گلے میں اٹکے آنسو پی کر بات ٹال گیا۔ ایک سال کا تو فرق تھا دونوں بھائیوں میں۔

"ابا بھی یاد آ رہے ہیں؟"

بڑے نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور کچھ نہ بولا۔

"کیا ہم سے خفا ہو بھائی؟"

"نہیں تو۔"

"پھر بولتے کیوں نہیں۔" ابراہیم نے آنسو چھپانے چاہے مگر ناکام رہے دونوں لپٹ کر رونے لگے۔ چھوٹے کی چیخیں نکل گئیں۔ تو بڑے نے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

پھر دونوں لذیذ کھانوں کا ذکر کرنے لگے۔

"قاضی صاحب کے ہاں کباب بہت خستہ بنتے تھے۔"

"مگر اماں جو خرما اور دودھ کھلاتی تھیں وہ بھی اچھا ہوتا ہے۔"

"بادام بھی تو لذیذ ہوتے ہیں۔"

"سفید روٹی اور پنیر بھی اچھا ہوتا ہے۔"

"شہد کے ساتھ۔"

"چلو سے پانی پیتے جاؤ، پیاس ہی نہیں بجھتی، کٹورے میں پانی کتنا میٹھا ہوتا ہے۔"

مزے مزے کی باتیں کرتے تو ہنسی نکل جاتی۔ دونوں سہم جاتے؛ بچے تو بڑے سخت جان ہوتے ہیں۔ کیسے ہی لاڈ پیار سے پلے ہوں۔ جب مصیبت آن پڑتی ہے تو بڑوں سے زیادہ ضبط کا اظہار کرتے ہیں۔

تھوڑی دور چلے تو ایک مکان نظر آیا اس میں روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ ساتھ میں سرسبز باغ بھی تھا۔ دونوں چپکے چپکے جھانکنے لگے۔ رنگوں کے ہنسنے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یہ اس فکر میں تھے کہ کس طرح تو داخل ہوں۔

جب اندھیرا ہو گیا تو دونوں چپکے سے دیوار پر چڑھ کر اندر کود گئے اور ایک پیڑ پر چڑھ کر بیٹھ گئے۔ وہاں سے کچھ حصہ اندر کے صحن کا بھی نظر آ رہا تھا۔ رنگ فرش پر بیٹھے تھے۔ سامنے ستم بجرے اور مرغ رکھے تھے۔ شراب کا دور چل رہا تھا۔

بیٹھے بیٹھے بچے شل ہو گئے۔ چھوٹے کی آنکھ لگ گئی۔ بڑے بھائی نے اس کا سر اپنے

شانے سے لگا لیا۔ اپنی آنکھیں بھی بند ہوئی جا رہی تھیں۔ مگر چھوٹا بھائی گرنہ جائے اس خیال سے آنکھیں مل مل کر کھول رہے تھے۔

ایک دم ابراہیم نے چونک کر رونا شروع کر دیا۔ عون نے جھٹ اپنے دامن سے اس کا منہ گھونٹا۔ مگر آواز نکل ہی گئی۔

ایک رانڈ سی کچھ پھل لیے جا رہی تھی، ٹھٹک کر سننے لگی۔ کسی کی سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔ پھلوں کا طشت احمد نبیچار کر رکھ دیا تو دبے پاؤں باغ میں سسکیاں لینے والے کو تلاش کرنے لگی۔

اچانک اس کی نظر جو پیڑ پر گئی تو حیرت زدہ ہو گئی۔ نیچے آ کر آہستہ سے بولی۔

"کون ہو تم لوگ؟"

دونوں خاموش آنکھیں پھاڑے اسے تکنے لگے۔

"ڈرو نہیں، نیچے اتر آؤ، پیڑ سے گر پڑے تو ہاتھ پیر ٹوٹ جائیں گے؟"

دونوں نیچے اترے تو ان کی درگت دیکھ کر رانڈ ہی کا دل دکھ گیا۔ انھیں دبے پیر اپنے حجرے میں لے گئی۔

"تم لوگ یہاں چپ چاپ بیٹھو، میں کام ختم کر کے ابھی آتی ہوں۔"

وہ باہر سے دروازے میں کنڈی چڑھا کر چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ نیک عورت بہت سا کھانے کا سامان لے کر آ گئی!

"لو بچو! جی بھر کے کھاؤ بیٹا۔"

وہ انہیں اپنے ہاتھ سے کھلانے لگی۔ سوچنے لگی کس کے بچے ہیں، کیسے لاپروا اور بے رحم ماں باپ ہیں۔ ایسے پیارے بچوں کی یہ درگت بنا رکھی ہے کہ فقیروں سے بدتر حالت ہو رہی ہے۔ مگر کپڑے تو تازہ پھٹے ہوئے ہیں۔ پیر بھی زمین پر چلنے کے عادی نہیں، زخم پڑ گئے ہیں۔

بچے کھا رہے تھے اور سوچ رہے تھے۔

"بڑی نیک بی بی ہے۔ اگر یہ حاکم کو اطلاع دے کر ہمیں گرفتار بھی کرا دے تو ہمیں غم نہ ہو گا۔

وہ عورت دل ہی دل میں سوچ رہی تھی۔

"اے خدا یہ کیسی ناانصافی ہے۔ انھیں بچے دیتا ہے جو ان کی قدر نہیں کرتے میں بچوں کے لیے ترستی ہوں، یہ کیا گردش ہے۔"

اس نے طے کر لیا کہ اللہ نے اسے یہ بچے دیئے ہیں۔ بس اب انھیں پال کر وہ اپنی پیاسی ماستا کو سیراب کرے گی۔

اس نے ان کے پیر دھلا کر مرہم لگایا۔ بالوں میں کنگھی کی۔ دونوں کو بستر پر سلا کر باہر سے کنڈی لگا دی۔

رات کو اس کا مرد بھی آ گیا۔ بڑا گھبرایا ہوا تھا۔

"کیا بات ہے؟" لونڈی نے پوچھا۔

"جیل خانے سے دو بچے بھاگ نکلے۔ سپاہی تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ بہت بڑا انعام مقرر ہوا۔ جو ان بچوں کو لائے گا۔ اس کی قسمت کا ستارہ جگمگا اٹھے گا۔ میں بھی تلاش کر کے تھک کر چور ہو گیا۔ نہ جانے کمبخت کہاں غائب ہو گئے۔ زمین کھا گئی کہ آسمان نگل گیا۔"

عورت کا ماتھا ٹھنکا، دم بخود رہ گئی۔

"کس کے بچے ہیں؟"

"ہمیں آم کھانے سے کام، گٹھلیاں گننے سے کیا حاصل، کسی کے بھی بچے ہوں، ہمیں کیا؟"

"کسی امیر کے ہوں، جب ہی تو ان کا انعام مقرر ہوا ہے۔ بے چارے ماں باپ بے قرار ہوں گے۔"

"تو نری احمق ہے۔ یہ دونوں مسلمؑ بن عقیل کے بچے ہیں۔ جو انہیں لائے گا بے حساب دولت ملے گی۔"

"باپ کو تو ختم کر دیا۔ اب بیٹوں کا خون بہے گا۔ مگر ان معصوموں نے کیا گناہ کیا ہے؟"

"ہم کیا جانیں، ہمیں انعام سے مطلب۔"

"مجھے مل جائیں تو انہیں کبھی نہ دوں۔"

"کیا کرتی ان کا؟"

"انھیں بیچ نہ بنا کر پالوں۔"

"تو نری احمق ہے، بھلا عقل کی بات کیسے کہہ سکتی ہے۔ ان بچوں کے سرہانے موت کھڑی ہے۔ ان کو کون پالے گا۔ حاکم ان بچوں کو کولھو میں پسوا دے گا۔ بچے مل جائیں تو دلدر دور ہو جائیں۔"

"تمہارا کون بیٹھا ہے اس دنیا میں جس کے لیے دولت کماؤ گے، یہ بچے بڑے ہو جائیں گے بڑھاپے کا سہارا بنیں گے۔ وعدہ کرو! اگر بچے مل گئے تو انھیں پال پوس کر بڑا کرو گے۔"

"ایسی باتیں مت کر۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ کسی نے سن لیا تو آفت آجائیگی۔"

"ہم غلاموں کی تو ویسے بھی جان کی کوئی قیمت نہیں۔ رسول اللہؐ کا زمانہ سب نے بھلا دیا۔ اب تو غلاموں کے ساتھ جانوروں سے بدتر برتاؤ ہوتا ہے۔"

"جب ہی تو کہتا ہوں یہ انعام مل جائے تو ہم مالک کو اپنی آزادی کی قیمت ادا کر دیں۔"

"تھو ہے ایسی آزادی پر جو معصوموں کے خون سے خریدی جائے۔"

"یہ آج تجھے کیا ہو گیا ہے تجھے جان بھی پیاری نہیں، الٹی سیدھی بکواس کیے جا رہی ہے۔"

"کس کے لیے جیوں، خدا نے اولاد بھی نہیں دی۔"

"اچھا اگر مار کھانا چاہتی ہے تو وہ اور بات ہے۔ ورنہ چپ چاپ سو جا۔ میں صبح اٹھ کر ان کی تلاش میں نکل جاؤں گا۔ انعام ملا تو تجھ سے بہتر عورت مل جائے گی۔ میں ہی ہوں جو تجھ جیسی بنجر بانجھ عورت کو جھیل رہا ہوں۔"

"تو جانتا ہے، میں بانجھ نہیں، خرابی تجھ میں ہے۔ میرا بیٹا جیتا رہتا۔ تو انھی کی عمر کا ہوتا۔"

"کن کی عمر کا؟" مرد چونک پڑا۔

ان بچوں کی عمر کا۔"

تجھے کیسے معلوم ان بچوں کی عمر کیا ہے؟"

"بس یوں ہی .... اندازہ سے کہہ دیا۔" عورت گھبرا گئی۔

"تو مجھے چکمہ دے رہی ہے۔ بتا! وہ بچے کہاں ہیں؟"

"میں کیا جانوں، کہاں ہیں - اور جانتی بھی تو تجھے جیسے قصائی کو نہ بتاتی۔"

"خیر، نہ بتا، اللہ میری مدد کرے گا۔"

"اللہ تیری مدد ہرگز نہ کرے گا، شیطان سے مدد مانگ۔"

"اسے کسی بھی مدد شامل ہو، اپنا کام بننا چاہیے۔" مرد ہنسا۔

مرد سو گیا، عورت جاگتی رہی۔ خوف کے مارے نیند اچاٹ ہو گئی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کرے۔ بچوں کو کہاں چھپائے۔ سوچا کل جب وہ چلا جائے گا تو کچھ ترکیب نکال جائے گی۔ آخر نیند آ گئی۔

رات کو نہ جانے ابراہیم نے کچھ ڈراؤنا خواب دیکھا کہ نیند میں بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ بڑے بھائی محمد نے بہت ان کا منہ بند کیا، بہلایا لیکن سسکیاں نہ رکیں۔ اس وقت اس ظالم کو بھی شیطان نے جگا دیا۔ عورت کو سوتا پا کر دبے پیر اٹھ کر دیکھا، پاس کے حجرے میں کنڈی چڑھی ہے۔ اندر سے سسکیوں کی آواز آ رہی ہے۔ کھولا تو بچوں کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔

"کون ہو تم لوگ؟"

"ہم نہیں بتائیں گے ورنہ تم ہمیں مار ڈالو گے۔"

"نہیں ماروں گا۔"

"قسم کھاؤ۔"

اس نے جھٹ قسم کھالی۔ جب اسے معلوم ہوا یہ وہی بچے ہیں جن کے سروں پر انعام ہے تو جی ہی جی میں پھولا نہ سمایا۔ سوچا اگر بچوں نے غل مچایا اور عورت جاگ گئی تو قیامت برپا ہو جائے گی۔ مالک کو پتہ چل گیا تو دولت کی لالچ میں وہ انھیں چھین کر خود مار ڈالے گا۔ انعام ہاتھ سے جائے گا۔ اس نے بچوں کو بہلایا۔

"ارے میں سارا دن تمہیں تلاش کرتا رہا، سنو! تم مدینہ جانا چاہتے ہو؟"

"ہاں ہمیں چچا کے پاس پہنچا دو، بہت انعام و اکرام پاؤ گے۔"

"تو اٹھو چپ چاپ میرے ساتھ چلو، قافلہ تمہارے انتظار میں رکا ہوا ہے۔ جلدی کرو۔"

"ہم اس نیک بی بی کا شکریہ تو ادا کر دیں جس نے ہمیں پناہ دی۔"

"وقت نہیں ہے اور شاید اس کی نیت بدل جائے اور وہ تمہیں نہ جانے دے۔ تم چلو تو ورنہ قافلہ روانہ ہو جائے گا۔"

وہ شخص دبے پیر بچوں کا ہاتھ پکڑ کے نکلا اور ایک طرف چل دیا۔

"اتنی تیزی سے نہ بھاگو، ہمارا دم پھولا جاتا ہے۔" ابراہیم ہانپنے لگے۔

"بس جلدی کا کرو۔" وہ درشتی سے بولا۔

"تم ہمیں کہاں لے جا رہے ہو؟" تھوڑی دور چل کر بچے بولے۔

"خاموش چلو، بک بک مت کرو۔" اسے گھبراہٹ ہو رہی تھی کہ اگر کسی نے راستے میں دیکھ لیا تو بچوں کو چھین کر لے جائے گا۔ سارے کے سارے ان بچوں کی تاک میں لگے ہوئے تھے۔

"تم ہمیں دریا کی طرف کیوں لے جا رہے ہو؟ ادھر تو کوئی قافلہ نہیں جاتا۔"

"چپ چاپ چلے آؤ، ورنہ پچھتاؤ گے۔" وہ درشتی سے بولا اور انھیں گھسیٹنے لگا۔

بچے بڑے ہوشیار ہوتے ہیں۔ قصائی کے ہاتھ لگاتے ہی بکری تھر تھر کانپنے لگتی ہے۔ جب بے زبان موت کو دور سے پہچان لیتے ہیں۔ تو یہ بچے کیوں نہ اس کا ارادہ بھانپ لیتے۔

آدمی نے بال پکڑ کر چھری دکھائی اور بولا۔

"چپ چاپ چلو" ورنہ جان سے مار دوں گا۔"

"تم جھوٹے ہو۔" عون نے نفرت سے کہا۔

"تم نے قسم توڑ دی؟" ابراہیم نے ملامت سے کہا۔

مگر وہ ڈھٹائی سے ہنسنے لگا۔ انھیں گھسیٹتا لے چلا۔ جگہ سنسان تھی۔ بچوں کی فریاد کسی نے نہ سنی۔ بچے سب کچھ سمجھ کر رونے لگے۔ "تم ہمیں قتل کرنے سے پہلے ... پڑھ لینے دو۔" عون نے خوشامد کی۔ "اچھا پڑھ لو، بھاگنے کی کوشش کی تو....." وہ ایک طرف بیٹھ گیا۔ "ہم بھاگیں گے نہیں۔" دونوں نے ریت پر تیمم کیا۔ پھر فجر کی نماز پڑھی۔ دیر تک دعا مانگتے رہے۔

وہ شخص خنجر لے کر آگے بڑھا، اب دونوں بھائیوں میں جھگڑا ہو رہا تھا۔ دونوں کہتے تھے "پہلے ہمیں قتل کرو۔"

"میں چھوٹے بھائی کا سر کٹتے نہ دیکھ سکوں گا۔"

"مگر ہم چھوٹے ہیں اس لیے ہمارا دل تم سے زیادہ کمزور ہے۔ پہلے ہمیں قتل ہونے دو۔"

"امی کہتی تھیں، بڑوں کا کہنا ماننا چاہیے۔"

"یہ بھی تو کہتی تھیں چھوٹوں کا دل نہیں دکھانا چاہیے۔"

"یہ تم لوگ کیا بیکار کی بک بک کر رہے ہو۔ کیا میرے پاس دنیا کا اور کوئی کام نہیں جو تمہاری الٹی سیدھی بکواس سنتا رہوں۔ میرا وقت ضائع کر رہے ہو۔ چلو میں تم دونوں کو ایک ہی وار میں ختم کیے دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے وار کیا۔ ابراہیم کو دھکیل کر عون نے اپنا سر آگے کر دیا۔ ایک ہی وار میں سر تن سے جدا ہو گیا۔ آدمی نے لپک کر سر قبضہ میں کیا۔ ابراہیم بھائی کی لاش پر گر پڑے۔ دوسرا وار کیا اور دوسرا سر بھی تھیلے میں ڈالا۔ ماہر قصاب کی چابکدستی سے اس نے پھرتی سے دونوں لاشیں دریا میں پھینک دیں۔ ابھی جسموں میں جان باقی تھی۔ دونوں جسم ڈوبتے ابھرتے ایک دوسرے سے بغلگیر لہروں کی آغوش میں آگے بڑھ گئے۔

جب وہ شخص بچوں کے سر لے کر انعام کی خاطر ابن زیاد کے دربار میں پہنچا تو ان معصوموں کے خون میں لتھڑے سر دیکھ کر اس شقی القلب کا کلیجہ بھی ہل گیا۔ خوف سے جسم پر رعشہ طاری ہو گیا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"میں نے زندہ لانے کا حکم دیا تھا۔ سر کاٹنے کا نہیں۔ میں انہیں قتل نہیں کرتا۔ انھیں گرفتار کر کے حسینؑ سے سودا کرنا چاہتا تھا۔ اب یہ سر میرے کس کام کے ہیں۔"

ابن زیاد نے ایک شخص کو بلا کر حکم دیا۔

"اس خنزیر کے نیچے کر لے جاؤ اور وہیں جہاں اس نے بچوں کو ذبح کیا ہے" اسے بھی قتل کر دو۔ اس کے جسم کے ٹکڑے کر کے چیل کوؤں کو کھلا دو۔ خبردار اس ناہنجار کو دفن نہ کرنا کہ زمین بھی اس غلاظت کو قبول نہ کرے گی۔ اور ان بچوں کے سر دریا میں بہا دو۔"

وہ آدمی اس مردود کو گھسیٹتا ہوا دریا کے کنارے لے گیا۔ پہلے اس کی آنکھیں نکالیں پھر اس کے ہاتھ پیر کاٹے اور جانوروں کی غذا بننے کے لیے پھینک دیا۔

دونوں بچوں کے جسم ابھی کنارے سے تھوڑی دور ایک چٹان کے سہارے غوطے کھا رہے تھے۔ اس نے وہ دونوں سر بھی لہروں پر آہستہ سے چھوڑ دیئے۔ پانی کی موجوں نے سروں کو جسموں کے پاس پہنچا دیا۔ دریا غصے سے بل کھا رہا تھا۔ موجیں سر پٹخ رہی تھیں۔ اس شخص کو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے انسان کے کمینے پن پر کھل کھلا کر ہنس رہے ہیں۔ قہقہہ لگا رہے ہیں۔

اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ تھر تھر کانپنے لگا۔

وہ شخص زندگی بھر کبھی نہ مسکرایا۔

"راستے میں"

حسینؓ ابن علیؓ اپنے قافلے کے ساتھ ان باتوں سے بے خبر آرام سے کوفے کی طرف بڑھتے جارہے تھے۔ مجمع اب ہزاروں تک پہنچ گیا تھا۔ لوگ راستے میں ساتھ جارہے تھے۔ مگر حسینؓ فکر مند تھے کہ کوفے کی کوئی اور خبر کیوں نہیں آتی۔ قاصد کچھ تو جواب لائے۔

قافلہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ مگر قاصد بہت تیز ناقوں پر گئے تھے۔ وہ تو اتنے عرصے میں پلٹ بھی سکتے تھے۔

عبداللہ بن سلیم اور منظر بن مشمعل حج کے بعد نہایت تیز رفتاری سے روانہ ہو کر قافلہ حسینؓ سے آن ملے تھے۔ بچوں اور عورتوں کی وجہ سے حسینؓ ابن علیؓ بڑی احتیاط سے سفر کر رہے تھے

کوفہ اب بہت دور نہیں رہ گیا تھا کہ ادھر سے ایک مسافر آتا دکھائی دیا۔ سب خوش ہو گئے کہ پہلا ہرکارہ استقبال کی خوشخبری لے کر آرہا ہے۔ مگر قافلے کو دیکھ کر اونٹنی سوار نے اپنا راستہ بدل دیا۔ اور دوسری طرف چل دیا۔ سب کو بڑی حیرت ہوئی۔

عبداللہ بن سلیم اور منظر بن مشمعل کو تشویش ہونے لگی۔ وہ قافلے سے کٹ کر اس شخص کا پیچھا کرنے لگے اور آگے بڑھ کر اسے جا لیا۔ اس سے پوچھا کہ کوفہ کا کیا حال ہے۔ پہلے تو وہ جھکائے خاموش رہا پھر بولا۔

مسلمؓ بن عقیل قتل کر دیئے گئے۔ لاش کی بے حرمتی کی گئی اور گلیوں میں گھسیٹا گیا۔ ہانی بن عروہ کا بھی وہی انجام ہوا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ حسینؓ ابن علیؓ کے قاصدوں کے ساتھ بھی وہی بدسلوکی کی گئی۔ میرے ہم وطنوں نے ان کے ساتھ دغا کی۔ پہلے انھیں دعوت دی۔ مگر جب حاکم کی طرف سے چوٹ پڑی۔ تو بزدل گیدڑوں کی طرح منہ چھپا کر کانوں میں دبک گئے۔ میں حسینؓ کو کیا منہ دکھاؤں!" یہ کہہ کر وہ ان دونوں سے رخصت ہوا۔

دونوں امام حسینؓ کے پاس پہنچے اور تخلیہ میں عرض کرنے کی خواہش ظاہر کی۔

"ان لوگوں سے کوئی پردہ نہیں، جو کچھ کہنا ہے ان سب کے سامنے کہو۔"

"آپ نے اس شخص کو دیکھا جو راستہ کاٹ کر چل دیا۔"

"ہاں! دیکھا، ہم اسی کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔"

"وہ بنی اسد کے قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔ بہت بھروسے کا آدمی ہے۔ اس نے بتایا کہ مسلمؑ قتل کر دیئے گئے۔ کوفے کا رنگ بدل چکا ہے؛ قہر نازل ہو رہا ہے۔"

حسینؑ سر جھکائے خاموش بیٹھے رہے۔ کوفہ والوں کی طرف سے دغا کا شبہ تھا۔ مگر اس بے رخی کے برتاؤ کی امید نہ تھی۔ امید موہوم کے ختم ہو جانے سے زیادہ انھیں اپنے پیارے بھائی، عزیز دوست اور وفادار ساتھی کی شہادت کا صدمہ تھا۔ وطن سے رخصت ہونے کے بعد یہ پہلی چوٹ تھی جو انکے دل پر پڑی۔

"خدارا کوفہ نہ جایئے۔ خاص طور پر اس لیے کہ ہمارے ساتھ خواتین اور چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ یہیں سے واپس لوٹ چلیے۔ کیونکہ کوفہ میں اب اپنا کوئی نہیں۔ وہ لوگ صرف حمایت سے ہی جان نہ چرائیں گے۔ بلکہ ہم پر حملہ کر کے ختم کرنے سے بھی نہ چوکیں گے۔"

امام پھر بھی خاموش رہے۔

"کوفہ جانا دانش مندی کی نشانی نہیں ہے۔"

امام نے سر اٹھایا اور کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" پھر مسلمؑ بن عقیل کے بڑے لڑکوں سے پوچھا "تمہاری کیا رائے ہے؟"

"کوئی جائے یا نہ جائے، ہم تو ضرور ہی جائیں گے۔ ہم اپنے باپ کی شہادت کا بدلہ لیکر رہینگے یا جام شہادت پئیں گے۔ واپس نہ جائیں گے۔" بیٹوں نے کہا۔

"واپس جانے کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ ہمارے سب راستے بند ہو چکے ہیں۔ مسلمؑ اور انکے معصوم بیٹے نہ رہے تو اب جینے کا مزہ کیا۔؟"

"اور پھر مسلمؑ بن عقیل بات اور تھی۔ آپ گئے تو ٹوٹے ہوئے دلوں کو سہارا ملے گا لوگ پھر سے کھڑے ہو جائیں گے۔"

بہت افزائی کی باتیں سن کر حسینؑ کو کوئی اطمینان یا خوشی نہیں ہوئی۔ بڑی زی

سے کہا۔

"واپس لوٹیں تو کدھر؟ اگر مدینہ میں امان ملتی تو وہاں سے نکلتے ہی کیوں؟ جہاں سے ہزاروں بلاوے آئے۔ وہاں کے دروازے بند ہو گئے۔ اب کیا مدینہ میں حالات بدل جائیں گے۔ اور ہمیں پناہ مل جائے گی۔ دوسرے یہ بھی پتہ نہیں کہ مسلمؓ کن حالات میں شہید ہوئے۔ ممکن ہے جنگ ہوئی اور کوفہ والوں نے ان کی مدد کی۔ بڑی شجاعت اور جوانمردی سے حقِ اطاعت ادا کیا۔ مگر سرکاری فوجوں کے مقابلے میں فتح مند نہ ہو پائے۔ ایسی صورت صورت میں ہمیں کوفہ والوں کو چھوڑ دینا انتہائی خود غرضی اور کمینہ پن ہوگا۔ وہ لوگ ہماری خاطر تباہ و برباد ہوئے۔ ہم انہیں چھوڑ کر اپنی جانیں بچاکر بھاگ نکلیں۔ انہوں نے اگر ہمارا ساتھ دیا ہے تو یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کو جتنیں۔"

"لیکن کوفہ جانا موت کے منہ میں جانا ہے۔ ہماری موت سے انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔"

"دوستو! تم جو کہہ رہے ہو۔ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ واقعی جان بچانے کا ایک ہی راستہ ہے کہ کوفے کا رخ نہ کیا جائے۔ میں تمہاری رائے کی قدر کرتا ہوں۔ مگر یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں کہیں بھی جاؤں، موت میری منتظر رہے گی۔ میں فتح اور کامرانی کے خواب نہیں دیکھ رہا ہوں۔ میں تخت و تاج لینے نہیں اپنی موت کی طرف جا رہا ہوں، اس لیئے میں چاہتا ہوں کہ تم سب اپنے اپنے گھر واپس چلے جاؤ۔"

حسینؓ کی تقریر کا یہ اثر ہوا کہ بہت سے لوگ جو بڑی بڑی امیدیں باندھ کر ساتھ چل رہے تھے۔ اسی رات تاریکی میں کھسک گئے۔ قافلہ جب آگے بڑھا تو کچھ اور راستے مڑ لیے۔ آخر میں بس گنے چنے ساتھی رہ گئے۔ جو مدینہ سے روانہ ہوئے تھے جو حسینؓ کے ساتھ جینے مرنے کا ارادہ کر کے آئے تھے۔ بجائے غم اور غصّے کے حسینؓ کو ان لوگوں کے چلے جانے پر انتہائی اطمینان ہوا۔ وہ تو چاہتے تھے سب انھیں چھوڑ کر اپنی جانیں بچا لیں کیونکہ ان کی منزل موت تھی۔ وہ مقتل کی طرف جا رہے تھے۔ بس وہی ایک راستہ کھلا تھا۔

مُلاقات

رات اپنی سیاہ چادر سمیٹ کر رخصت ہوئی۔ دن جگمگا اٹھا۔ امام نے حکم دیا کہ پانی کثرت سے بھر لو، مشکیں، چھاگلیں، پکھالیں پانی سے بھر لو۔ پانی اچھی طرح بھر کے قافلہ پھر روانہ ہوا۔ شرافہ تمام ہو کر رستہ شروع ہو گیا۔ محرم کی پہلی تاریخ آگئی۔ دوپہر دن گزر چکا تھا۔ ساتھیوں میں سے کسی نے نعرہ تکبیر بلند کیا۔ حسین نے وجہ پوچھی تو پتہ چلا کھجور کے درخت نظر آ رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی کوئی قریب آ گیا۔ سب غور سے دیکھنے لگے۔ عبداللہ بن سلیم نے کہا۔

"میں کئی بار یہاں آ چکا ہوں۔ کھجور کے درخت اس جگہ کبھی نہ دکھائی دیئے۔ کچھ اور ہی معاملہ ہے۔"

"کسی تیز نظر سے کہو، ذرا قدم بڑھا کر دیکھے۔" امام نے کہا۔ عبداللہ بن سلیم آگے بڑھے۔

"مجھے تو گھوڑوں کی کنوتیاں نظر آ رہی ہیں۔ مجھے تو کوئی لشکر معلوم ہوتا ہے۔"

"ٹھیک سمجھتے ہو، کوئی لشکر ہے۔ کیا رائے ہے؟"

"خیمہ ڈال دیں اور جتنے بھی سپاہی ہیں تیار ہو جائیں۔ یقیناً دشمن کی فوج ہے ہر حال میں احتیاط ضروری ہے۔"

چنانچہ خیمے نصب کر دیئے گئے۔ اور سب چوکس ہو گئے۔

فوج قریب آئی تو معلوم ہوا۔ حر بن یزید ریاحی ہیں۔ ایک ہزار لشکر کے ساتھ

قادسیہ سے چلے آرہے ہیں۔ ساتھ میں جو پانی تھا۔ ختم ہو چکا ہے۔ پیاس سے لشکر لب دم ہو رہا ہے۔ جانوروں کا تشنگی سے برا حال ہے۔

حسینؓ نے اپنے جوانوں کو حکم دیا۔ ذرا پیاسوں کی پیاس بجھاؤ۔ انسان و حیوان سب کو سیراب کرو۔ کوئی پیاسا نہ رہ جائے۔"

حکم کی دیر تھی کہ جاں لب فوج کو پانی پلایا جانے لگا؛ کٹورے بہا دیئے، چھاگل بے کر رگ بڑھے۔ مشکوں کے منہ کھول دیئے گئے۔ اونٹوں پر لدے چھاگل خالی ہونے لگے۔ ایک ہزار سواروں کو پانی پلانا مذاق نہ تھا۔

حرؔ اور ان کے ساتھی حسینؓ ابن علیؓ کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے آئے تھے۔ سنا تھا۔ ہزاروں کا لشکر حسینؓ کے ساتھ کوفہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ گنتی کے دو سو افراد کو دیکھ کر چپ رہ گئے۔ پھر حسینؓ نے جس دریادلی سے پیاسوں کی خاطر مدارت کی۔ اس کے خیال سے لشکریوں کی زبانیں چپ تھیں۔ سر جھکے ہوئے تھے۔ ادھر بھی سب خاموش تھے۔ اتنے میں ظہر کی نماز کا وقت ہو گیا۔ حسینؓ نے حجاج بن مسروق سے اذان دینے کو کہا۔ اذان کی آواز پر صفیں تیار ہو گئیں۔ حسینؓ بھی نماز کے لباس میں خیمے سے نکلے۔ بعد حمد و ثنا کے فرمایا۔

"اے کوفہ والو! خدا حاضر و ناظر ہے۔ میں تمہاری طرف کسی نامناسب ارادے سے نہیں آیا ہوں۔ تمہارا دعوت نامہ پا کر ہی آیا ہوں۔"

"کیسا دعوت نامہ؟" حرؔ نے ادب سے دریافت کیا۔

"تم نے مجھے بلانے کے لیے خط لکھے۔ قاصد بھیجے کہ یا حسینؓ آپ کو خدا کا واسطہ کوفہ آجایئے۔ ہمارا کوئی امام نہیں۔ خدا کے لیے آکر ہماری رہنمائی کیجئے۔ ہمارے دکھوں کا مداوا کیجئے۔"

"گستاخی معاف یا حسینؓ! ہم نے آپ کو کوئی ایسے خط نہیں لکھے" حرؔ نے کہا۔

تب امام نے خیمے سے خطوں کے تھیلے منگوا کر سامنے ڈال دیئے۔

"یہ دیکھو، میں تمہیں دھوکا نہیں دینا چاہتا۔ اپنی آنکھوں سے یہ خط دیکھ لو۔"

"ہم میں سے کسی نے ان میں سے کوئی خط نہیں لکھا۔ نہ ہمیں خطوں کے مضمون سے کوئی واقفیت ہے۔ یا تو آپ کو کسی نے دھوکہ دینے کے لیے یہ حرکت کی ہے۔ یا کوفہ کے

غداروں کی کارروائی معلوم ہوتی ہے۔ آپ کو معلوم نہیں۔ ان سب کا علاج کر دیا گیا۔
جو باقی بچے ہوں گے وہ روپوش ہو گئے ہیں۔"

"خیر اگر تم کہتے ہو کہ کوفہ میں میرا کوئی منتظر نہیں ہے۔ تو میں اور کہیں اور چلا جاؤں گا۔"

امام کی اس بات پر وہ لوگ نظریں چرانے لگے۔ امامؑ نے کہا۔

"خیر نماز ظہر تو ادا کر لیں۔ مگر تم اپنے لشکر کو علیحدہ نماز پڑھاؤ گے"

"نہیں، آپ پڑھائیے، ہم سب آپ کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔"

چنانچہ سب نے ساتھ نماز ادا کی۔ حسینؑ اپنے خیمے میں چلے گئے۔

حر کے لیے جو خیمہ نصب کیا گیا تھا۔ وہ اس میں جا کر آرام کرنے لگے۔ وہاں ان کے کچھ ساتھی پہنچ گئے۔ اور بات چیت کرتے رہے۔

حر کے معنی آزاد ہیں مگر اس وقت وہ حسینؑ کے احسان کی قید میں تھے۔ ان کی زبان بند تھی اور کچھ کہتے بن نہ پڑتا تھا۔ اس کے بعد جب عصر کی نماز بھی سب نے ادا کر لی تو حسینؑ نے کہا۔

"اگر کوفہ والوں کو میری ضرورت نہیں تو وہ میرے پابند نہیں۔ اس لیے میں کوفہ کے بجائے کسی اور طرف کا رخ کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر انہوں نے کوچ کی تیاریوں کا حکم دیا۔

اب مجبوراً حر کو زبان کھولنا پڑی۔

"مجھے قادسیہ کے حاکم نے اس لیے روانہ کیا ہے کہ میں آپ کو راستہ میں روک کر آپ کو ...... ابن زیاد کے سامنے حاضر کروں۔"

"حر مجھے نجف چلا جانے دو، اس میں تمہارا کچھ نہیں بگڑتا۔" حسینؑ نے نرمی سے کہا۔

"نجف جانے کی اجازت نہیں ہے۔"

حسینؑ کو ایک دم جلال آ گیا۔ چہرہ سرخ ہو گیا، ضبط کی بھی ایک حد ہوتی ہے وہ جتنی نرمی برت رہے تھے۔ یہ لوگ سر پر چڑھتے چلے آ رہے تھے۔ نہایت غصے سے بولے۔

"حر تیری یہ مجال نہیں کہ ہمیں دھمکیاں دے۔ ہم پر حکم چلائے۔ ہمارا جی جدھر چاہے گا ادھر جائیں گے۔ اگر ہمت ہے تو روک لے۔"

یہ کہہ کر حسینؓ نے فوراً گھوڑا بڑھایا۔ حر نے فوراً گھوڑا سامنے بڑھا دیا۔

یہ دیکھ کر ابوالفضل عباسؓ اور علی اکبرؓ کا جوان خون کھول اٹھا۔ زین العابدینؓ کی طبیعت خراب تھی۔ مگر وہ بھی اٹھ بیٹھے، قاسمؓ بھی لڑھے اور سب نے تلواریں نکال لیں۔

"ٹھہرو، یہ خون خرابہ مجھے پسند نہیں، میں اسکا لیے مدینہ چھوڑ کر آیا ہوں۔"

پھر حر سے بولے: "ان نوجوانوں کا خون گرم ہے۔ ان کے منہ نہ لگو، اگر میری جان لینے کی غرض سے آئے ہو تو وہ دوسری بات ہے۔"

"ہم کو کسی کی جان لینے کا حکم نہیں۔ آپ کوفہ جا رہے تھے چلئے ہم کوئی مزاحمت نہ کریں گے۔ مگر ہم ساتھ چلیں گے۔"

"نہیں اب ہم کوفہ نہ جائیں گے۔ ہمارے دل میں جو کوفہ کے بارے میں مغالطہ تھا وہ دور ہو گیا۔ واقعی اب وہاں ہمارا کوئی منتظر نہیں۔"

"ہم جان بوجھ کر موت کے منہ میں نہ جائیں گے۔" سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

"کوفہ کے علاوہ اور کسی رخ جانے کا حکم نہیں۔ اور حضور، آپ کہاں تشریف لے جائیں گے؟ واپس مدینہ نہیں جا سکتے کہ راستے میں لشکر بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ آپ جدھر بھی جائیں گے۔ آپ کو حلقے سے نکلنا نصیب نہ ہوگا۔ ایک بات عرض کروں؟"

"ضرور۔" امام نے اجازت دی۔

"مجھے صرف اس صورت میں آپ کے ساتھ رہنے کا حکم ملا ہے کہ آپ کوفہ جا رہے ہیں۔ یا مدینہ کی طرف واپس لوٹیں۔ اگر آپ کوئی ایسا راستہ اختیار کریں۔ جو نہ مدینہ جاتا ہو نہ کوفہ تو ایسی صورت میں مجھے کوئی احکامات نہیں ملے۔ اس لیے میں خاموش رہوں گا اس طرح آپ بھی زحمت سے بچیں گے۔ اور میرے اوپر بھی الزام نہ آئے گا۔"

"زحمت سے بچنا تو اب ممکن ہی نہیں۔ ہمارے لیے تو ہر چہار طرف مصیبت ہی مصیبت ہے۔ لیکن تم ٹھیک کہتے ہو، ہم قادسیہ اور عذیب کے راستے سے بائیں رخ کی طرف چلے جائیں گے۔

یہ کہہ کر حضرت کے قافلے نے ادھر ہی کا رخ کیا۔

حر نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ راستے میں بڑے دکھ سے بولا۔

"دیکھیے، میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں۔ آپ اپنی اور اپنے اہل وعیال کی زندگی پر رحم کیجیے۔ اگر آپ نے جنگ کی تو آپ یقیناً قتل ہو جائیں گے۔"

"کیا تم مجھے موت سے ڈرانے کی کوشش کر رہے ہو۔ ذرا سوچو تو اس سے زیادہ تم کر بھی کیا سکتے ہو کہ مجھے قتل کر دو۔ حر! موت تو ہر انسان کو ایک دن آنا ہی ہے۔ بہادر موت کا مقابلہ کرنے میں کوئی عار و ننگ نہیں۔ نیت میں سچائی ہو۔ اپنا ضمیر اجازت دے تو موت کے خوف سے قدم نہیں لڑکھڑانا چاہئیں۔"

حر نے سر جھکا لیا۔ اور کوئی جواب نہ دیا۔

قافلہ راستہ طے کرتا رہا۔ حر بھی ساتھ چلتا رہا۔ جب نینوا کی سرزمین پر پہنچے، تو ایک مسلح سوار کوفہ کی جانب سے آتا دکھائی دیا۔

سب رک کر اس کا انتظار کرنے لگے۔ وہ قریب آیا تو اس نے حر اور اس کے افسروں کو سلام کیا۔ حسینؓ "ابن علیؓ" کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ قاصد حر کے لیے، ابن زیاد کے پاس سے ایک پیغام لایا تھا۔ خط میں لکھا تھا۔

"تم کو حکم دیا جاتا ہے، حسینؓ کو آگے بڑھنے سے روک دو۔ اور ان کے قافلہ کا رخ نہایت ہوشیاری سے ایسے مقام کی طرف موڑ دو جہاں آب و گیاہ کا نام نہ ہو۔ اور ہمارے لیے کوئی قلعہ بھی نہ ہو۔ یہ قاصد تمہارے ساتھ رہے گا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ تم ہمارے حکم کی تعمیل میں کوئی کوتاہی تو نہیں کرتے۔"

خط سے معلوم ہوتا تھا کہ ابن زیاد کو حر پر مکمل اعتماد نہیں۔ وہ اس کی طبیعت کی نرمی سے ڈرتا ہے۔ یا شاید اس زمانے کا دستور بن گیا تھا کہ کسی پر پوری طرح اعتماد نہ کیا جائے۔ خریدا ہوا انسان شاید کسی اور کے ہاتھوں زیادہ داموں میں بک جائے۔ بالوں اور دماغی کمزوری کا شکار ہو کر غلطی کر بیٹھے۔ افسروں کو ایک دوسرے کی جاسوسی پر تعینات کر دیا جاتا تھا۔

حر حسینؓ کی عظمت کا قائل ہوتے ہوئے بھی دنیا کا بندہ تھا۔ وہ اپنے مستقبل کے

خیال سے ابن زیادہ کی مخالفت ہرگز پسند نہیں کر سکتا تھا۔ ہزار مجبوری اور لاچاری کے باوجود اس پر ابن زیاد کے حکم کی تعمیل لازم تھی۔ اس کا ارادہ ہو رہا تھا کہ حسینؓ کو کربلا کے میدان کی طرف بڑھنے سے روک دے۔ کیونکہ یہ وہی مقام تھا جہاں ابن زیاد انہیں لے جانا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے دل پر جبر کر کے انہیں آگے بڑھنے دیا۔ قاصد نے بھی اپنی خوشنودی کا اظہار کیا اور قافلہ بڑھتا رہا۔

کیسی بھیانک رات تھی چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ لق و دق بے رحم بے مروت صحرا، جیسے چڑیلیں، اجاڑ ٹیلے، کوئی آدم نہ آدم زاد نہ یہ خبر کہ راستہ کدھر ہے۔ جنگلی جانوروں کی دھاڑیں سن کر بچے سہمے جاتے تھے۔ ماؤں کی گودوں میں منہ چھپائے بلک رہے تھے۔ مائیں آیتیں پڑھ پڑھ کر دم کر رہی تھیں۔ گرمی تھی کہ الاماں! مگر آلِ محمدؐ نے صبر کا دامن نہ چھوڑا۔ منزلوں پانی کا نام ونشان نہ تھا۔ بیشتر پانی حر کی فوج کو پلا دیا تھا۔ اگر پانی دینے کے بجائے حسینؓ کے پیاسے جاں نثاروں پر ٹوٹ پڑتے۔ تو منٹوں میں صفایا کر دیتے۔ مگر رسول خداؐ کے نواسے کو تو ایسی بات سوچتے ہوئے بھی کراہیت آتی تھی۔

صبح تڑکے سے سورج اپنا عذاب برسانے لگا۔ ہوا دم بخود تھی۔ پسینے میں شرابور ہو رہے تھے۔ پھول جیسے بچے جھلس کر کملا گئے تھے۔ گھوڑوں کی پیاس سے زبانیں نکل پڑتی تھیں۔ جب جانور بھی اپنے بھٹوں میں دبک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ نبیؐ کے پیارے نواسے صحرا کی خاک چھان رہے تھے۔ بالوں میں منوں خاک اٹی ہوئی تھی۔ بچے سسک سسک کر پانی مانگتے تھے۔

"اے صاحب! کیا میرے بچوں کو پیاسا مارنے کا ارادہ ہے؟" بانو اپنی محمل سے پکار رہی تھیں۔ "بچہ جینے کی جان میرا دودھ پیتا بچہ بغیر پانی کے بے ہوش ہوا جاتا ہے۔ بچوں کے ہونٹ سوکھ کر تڑخے جا رہے ہیں۔"

ادھر سکینہ بلک رہی تھی۔

"اچھے چچا جان! محمل میں ہمارا دم گھٹا جاتا ہے۔ ذرا گردی تک لے ٹھنڈی لا دیجیے

بھائیں نکالو۔ بابا جان سے کہو خیمے ڈالیں۔ واہ، تم خود تو ہوا کھا رہے ہو اور ہمیں اندر گھونٹ رکھا ہے!"

بچوں کی آہ و زاری سن کر حسینؑ کا کلیجہ مسوس کر رہ جاتے تھے۔ محل کے اندر بھی سایہ تھا باہر تو جیسے سورج سوا نیزے پر اُتر آیا تھا۔ بس اولاد کی قسمت میں باپ کی طرف سے دربدری دکھ ہی دکھ لکھے ہیں۔ پیغمبرِ خدا نے دنیا کو سلامتی کی راہ دکھائی۔ آج اُن کی اولاد اُن کی اُمت کے ہاتھوں لق و دق صحراؤں میں یوں صعوبتیں اٹھا رہی تھی۔

حرّ کا لشکر انھیں اس دوزخی راستے پر ڈال کر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ اب حسینؓ کے لیے کربلا کی طرف جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اب وہ دشمن کی مٹھی میں تھے۔

امام نے میدانِ کربلا پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔ آپ ہی آپ جی بھر آیا: "لو ہماری منزل آ گئی!" زیرِ لب مسکرا کر کہا۔ "اب یہاں سے آگے جانا ہے نہ پیچھے۔" مٹی سے گور کی خوشبو آ رہی تھی۔ انہوں نے لگامیں کھینچ لیں۔ زینبؓ نے سہم کر بھائی کی طرف دیکھا اور کلیجہ تھام لیا۔

"چلتے چلتے لگام کیوں کھینچ لی بھائی؟ یہ کون سا مقام ہے؟ نہ بستی دکھائی دیتی ہے۔ نہ گاؤں، خدا کے لیے اس جگہ سے بڑھیے، مجھے تو وحشت ہو رہی ہے۔ بھلا یہاں کیسے رہیں گے؟"

"کوئی اپنی منزل سے آگے نہیں جا سکتا زینب!" حسینؓ نے کہا۔

"مگر میرا تو کلیجہ کانپ رہا ہے۔ بچوں کے منہ بھی اُترے ہوئے ہیں، بھائی مجھے تو اس نامراد زمین سے خون کی بو آ رہی ہے۔ سبزہ دیکھ کر وحشت ہو رہی ہے۔ پھول آنکھوں میں کانٹوں کی طرح چبھے جاتے ہیں۔"

"یہ تمہارا وہم ہے، زینبؓ یہ وہی مقام ہے جو ہم نے اکثر و بیشتر رات کی نیند میں عالمِ خواب میں دیکھا ہے۔ بڑی اچھی سی جگہ معلوم ہوتی ہے، وہ دیکھو سامنے ہی تو علقمہ ہے اس کے کنارے خیمے نصب کریں گے۔"

زینبؓ دریا کی طرف نظر ڈال کر کانپ اٹھیں۔

"یا خدایا! یہ دریا ہے۔ یا سراب؟ یہ پانی کے بلبلے ہیں کہ انسانوں کی کھوپڑیاں تیر رہی ہیں۔ موجیں ہیں کہ تلواریں آپس میں ٹکرا رہی ہیں۔ کلیجہ منہ کو آیا جاتا ہے۔"

"تم بہت تھک گئی ہو زینبؑ! آرام کرو گی تو یہ گھبراہٹ دور ہو جائے گی۔
امام نے تسلی دی۔

"بھائی میرے جی کو کیا ہوا جاتا ہے؟ آپ ہی آپ بیٹھا جاتا ہے۔ دیکھو تو اصغر کیسا بلک کر رو رہا ہے۔ کہتے ہیں بے زبانوں کو غیب کی خبر ہوتی ہے۔ سکینہ بھی سہمی ہوئی ہے۔"

"دل کو قابو میں رکھو زینب!"

مرغیوں کا شور سن کر مسلا جاتا ہے۔ یا خدا یہ کون ماتم کناں ہے۔ کون بین کر رہا ہے کیا کوئی اس منحوس دریا میں ڈوب گیا؟

تمہارا وہم تمہیں ورغلا رہا ہے۔"

"جی کہتا ہے، یہاں پڑاؤ ہوا تو جانوں کی خیر نہیں۔"

"بنت علی! تم گھبراؤ گی تو اوروں کی ہمت بھی جواب دے جائے گی قسمت میں کربلا آنا لکھا تھا۔ اب ہنسی خوشی ہم سب یہیں رہیں گے۔ اگر حاکم سے اجازت دیدی تو لیں یہیں گھر بنا لیں گے۔ میں معلوم کرتا ہوں، یہ زمین کس کی ملکیت ہے۔ اے لڑکو! ادھر آؤ، ذرا قریب کے علاقے میں جو بستی ہے وہاں جا کر دریافت کرو۔ اس زمین کا مالک کون ہے؟"

چند نوجوان حکم تکمیل کے لیے روانہ ہو گئے۔

پھر حسینؑ نے علی اکبرؑ سے کہا۔

"تمہاری پھوپھی تو بڑی وہمی مزاج ہے۔ یہ وہی مقام تو ہے۔ جہاں بابا کئی بار خیمہ زن ہوئے۔ لمبے سفر نے انہیں ہلکان کر دیا ہے۔ ارے یہ تو بڑی پاک زمین ہے۔ ہم یہاں اپنے کارناموں سے اسے ایسا بلند مرتبہ بخشیں گے کہ لوگ دور دور سے یہاں علم دین سیکھنے آئیں گے۔ انسان اپنے افعال سے زمین کو مرتبہ دیتا ہے۔ اگر ہم نے بلند حوصلگی سے کام لیا تو یہ جگہ فرشتوں کی سجدہ گاہ بن جائے گا۔ اسلام اس سرزمین پر ایک بار پھر اپنی پوری شان سے زندہ ہو گا۔"

سب اتر کر ادھر ادھر ٹہلنے لگے۔ نہر کے پانی نے سب میں دوبارہ جان ڈال دی۔ جنگل میں منگل ہو گیا۔ بچوں کی کلکاریوں سے فضا نغمہ بار ہو گئی۔ مرغیوں نے امام حسینؑ کے قدم چومے اور جاوداں بن گئیں۔

حسینؑ نے علی اکبرؓ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"علی اکبرؓ، یہ جگہ پسند ہے؟"

"لاجواب مقام ہے۔ اور ہوا تو جیسے سیدھی جنت سے چلی آ رہی ہے۔"

جواں سال علی اکبرؓ کی زبانی اپنی تعریف سن کر جیسے پوری ترائی کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچ گیا۔ بڑی ناز و انداز سے وادی نے انگڑائی لی اور زمین پہ فردوس بریں کی بہاریں نچھاور ہو گئیں۔ ہوا نے بھاگ کر یہ خوش خبری دریا کے کان میں ڈال دی کہ تجھے چن لیا گیا۔

"اٹھ دیوانی تیرے نصیب جاگ اٹھے۔

امام حسینؑ تیرے پانی سے وضو کرنے آ رہے ہیں۔

اٹھ لپک کر ان کے قدم چوم لے۔

کہ تیرا رتبہ آبِ کوثر کے ہم پلہ ہو جائے گا۔

تیری آبرو بڑھ جائے گی۔

حسینؑ تیرے پانی کی قسمت جگانے آ رہے ہیں۔

تیرے کنارے پر ان کے قدم پڑیں گے۔

تیرے نام کا صدیوں ڈنکا بجے گا۔

اور جہاں لوگ تیرا نام حسینؑ کے ساتھ لیں گے۔"

ذرہ ذرہ جھوم اٹھا۔ دشت و بیاباں خلدِ بریں کا نمونہ بن گئے۔ صحرا جگمگا اٹھا۔ دور دور تک روشنی پھوٹ نکلی۔

دریا نے بے قرار ہو کر بلبلوں کے قمقمے امام کے قدموں پر لٹا دیے۔ موجیں لپک لپک کر قدم بوسی ہونے لگیں۔ خطۂ زمین کے بھاگ جاگ اٹھے۔ جہاں امامؑ کے قدم پڑے پھول مسکرا اٹھے، غنچے ہنسنے لگے۔ خاکِ کربلا کی قسمت آسمان کی بلندیوں کو پار کر گئی۔

"حسینؑ نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور بھرے ہوئے گلے سے بولے۔

"کیا پرسکون مقام ہے۔ ہوا ذہن میں نشہ گھلا ہوا ہے۔ آنکھیں آپ ہی آپ

بند ہو جاتی ہیں؟

"اس مٹی میں بڑی کشش ہے، دل آپ ہی آپ کھنچا جاتا ہے۔"

... بچے پانی میں ادھر شور برپا کیے ہوئے تھے۔ ریگستانوں میں کسی پر پانی اچھالنا عین عنایت اور پیار کی نشانی سمجھی جاتی ہے کہ پانی قدرت کا حسین ترین تحفہ ہے۔

"عباس بس یہیں خیمے نصب کروا دو۔ مگر زینبؓ سے پوچھ لو خیمے کس رخ نصب کئے جائیں۔ زنانے خیمے ذرا کنارے سے دور رہیں تو اچھا ہے۔ یہاں ہر وقت لوگوں کا آنا جانا رہے گا۔ خواتین کو تکلیف ہوگی۔

عباسؓ نے بہن سے پوچھا تو بولیں۔

"مجھ سے کیا پوچھتے ہو، جہاں سب کی رائے ہو، خیمے لگوا دو۔ بھائی ٹھیک کہتے ہیں۔ خواتین اور بچوں کے خیمے ذرا پانی سے دور رہیں تو اچھا ہے ورنہ بچے ہر دم پانی ہی میں پڑے رہیں گے۔ ہاں مگر اتنی دور بھی نہ لگا دینا کہ پانی دکھائی نہ دے۔ دریا کتنا حسین ہے۔ نظارے سے دل کھلا جاتا ہے۔ دماغ کو تراوٹ ملتی ہے پھر کیوں برا ڈرا جا رہا ہے؟" "اے عباسؓ بچوں سے کہو اب پانی سے کھیل چکے، دھوپ بڑھ رہی ہے۔" بانو بولیں۔

"بچوں کو پانی سے ہٹانا میرے بس کی بات نہیں۔ ننھے بھیجئے اپنا حصہ سنبھالیں۔ تو شاید قابو میں آ جائیں۔"

"رہنے دو، تھوڑی دیر اور پانی میں کھیلنے دو۔ اتنے دن بعد پانی نظر آیا ہے۔ جی بھر جائے گا، آپ ہی نکل جائیں گے۔" زینبؓ نے روک دیا۔

حسینؓ ابن علیؓ مسکرا کر بولے۔

انسان کس قدر کم نعمتوں میں بھی خوشی گزارا کر لیتا ہے۔ وطن سے دور گھر بار چھوڑ کر ایسا لگتا تھا۔ اب کہیں آرام اور سکون نہ مل سکے گا۔ مگر دیکھو یہ سبزہ پا کر سب ساری کلفتیں دور ہو گئیں۔ سب کچھ کھو دینے کا غم مٹ گیا۔ یہیں ٹھہرے اور عمل نہیں جا پائیں بس یہ سمجھے سادے چھوٹے چھوٹے گھر بنا کر نئی بستی بسائیں گے۔ باغ باغیچے لگائیں گے۔ زندگی میں بہار آ جائے گی۔

"مسجد کا رخ عین دریا کی طرف ہوگا۔"

"مکتب اور مکتب خانے کی بنا وسب سے پہلے پڑنی چاہیے۔" زینب نے العابدینؒ کو علم سے بے انتہا لگاؤ تھا۔ بیمار تھے مگران کی محل میں ہر طرف کتابیں بھری پڑی تھیں۔ "سب سے پہلے تو ہاٹ بازار کا انتظام ہونا چاہیے۔" منذر کو اپنی ہانڈی چولہے کی فکر پڑی تھی۔ سب ہنسنے لگے۔

وہ عباسؓ "تم دیکھنا یہاں کتنا حسین شہر تعمیر ہوتا ہے۔ انسان اپنے ہاتھوں سے اجاڑ جنگلوں اور ریگستانوں کو گلزار بنا سکتا ہے۔ ابھی ہماری تعداد کم ہے۔ مگر جلد ہی لوگ ادھر متوجہ ہونے لگیں گے۔ محنت کرنے والوں کی کمی نہ رہے گی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے یہاں ایک پر امن بستی بس جائے گی۔"

خیمے نصب کئے جانے لگے۔ قنائیں کھل گئیں۔ میخیں ٹھونکی جانے لگیں۔ رسیوں کے گچھے کھلنے لگے۔ ساری صعوبتیں بھول کر ایک نئی دنیا بسانے کے خواب بنے جانے لگے مگر دم بھر میں یہ خواب چکنا چور ہو گیا۔

اچانک شمال کی جانب سے غبار اٹھا۔ اور پوری وادی پر چھا گیا۔ لوگ کام چھوڑ کر ادھر متوجہ ہو گئے۔ دور سے ایک فوجی دستہ آگے بڑھتا نظر آیا۔

"عباسؓ نے ساتھیوں کو للکارا۔

"ہوشیار ساتھیو! نہ جانے دوست آتے ہیں کہ دشمن" اس علاقے میں کچھ وحشی قبیلوں نے لوٹ مار کا پیشہ بنا لیا ہے۔ ڈاکوؤں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔"

ایک اور دستہ نظر آیا۔ جنگل میں سیاہی بڑھ گئی۔ طبل جنگ کی گرج سے کوہ و دور بیاباں لرز اٹھے۔ گھوڑوں کی ٹاپوں سے دھرتی کی چھاتی دھڑکنے لگی۔

بجلی کی سرعت سے لشکر کے دستے آگے بڑھے اور گھاٹ پر صف بندی شروع کر دی۔ عین خیموں کے سامنے۔

عباسؓ نے نوکروں کو پکارا۔

"جا کر پوچھو تو کیا قصہ ہے۔ یہ کیا بدتمیزی ہے یہاں ہمارے خیمے لگ رہے ہیں۔

اور یہ بے وقوف دھول اڑاتے، دندناتے چلے آ رہے ہیں، جاہل کہیں کے، ان سے کہو ذرا دور ہٹ کر خیمہ زن ہوں۔“

اتنے میں فوج کا سردار آگے بڑھا اور کہا۔

”نہر کے کنارے ہماری فوجیں پڑاؤ ڈالیں گی۔ آپ لوگ ذرا دور ہٹ کر خیمے لگا لیجئے۔“

”تو کیا نہر کا کنارہ آگے نہیں؟ تم آگے بڑھ کر پڑاؤ ڈالو۔ گھاٹ تو کافی دور تک پھیلا ہوا ہے۔“

”یہ پورا گھاٹ فوجی علاقہ کی حدود میں ہے۔“

”کیا مطلب؟ یعنی یہاں سے لے کر وہاں تک؟“

”جی ہاں!“

”تمہیں اگر یہ ٹکڑا زیادہ پسند ہے تو کوئی بات نہیں، ہم آگے بڑھ جائیں گے۔ خیمے پھر سے اکھاڑنے پڑیں گے۔“ عباس کو غصہ تو آیا۔ مگر ضبط کر گئے۔

”آگے بھی سب فوجی علاقہ ہے۔ آپ کو پیچھے ہٹنا پڑے گا، کافی پیچھے۔ فوج کیلئے کافی رقبہ چاہیئے ہوگا۔ دس ہزار کوفے سے آ رہے ہیں۔ پھر شام اور روم سے بیشمار فوجیں آ رہی ہیں۔ ادھر ادھر کے علاقوں سے بھی دستے آ رہے ہیں۔ کہیں سے دو ہزار کہیں سے چار ہزار۔ جگہ کی قلت ہو جائے گی۔ آپ لوگ پیچھے ہٹ کر قیام کیجئے...“

”تیری یہ مجال مردود، ہم پر حکم چلا رہا ہے۔“ ابوالفضل عباسؑ کو غصہ آ گیا: ”تیری تو کیا بساط ہے۔ ہم دم بھر میں تجھے تہس نہس کر کے رکھ دیں گے۔ ہم پر دھونس جماتا ہے؟“

”میں اپنی طرف سے دھونس نہیں جما رہا ہوں۔ مجھے جو حکم ملا ہے۔ بس وہی کہہ دیا۔“

”ہمارے منہ لگے تو پچھتاؤ گے۔ تعداد پہ نہ جانا۔ اصل چیز جرأت اور شجاعت ہے۔ ہم اگر اپنی آستینیں الٹ دیں تو زمین و آسمان تہ و بالا ہو جائیں گے۔ ہم سے الجھنا منہ کی کھاؤ گے۔ ابھی اس نہر کے پہلو میں ایک لہو کی نہر کھینچ دیں گے۔ ہمارے خیمے اسی جگہ نصب ہوں گے اور جو ہم سے ٹکرائے تو پاش پاش ہو جاؤ گے۔“

عباسؑ کا غصہ ضرب المثل تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آتش فشاں پہاڑ پھٹ پڑا۔

فوجیوں کا عجب حال تھا۔ نیزے لٹکے ہوئے تھے۔ تلواریں کھنچی ہوئی تھیں۔ کمانوں پر چلّے چڑھے ہوئے تھے۔ مگر شرم اور ندامت سے سر جھکے ہوئے تھے۔ آنکھیں نیچی تھیں۔ دل دھک دھک کر رہے تھے۔ پیغمبرؐ کے پیاروں کے سامنے جسم لرز رہے تھے۔ دل بیٹھے جا رہے تھے۔ خود اپنے وجود پر لعنت بھیج رہے تھے۔ آلِ رسولؐ کے سامنے تو لاکھوں بھی خاک تھے۔ ڈھالوں کی آڑ میں چھپے جاتے تھے۔

مٹھی بھر تھکے ہارے انسانوں کی اتنی دہشت کہ پہلوانوں کے پسینے چھوٹے جا رہے تھے۔

عباسؑ کی آواز سن کر اور لوگ بھی خیمہ گاہ سے آئے۔ سب کو جوش آ گیا۔ ابن مظاہر نے بڑھ کر کمان میں تیر جوڑا۔ ابو ثمامہ اور ابن سعد نے تلواریں کھینچ لیں۔ قاسمؑ کو جلال آ گیا۔ علی اکبرؑ کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ زینبؑ کے معصوم عون و محمد بھی اپنی تلواریں لینے لپکے۔

یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر فوجیوں کا پتہ پانی ہو گیا۔ اتنا بڑا لشکر جو حملہ کو بڑھ رہا تھا۔ گنتی کے چند جوانوں سے ڈر کر رہ گیا۔

بچے ہنگامے کی خبر سن کر رونے لگے۔ سکینہ نے دہل کر جلدی سے ماں کی گود میں منہ چھپا لیا۔

فضہ نے محل سے جھانک کر پکارا۔

"اے بی بی! غضب ہو گیا۔ ظالم خیمہ پر تیرے بلند کر رہے ہیں۔ عباسؑ ابن علیؑ کو طیش آ گیا ہے۔ اللہ خیر کرے یہ کس نے شیر ببر کو غصہ میں چھیڑا ہے۔ مجسم غیض و غضب بنے آگے بڑھ رہے ہیں؟"

زینبؑ خیمہ نصب ہونے کے انتظار میں ابھی تک محل میں بیٹھی تھیں۔ پریشان ہو گئیں۔ بولیں۔

"بھائی! خدارا کچھ کیجئے" یہ کیا اندھیرا ہے؟ کہیں خون خرابہ نہ ہونے لگے۔ خدارا

ان لڑکوں کو منع کیجیے۔"

حسینؓ ابنِ علیؓ جلدی سے اُٹھے۔ بھائی کو روکا۔

"عباسؓ، جانِ برادر! ہمارا مسلک امن ہے۔ ہم یہاں پناہ لینے آئے ہیں۔ کسی سے جھگڑا مول لینا مقصود نہیں۔"

"ان ملعونوں سے امن اور سلامتی کا رشتہ!" عباسؓ سر سے پیر تک لرز رہے تھے۔ "ہم حق پر ہیں آقا!"

"مگر ہمیں خون بہانے کا حق نہیں۔ یہ ہمارے نانا کی امت ہیں۔ ان پر پہل کرنا حرام ہے۔ جانے بھی دو عباسؓ، یہ احمق ہیں۔ تم شیرِ خدا کے فرزند ہو۔ جو رحم و کرم کا مجسمہ تھے۔ تمہارا ان کا کوئی مقابلہ نہیں۔"

آقا نہر سے دور خیمہ زن ہوتے تو ہمیں یہ کارِ زحمت ہوگی۔"

"ہم ٹھہرے غریب الوطن ہمارے لیے ترائی اور جنگل ایک ہی بات ہے۔ خدا ہر جگہ موجود ہے۔ دور، زبردستی ہمارا شیوہ نہیں۔ رسولِ خداؐ کی پاک روح کا صدقہ، جانے دو عباسؓ۔ واللہ اس وقت تمہیں غصہ میں دیکھ کر بابا کا جلال یاد آرہا ہے۔" حسینؓ گلوگیر لہجہ میں بھائی کو سمجھانے لگے۔ عباسؓ سر جھکائے غصہ پر قابو پانے کی کوشش کرتے رہے۔ چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔ ماہ بنی ہاشم غم و غصہ کی گھٹاؤں کے بادل جھکا تھا۔

"تمہاری نجابت اور خاندانی شان کے سامنے معاذ اللہ ان احمقوں کی بساط ہی کیا ہے۔ تم چاہو تو سکندری کے پرخچے اڑا دو۔ یہ تمہارے ہم پلہ نہیں۔ شیر اور لومڑی کا مقابلہ ہی کیا! بس ہماری یہی خواہش ہے کہ تم دریا کا کنارہ چھوڑ دو، تمہیں جنابِ امیرؓ کی قسم ان بدبختوں کی دیدہ دلیری پر اپنا جی میلا نہ کرو۔"

عباسؓ کو صرف حسینؓ کی میٹھی زبان نے خاموش کر دیا۔ قسم سن کر عباسؓ لرز اٹھے ادب سے سر جھکا دیا اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

حسینؓ نے جان سے پیارے بھائی کو ایک بچہ کی طرح پیار کر کے گلے لگایا۔

"عباسؓ! ایسا بھی غصہ کیا؟ تمہیں اپنے اوپر قابو نہیں؟ باخدا تم کس برے طرح سے لرز

بے ہوا اور آنکھوں میں یہ آنسو! کیا ہم سے کچھ غلطی ہوگئی؟ ہماری باتیں شاق گزریں؟"

"ہرگز نہیں آقا! آپ کا علم میرے لیے حکمِ الٰہی سے کم نہیں" عباسؑ بھائی کے قدموں پر جھک گئے۔

"دیکھو تو تم نے جس غریب کو ڈانٹ بتائی ہے۔ وہ کیسا نیم مردہ ہو رہا ہے!" پھر حسینؑ اس بدحواس سردار کی طرف متوجہ ہوتے اور بڑی نرمی سے پوچھا۔

"کیوں بھائی! کیا قصہ ہے؟"

"یا حسینؑ ابن علیؑ، آپ سے کوئی بات پوشیدہ نہیں۔ فوجی احکامات ہیں۔ اگر بال برابر کا بھی فرق ہوا تو ہمارا پورا دستہ عذاب میں مبتلا ہو جائے گا۔ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ نہر پر اس کنارے سے لے کر اس کنارے تک قبضہ کر لیں۔ اور غیر فوجی کو قریب تک نہ آنے دیں۔ ہم تو حکم کے بندے ہیں سرکار! آپ بتائیے اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟"

"ٹھیک تو کہتا ہے بے چارہ۔" انھوں نے عباسؑ کا بازو تھاما اور چند ساتھیوں کو ایک طرف لے جا کر کہا۔ "وہ مجبور ہے۔"

"مگر یہ سخت ناانصافی ہے۔" علی اکبرؑ کو تاؤ آ گیا۔ "اگر ہم دب گئے تو شیطان اور نڈر ہو جائیں گے۔ ہمارے ساتھ بال بچے ہیں۔ پانی سے دور تکلیف ہو جائے گی۔ یہ نہر بابا نے فاطمہ زہراؑ کے مہر میں دی تھی۔ اس پر ہمارا حق ہے۔"

"ہمارے حق کا اب اللہ ہی حافظ ہے۔ ویسے یہ نہر سب انسانوں کے آرام کیلئے ہے۔ پانی افراط سے ملے تو پھر کیا کہنا ہے۔ پانی سے تو دنیا کا کاروبار چلتا ہے۔ ہم اس پر اپنا حق کیونکر جتا سکتے ہیں۔"

حسینؑ نے نرمی سے کہا۔

"لیکن اگر ہم ان پر اچانک حملہ کر دیں تو ان کا آسانی سے صفایا کر سکتے ہیں۔ کمک آنے سے پہلے ہمارا نہر پر قبضہ ہو جائے گا۔ ان مٹھی بھر سپاہیوں کی ہمارے سامنے کیا حقیقت ہے۔"

حسینؑ تھوڑی دیر سر جھکائے سنتے رہے۔ سوچتے رہے۔ پھر فکر اور غم سے بوجھل آنکھیں اٹھائیں۔ اور آس پاس کھڑے جوشیلے نوجوانوں کو دیکھا، پر دوبار ساتھیوں کے کھنچے ہوئے

پلٹ کر دیکھے پھر کہا۔

"میرا فیصلہ ہے کہ نہر کا ساحل چھوڑ دیا جائے۔ اور فوجی حدود کی پابندی کو تسلیم کر کے خیمے نصب کئے جائیں۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ میں اتنی سی بات پر جھگڑا مول لینا نہیں چاہتا۔ میرے بچو! عزیز دوستو! تم دیکھ رہے ہو، قدم قدم پر ہمارے صبر کا امتحان لیا جا رہا ہے۔ چھیڑا جا رہا ہے، اکسایا جا رہا ہے۔ ہمارے راستے میں جال بچھائے جا رہے ہیں۔ پہلے حر کی گستاخی، پھر ایک معمولی سردار کی زیادتی، واقعی یہ باتیں ناقابل برداشت ہیں۔ ہمارے نوجوانوں کے خون کھول رہے ہیں۔ بزرگوں کے صبر کا پیمانہ چھلک رہا ہے۔ ہمارے دشمن بھی اسی تاک میں ہیں کہ ہم جیالے کب بے اختیار ان سے ٹکرا جائیں۔ پھر ہمارا قتل ہماری زیادتی اور ناعاقبت اندیشی ثابت ہو جائے۔ یہ ہمیں احمق سمجھتے ہیں۔ مگر ہم ان کی چالوں کو سمجھ گئے ہیں۔ ہم ان کے بھانسے میں نہیں آئیں گے۔ قتل حسین، قتل حسین ہوگا۔ اسے کسی حادثہ کا معمولی چوک کی آڑ میں نہیں چھپانے دیا جائے گا۔ عزیز دوستو، میرے پیارے عزیزو! میری منزل موت ہے۔ یقینی موت! اب بھی وقت ہے۔ میرے ساتھ قتل ہونے سے بچنا چاہتے ہو تو مجھے چھوڑ کر خدارا کسی طرف نکل جاؤ۔ یہ لوگ تمہارے جانے سے خوش ہوں گے۔ قطعی مزاحمت نہ کریں گے۔"

"یا حسینؑ! آپ کے ساتھ پائی ہوئی موت ہزار سالہ زندگی سے افضل ہوگی۔ اگر آپ ہمیں نیزے مار بھگائیں۔ تب بھی ہم آپ کے قدموں میں دم توڑ دیں گے۔ مگر آپ سے جدا نہ ہوں گے۔" دوستوں اور ساتھیوں نے جوش سے کہا۔ عباسؑ قدموں پر گر پڑے۔

"معاف کیجئے آقا! میں بڑا ادھورا انسان ہوں کہ میری قوت برداشت جواب دینے لگتی ہے۔ اور میں آپے سے باہر ہو جاتا ہوں کہ میں آپ کی بلندیوں کو نہیں پہنچ پاتا۔ مگر آج آپ کے قدموں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر عباس کے جسم کے ٹکڑے بھی اڑیں گے تو وہ منہ سے اُف نہ کرے گا۔"

"تم تنہا نہیں خود میں اکثر محسوس کرتا ہوں کہ اب میری قوت برداشت جواب دے جائے گی

مگر میں اپنے نفس کو کچل دیتا ہوں۔ یہ نفس کشی ہمارا ورثہ ہے۔ بس میرے دلیرو حوصلہ رکھو ہم پہلا وار کسی صورت میں نہیں کریں گے۔ تاریخ اس بات کی گواہ رہے گی کہ ہم نے امن اور سکون سے رشتہ نہیں توڑا۔"

"آپ ہمارے امام ہیں۔ ہمارے بادشاہ ہیں۔ خدا کرے ہم اس امتحان میں پورے اتریں۔ سب نے کہا۔

"اور تمہارا یہ مفلس اور بدحال بادشاہ اس وفاداری کے انعام میں تمہیں کیا دے سکتا ہے۔ سوائے موت کے ہمارے دامن میں کچھ نہیں۔"

آپ کے قدموں میں مر کے ہم جاوداں ہو جائیں گے۔ یہی ہماری وفاداری کا صلہ ہوگا۔"

"چچا جان! آپ مفلس اور بدحال ہیں۔ تو شہنشاہ آپ کے آگے دستِ سوال کیوں پھیلا رہے ہیں۔!" قاسم نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو قاسم، ہم دنیا کے امیر ترین شہنشاہ ہیں کہ ہمیں خدا نے تم جیسے بیٹے اور غم خوار دیئے ہیں۔ ہماری ریاست کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ یہ بزرگ جو نوجوانوں سے زیادہ جوشیلے اور رنگیلے ہیں۔ یہ نوجوان جو بزرگوں سے زیادہ بردبار اور باشعور ہیں۔ میرے پاس وہ سب کچھ ہے۔ جس کی ایک فاتح کی ضرورت ہوگی۔ یہ شہنشاہ میرے آگے ہاتھ پھیلانے پر مجبور ہیں کہ ان کے دوست کرائے کے ہیں۔ میری فوج سے کون مائی کا لال جیت سکتا ہے۔"

نہر سے چار پانچ سو قدم ہٹ کر ایک مناسب مقام پر خیمے نصب کئے گئے۔ نہر سے دور خیمے لگنے پر بچوں کے دل اداس ہو گئے۔ ساری خوشی خاک میں مل گئی۔ ایک نیا مثالی نہر پہ بسانے کے خواب ریزہ ریزہ ہو گئے۔

پہلا قدم

وہ نوجوان جو آس پاس کی بستی کی تلاش میں گئے تھے۔ لوٹ آئے۔ ان کے ساتھ قبیلۂ بنی سعد کا ایک شریف مرد بھی تھا۔

انھوں نے بتایا کہ وہ بچتے بچاتے لوٹے ہیں۔ ہر چہار طرف سے فوجیں امنڈ رہی ہیں۔ بستی والے سہمے ہوئے اپنے خاندانوں کو لے کر پہاڑوں میں چھپنے بھاگ رہے ہیں۔ شام سے سب سے خوفناک دستہ بس پہنچا ہی چاہتا ہے۔

"شکر اللہ کا۔" حسینؓ نے کہا۔

"دو ہزار سپاہی جنوب کی طرف سے بڑھ رہے ہیں۔ ان کے پیچھے تین ہزار کا دستہ منزلیں مارتا چلا آرہا ہے۔"

"سبحان اللہ!" حسینؓ نے جھوم کر کہا۔

"چھ ہزار قادسیہ سے بڑھ رہے ہیں۔ ادھر حر کا دستہ بھی گھوم کر یہیں والا ہے۔"

"جزاک اللہ!"

"گستاخی معاف یا حسینؓ! آپ جانتے ہیں یہ فوجیں کیوں جمع ہو رہی ہیں؟"

"اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ سب میرے خلاف صف بندی ہو رہی ہے۔"

"اتنی بڑی تعداد میں۔"

"ہاں! یہ تو میری عزت افزائی ہے۔ میرا قتل کوئی کھیل نہیں۔ پوری عرب قوم میری ایک آواز پر اٹھ سکتی ہے۔ شہنشاہ کو یہی خوف ہے جبھی تو وہ اتنا بڑا لشکر جمع کر رہا ہے۔"

"اور آپ بجائے پریشان ہونے کے خدا کا شکر ادا فرما رہے ہیں؟"

"ہاں! میں چاہتا ہوں "قتل حسین" کے جتنے زیادہ گواہ ہوں اتنا ہی اچھا ہے۔"

"ہم جیسے مٹھی بھر مجبور اور لاچار انسانوں کے لیے تو ایک زبردست دستہ کافی ہوتا ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو "قتل حسین" کے لیے تو ایک جلاد ہی کافی ہے۔ مگر پیغمبر خدا کے نواسے کے قتل کے لیے یہ جم غفیر بھی ناکافی ہے۔ ذرا دیکھو تو میری ایک چھوٹی سی فوج کی دہشت دشمن کے دل پر کیسی ہیبت چھائی ہے کہ کونے کونے سے لشکر ٹوٹے پڑتے ہیں۔ اور مجھ کو اطمینان ہے۔"

"دشمن کی کمی پر تو سبھی دعائیں مانگتے ہیں۔ لیکن ان کی زیادتی پر مسرت کا اظہار صرف آپ ہی فرما سکتے ہیں۔" عبداللہ بن سلیم بولے۔

"یہ جو میرے خلاف آ رہے ہیں، یہ میرے دشمن نہیں۔"

"پھر کون ہیں۔"

"کوئی بھی نہیں، انجان ہیں۔ انھیں یہ بھی پتہ نہیں کہ وہ کس کے خلاف فوج کشی کر رہے ہیں۔ سپہ سالاروں کو بھی پتہ نہیں ہوگا کہ ان کا نشانہ میں ہوں۔ عام سپاہی تو بالکل کٹھ پتلی کی طرح ہوتا ہے۔ جس طرف ہانکا جائے۔ ہنک جاتا ہے ایسا بے وقوف سپاہی ڈرنے کی چیز نہیں۔ اس کا تو وجود ہی قابل رحم ہے۔ یاد کرو رسول خدا کی مختصر فوج دو گنی سے فتح یاب ہوئی۔ اس لیے کہ ان کے سپاہی باشعور تھے۔ اپنے اصولوں پر یقین رکھتے تھے۔ اس لیے وہ ظفریاب ہوئے۔"

"ہم بھی کیا ظفریاب ہوں گے؟"

"اگر مجھے اپنی فتح کا یقین نہ ہوتا۔ تو ان فوجوں کی آمد پر خوف سے ہی ختم ہو جاتا۔ لوگ یہ سوچ کر بجائے مطمئن ہونے کے چکر میں پڑ گئے۔ سوائے قریبی عزیزوں کے کوئی "فتح" کے اصلی معنی نہ سمجھ سکا۔ شاید حبیب سے اللہ پاک عین موقع پر کوئی مدد بھیج دے فرشتوں کے لشکر آئیں تو دم بھر میں دشمن کا صفایا کر دیں۔ طوفان نوح کی قسم کا کوئی عذاب نازل ہو۔ اور صرف اللہ کے پیارے صحیح اور سلامت رہ جائیں۔ گناہ گار اور فاسق

ختم ہو جائیں۔

"یہ سب نہ ہوگا۔ میری سچائی اور حق پرستی ہی میری فتح ہے۔ یقین ہی میرا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ تم لوگوں کی محبت اور وفاداری سب سے مضبوط زرہ بکتر ہے۔ میں تو بس اتنا چاہتا ہوں کہ جو کچھ میرے ساتھ ہوا ہے زیادہ سے زیادہ انسان دیکھیں اور حسینؑ کے خون کے دھبے یزیدیت کے دامن پر دیکھیں۔ اور اس لہو کی سرخی کو یاد رکھیں۔

ابن مظاہر کی آنکھ سے آنسو جاری ہو گئے۔

"یا حسینؑ! یہ خوف یا غم و غصہ کے آنسو نہیں۔ انتہائی خوشی میں میری آنکھیں سیراب ہو گئیں۔ واللہ مجھے اپنی خوش بختی پر ناز ہے۔ اب مجھے پتہ چلا کہ یزید کیوں تم سے اس درجہ خائف ہے۔ معاذ اللہ! کیا عظیم الشان جنگ ہوگی۔ اب میں اس جنگ کی اصلیت کو سمجھ رہا ہوں۔ حسینؑ کے دشمن ذہنی طور پر نادار ہیں اور برہنہ ہیں۔ ہمارے قتل کا ان کے پاس کوئی جواز نہیں۔ عرب قوم کی نظریں رسول اللہؐ کے نواسے پر لگی ہوئی ہیں۔ خلیفۂ وقت سرپٹخ رہے ہیں۔ جھلا رہے ہیں۔

"دیکھو بھئی حسینؑ ابن علیؑ نے ان کی بیعت سے انکار کرکے ان کے وقار کو دھکا لگایا ہے ان کی خلافت پر شبہ پڑنے لگا ہے۔ لوگ آج منہ سے کہنے کی جرأت نہیں رکھتے مگر وہ بالکل مطمئن بھی نہیں ہوئے۔ پراگندہ ہو رہے ہیں۔ لیکن آج نہیں تو کل وہ اپنے خیالات سمیٹ سکتے ہیں۔ آج یہ جرأت نہ رکھتے ہوں کہ حسینؑ حق پر ہیں۔ لیکن کل وہ کیا سوچ سکیں گے۔ اس پر یزید کو بھروسہ نہیں۔ وہ ہمارے تخیل کی پرواز کو روکنا چاہتے ہیں۔ ہمارے ذہنوں کو مقید رکھنا چاہتے ہیں۔ ہم اس کے لیے تیار نہیں۔ اور یہ بات یزید کے حق میں نہیں۔

"دوسرا قدم"

زینبؓ بنتِ علیؑ نے سنا کہ قبیلہ بنی سعد سے حسینؑ نے کچھ زمین خرید لی ہے۔
تو بہت خوش ہوئیں۔
"اب تک طبیعت اکھڑی ہوئی تھی۔ اب دل جم گیا۔ یہ بیاباں بھی وطن لگنے لگا۔
یہ خیموں ڈیروں میں کب تک پڑے رہے ہیں۔ مکانات بننے کا کوئی سبیل ہونا چاہیے۔
سجاد کے لیے تو کتب خانے سے ملحق مکان بن جائے گا۔ میرے اکبر کو بھی ایک قطعہ دیجئے
پانی کی قلت نہیں۔ میں ابھی سے باغ کی بنیاد ڈالوں گی۔ مکان بعد میں بنتا رہے گا۔ پہلے
باغ ہی لگ جائے۔ یہ زمینیں آگے بڑھیں تو قطعہ خالی نہ ہو۔ بس ذرا بنیاد پڑ جائے۔
پتھر اور لکڑی کی بھی کمی نہیں۔ وطن سے میں کھجوریں لاتی ہوں۔ ان کی گٹھلیاں بو دی
جائیں گی۔ وطن کا لطف آجائے گا۔ . . . . مگر بھیا دیکھئے، اکبر کے لیے جو قطعہ تجویز کریں
وہ نہر کے رخ پر ہو۔ میں چاہتی ہوں خیر سے جلدی ہی ان کی دلہن بیاہ لاؤں۔"
"یہ زمین تمہارے لیے۔ نہیں۔ جسے جتنی زمین کی ضرورت ہو گی۔ اتنی مل
جائے گی۔ کون جانے کیا ہونے والا ہے۔ ویسے تو دنیا میں بس دو گز زمین ہی
کافی ہوتی ہے۔"
زینبؓ کا دل دھک سے ہو گیا۔ اللہ علی اکبرؓ کو پھلنا پھولنا نصیب کرے۔
ان کے دشمنوں کو دو گز زمین نصیب ہو۔ مگر حسینؑ کو فکرمند دیکھ کر خاموش ہو گئیں۔
بچوں نے تو تھوڑی دیر نہر کے چھن جانے کا غم کیا۔ پھر سب بھول بال لڑکیوں
کے سنگ اچھل کود میں مگن ہو گئے۔ ان کے دم سے جنگل میں بہار آگئی۔ بچوں کی

مسرت بھری کلکاریاں سن کر حسینؑ کے ڈوبتے دل کو سہارا مل گیا۔ لوگوں نے کتنا کہا بچوں اور عورتوں کو سفر میں نہ لے جایئے۔ مگر ان بچوں کے بغیر دنیا سونی تھی۔ وہی تو ان کا سہارا تھے۔ نہیں بچوں کی جانوں کو کوئی خطرہ نہ ہوگا۔ انھیں حسینؑ سے پرخاش ہو سکتی ہے۔ بچے تو معصوم ہوتے ہیں۔ اسلام نے عورتوں اور بچوں کو بڑی وقعت دی ہے، ان پر آنچ نہ آئے گی۔

ادھر یہ سیدھا سادھا گھریلو ماحول تھا۔ اُدھر نہر کی ناکہ بندی کے بعد بھی لشکر پہ لشکر چلے آ رہے تھے۔ کوسوں کھلے ہوئے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ جہاں تک نظر جاتی تھی۔ سیاہی پھیلی ہوئی تھی۔ رات بھر آمد جاری رہی۔ صبح ہوتے ہوتے میدان دشمن کی فوج سے بھر گیا۔

"حسینؑ ابن علیؓ" کی آمد کی خوشی میں جو ندی فخر اور غرور سے چڑھ آئی تھی،' کچھ مردہ دل سی ہو کر اُترنے لگی۔ موجوں نے سسکیاں بھر کے دم توڑ دیا۔ اور بگولے مست بھوتوں کی طرح رقص کرنے لگے۔

حسینؑ کی فوج کی کیا دہشت تھی کہ اتنی بڑی فوج کا دم سوکھا جا رہا تھا۔ اور کمک طلب کی جا رہی تھی۔ شام سے ابن سعد بھی اپنی تازہ دم فوج لے کر آن پہنچے ان کے جلو میں رومی اور شامی چیل تن تھے۔ جن کے دلوں میں نہ موت کا ڈر نہ خوف خدا کمینی صورتیں، پُرشکن پیشانیاں، روسیاہ اور بدبخت، نیزے اٹھائے، تلواریں سونتے امنڈے چلے آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ روٗسائے شام تھے۔ زریں لباس زیب تن کئے۔ عربی نسل کے تنومند گھوڑوں پر سوار، ان کے ساتھ غلاموں اور خادموں کے جمگھٹ تھے۔ رنڈیوں باندیوں سے بھرے محمل تھے۔

طبلِ جنگ کی گرج سے میدانِ کربلا کانپ رہا تھا۔ ڈنکے کی چوٹ آسمان کا کلیجہ چیرتی گونج رہی تھی۔

ابن سعد جونہی گھوڑے سے اترے۔ ذکر چار چہترے کر چکے۔ انھوں نے پہلے تو فوج پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالی۔ پھر پوچھا۔

"پھر بر تو اپنا قبضہ ہے!"

"جی ہاں! ہمارے آنے سے پہلے ہی حسینؓ کا قافلہ یہاں پہنچ گیا تھا۔ خیمے نصب کر لیے تھے۔ ہم نے بڑی مشکل سے پیچھے ہٹایا۔ عباسؓ تو شیر کی طرح بپھر گئے۔ مرنے مارنے پر تیار ہو گئے۔" غول نے کہا۔

"پھر تم نے موقع سے فائدہ کیوں نہ اٹھایا۔ قصہ ختم کرکے ہم اطمینان کی نیند سوتے۔"

"گرما گرمی سے کچھ امید تو بندھ گئی تھی، لیکن حسینؓ نے سب کو سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کر دیا اور معاملہ وہیں ختم ہو گیا۔"

"حسینؓ ابن علیؓ کا خیمہ کدھر ہے؟"

"وہ سامنے جو زنگاری رنگ کا خیمہ نظر آ رہا ہے۔ بس وہی ہے۔"

"بڑی ناہموار زمین ہے۔ بڑی تکلیف میں ہیں۔ دریا سے بھی کافی دور ہیں۔ ہوا کے بھی رخ پر نہیں۔ کل رات بڑی بے چینی سے گزری۔ بچے ہلکان ہو کر روتے بلکتے رہے۔"

"امام کی فوج کتنی ہے؟"

"فوج کیا ہے، بس گنتی کے آدمی ہیں۔ تو مضبوط اور جوان تو بس انگلیوں پر۔ زیادہ تر بچے اور عورتیں ہیں۔"

"تو کیا یہ سب غلط سنا تھا کہ بہت بڑی فوج ہے۔ بڑے معرکہ کی جنگ ہونے والی ہے۔"

"کہاں کی فوج اور کیسی جنگ۔ راستے میں بے شک بے شمار لوگ ساتھ ہو لیے تھے۔ مگر جوں ہی حر کا لشکر پہنچا اور لوگوں کو کوفہ کی حقیقت معلوم ہوئی کہ حسینؓ حکومت بنانے نہیں، موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔ آہستہ آہستہ سب کھسک لیے۔ بس بیٹے، بھائی، بھتیجے، بھانجے اور چند دوست رہ گئے۔ یہ کیا ہمارے ہاتھ ٹھہر سکیں گے۔ جنگ چھڑے گی تو ہمارے گھوڑوں کی ٹاپوں ہی سے پس کر رہ جائیں گے۔"

"ہماری کل فوج کتنی ہوگی؟"

"بے حساب، گنتی دشوار ہے۔ سب سوار کوئی چار کوس کے گھیرے میں پھیلے ہوئے تھے۔ ایک ایک جوان ہیں تن پہنچا ہے۔ میدان کارزار کا سمجھا ہوا سپاہی کا کون ڈھکنے کا ہم سے، قیامت کی فوج ہے ہماری! ایک طرف سمندر کی خون خوار موجیں سوار تھیں۔ تو دوسری طرف بے پناہ پیدل۔ نیزوں اور بھالوں کے دل الگ ہیں۔ کتنی ہزار تلواریں اور اتنے ہی برچھا بردار جانے ہوں گے۔"

اور یہ سب رسول خدا کے بے کس نواسے کا خون بہانے کی تاک میں تھے۔ تیر و تلوار کھینچے کھڑے تھے۔ یہ فوج ان لوگوں کو دہشت زدہ کرنے کے لیے بھیجی گئی تھی جن کی طرف سے خطرہ تھا کہ حسینؑ کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوں گے۔

حُر اپنے گھوڑے پر بیٹھا بیٹھا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس کا دل اندر ہی اندر ملامت کر رہا تھا۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟

ابن سعد نے اطمینان سے مسکرا کر نہر کی طرف نظر ڈالی۔ ڈھالوں سے میدان سیاہ ہو رہا تھا۔ خنجر چمک رہے تھے۔ نیزوں کے جیسے کھیت اُگے ہوئے تھے۔ نہایت غرور سے مسکرا کر کہا۔

"کل تک شام سے اور کمک آ جائے گی۔ امید ہے کہ یہ سب دیکھ کر امام بیعت پر راضی ہو جائیں گے۔ جنگ کی نوبت ہی نہ آئے گی۔"

"انداز سے کوئی امید تو نظر نہیں آتی کہ حسین اپنی ہٹ سے باز آ جائیں گے۔ وہی غرور قائم ہے۔ بیعت پر تیار نہیں۔ موت کو ترجیح دیتے ہیں۔"

ابن سعد پیچ و تاب کھانے لگے۔

"اب اس ہٹ دھرمی کا کیا علاج، بس اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ انھیں پیاسا مار دیا جائے۔ پانی کی ایک بوند نہ دی جائے۔ پھر ذرا ہم ان کی قوت برداشت دیکھیں گے۔ بغیر پانی کے دیکھنا ہے کہ ان کی ضد کہاں تک قائم رہتی ہے۔"

فوج پہ فوج چلی آ رہی تھی۔ شور و غل بڑھتا جا رہا تھا۔

محرم کی چوتھی تاریخ سے پانی پر پابندی عائد ہوگئی۔ مگر نہایت ہوشیاری سے نوکر چاکر پانی لینے جاتے تو کہہ دیا جاتا: "ابھی فوج کے لیے پانی لیا جارہا ہے۔ گھاٹ پر بہت بھیڑ ہے، ذرا ٹھہرو۔"

نوکر بیٹھے بیٹھے عاجز آجاتے۔ بڑی مشکل سے چھین جھپٹ کے تھوڑا بہت لے جاتے۔ باقی خالی ہاتھ لوٹ جاتے۔ دھینگا مشتی کرکے ان کے مشکیزے پھاڑ دیے جاتے۔ وضو اور غسل کے لیے پانی کی قلت ہوگئی۔ ابھی پانی پر مکمل پابندی نہیں تھی۔

پانچ تاریخ کو عباسؓ خود چند ساتھیوں اور خادموں کو لے کر گئے۔ انھیں دیکھ کر سپاہیوں پر ہیبت طاری ہوگئی۔ اس وقت اتفاق سے پہرہ بھی ناکافی تھا۔ کوئی مزاحمت نہ ہوئی۔ اور کافی پانی آگیا۔ مگر حسینؓ سمجھ گئے۔ اب دشمن عربوں کی پرانی چال چلنے والا ہے۔ اور پانی پر سخت پابندی لگ جائے گی۔ انھیں اس کمینہ پن کی مسلمانوں سے امید نہ تھی مگر ڈر ضرور تھا۔ اس لیے حکم دے دیا کہ پانی بڑی احتیاط سے برتا جائے۔ ایک بوند ضائع نہ کی جائے۔

مگر ایک تو ریگستان، اوپر سے بلا کی گرمی۔ صرف پینے کے لیے اور وضو کے لیے کتنا پانی چاہیے تھا۔ غسل کا تو سوال ہی نہ تھا۔ عباسؓ جو پانی لے گئے تھے۔ اس کے بعد پہرہ داروں پر بڑی سختی ہوئی۔ پہرہ اور بڑھا دیا گیا۔ اور حکم دے دیا گیا۔ کہ اب پانی بالکل نہ دیا جائے۔

دریا کا بھی جیسے خون خشک ہو رہا تھا۔ دم بدم پیچھے ہٹ رہا تھا۔ کنارہ سپاہیوں کی خرمستیوں سے اتنا گندہ ہوگیا تھا کہ وہاں کا پانی چھونے کے قابل نہیں رہا تھا۔ پینے کا پانی لینے کے لیے بیچ دھارے تک جانا پڑتا تھا۔

پانچ تاریخ کا تھوڑا سا پانی شام تک چلا۔ پھر چھ تاریخ کو دن بھر چلا۔ ساتویں کو بھی مل گیا۔ مگر آٹھویں کو صرف گھونٹ گھونٹ تھا۔ صرف بچوں کے لیے رہ گیا۔ پانی کی قلت شدت سے محسوس ہونے لگی۔

عباسؓ اور چند ساتھیوں نے لڑنے کا ارادہ کیا۔ مگر حسینؓ نے روک دیا۔

"یہی تو وہ خدا سے چاہتے ہیں کہ ہم مجبور ہو کر ان سے بھڑ جائیں۔ بس پھر انھیں بہانہ مل جائے گا۔ تاریخ میں صرف اتنی خبر پہنچے گی کہ حسینؓ نے پانی پر ہنگامہ کیا اور بات بڑھ گئی۔ میں یہ بہانہ انھیں ہرگز نہیں دوں گا۔"

مگر آٹھویں تاریخ سے تو لوگ پانی پانی پکارنے لگے۔ پیاس کی شدت ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی ہے۔ سوائے آنسوؤں کے اور کوئی پانی کا سلسلہ نہ تھا۔

یہ بات دنیا جانتی ہے کہ ابو الفضل عباسؓ اپنے بھائی حسینؓ کے دستِ راست تھے حسینؓ کو ان پر حد سے زیادہ بھروسہ تھا۔ کئی بار پہلے بھی انہیں طرح طرح کے لالچ دیئے گئے کہ وہ حسینؓ کو چھوڑ کر کوئی شاندار سرکاری عہدہ سنبھال لیں۔ مگر انہوں نے بڑی حقارت سے اس رشوت کو ٹھکرا دیا۔

لیکن اب معاملہ کچھ اور تھا۔ عباسؓ بال بچوں والے تھے۔ اس وقت خیموں میں پانی کی قلت تھی اس وجہ سے سب کی جان لبوں پر آئی ہوئی تھی۔

شمر ذی الجوشن عباسؓ کی والدہ ام البنینؓ کا رشتہ کا بھائی لگتا تھا۔ اس حساب سے وہ عباسؓ کا ماموں لگتا تھا۔ اس نازک وقت میں اس نے آخری ضرب کا منصوبہ بنایا۔ وہ کوفہ سے عباسؓ اور ان کے تینوں بھائیوں عبداللہؓ جعفر اور عثمان کے لیے معافی نامے ساتھ لے کر آیا تھا۔ تاکہ مناسب وقت پر انہیں استعمال کر سکے شمر نے قاصد کے ذریعے عباسؓ کو ایک خط بھیجا۔ اس میں لکھا تھا

"تم کیوں خواہ مخواہ اپنے پیارے اہل و عیال کی جان خطرے میں ڈال رہے ہو۔ موقع پاکر انہیں لے کر نکل جاؤ۔ میرے پاس آجاؤ۔ میں تمہیں نہایت آرام سے دمشق پہنچا دوں گا۔ جہاں دنیا کی نعمتیں تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔ تمہارے تینوں بھائیوں کا بھی مکمل انتظام ہو جائے گا۔ میرے پاس تم سب کے معافی نامے موجود ہیں۔ اپنی بوڑھی ماں کا خیال کرو اور فوراً نکل آؤ۔ کچھ گڑبڑ ہوئی تو فکر نہیں۔ ہم سب سنبھال لیں گے۔"

خط پڑھ کر عباسؓ مارے طیش کے تھر تھر کانپنے لگے۔ جی چاہا قاصد ملعون پر

ہی سارا غصہ اُتار دیں۔ مگر ضبط کر گئے۔ خط کے ٹکڑے کر کے اس کے منھ پر دے مارے اور کہا۔

"جا اپنے آقا سے کہہ دے عباسؑ ابن علیؑ تجھ پر اور تیری دنیا پر تھوکتا بھی نہیں۔ ہم چاروں حسینؑ کے بھائی نہیں غلام ہیں۔ اور تیری مہربانیوں کو ٹھکرا کر ان کے قدموں میں جان دینا اپنی خوش قسمتی سمجھیں گے۔"

حسینؑ نے سنا تو بلا کر سمجھایا۔

"عباسؑ! اس نے تمہیں بلایا ہے۔ تم چاروں بھائی جا کر مل تو آؤ۔ اس میں کوئی ہرج نہیں۔ شاید کوئی بہتری کی صورت نکل آئے۔ کیوں کوئی کسر اٹھا رکھیں۔"

"یہ ہم سے نہ ہو گا، آقا! ہم آپ کا حکم ماننے سے قاصر ہیں۔"

"یہ حکم نہیں میری ذاتی رائے ہے۔ میرے ضمیر پر بڑا بوجھ ہے۔ میری وجہ سے تمہاری جان بھی خطرے میں پڑ رہی ہے۔"

"میں اس گستاخی پر مجبور ہوں۔ آپ کے اس حکم کی تکمیل میرے لیے ممکن نہیں۔"

"ہماری خاطر چلے جاؤ۔ اپنے ساتھ سکینہ کو بھی لے جاؤ۔ اگر ہو سکے تو عون و محمد کا بھی ہاتھ پکڑ لو۔ یہ موقع ہاتھ سے نہ جانے دو۔"

"ہم کسی صورت میں آپ کا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔ عون و محمد اور سکینہ کی جانیں بچانے کا لالچ بھی ہمیں ارادہ بدلنے پر تیار نہیں کر سکتا۔"

"اچھا اتنا تو کرو گے۔ ایک بار جا کر مل آؤ۔ وہ جواب جو مجھے دے رہے ہو۔ شمر کو دے آؤ۔ میری آرزو ہے۔ اسے نہ ٹھکراؤ۔"

عباسؑ کانپ اٹھے اور سر جھکا لیا۔

چاروں بھائی گھوڑوں پر سوار ہوئے اور دشمن کے پڑاؤ کی طرف بڑھ گئے۔

شمر خوشی سے جھوم اٹھا۔ اگر عباسؑ کو توڑ لیا۔ تو باقی ماندہ میں کتنا دم ہے۔ حسینؑ تن تنہا رہ جائیں گے۔ جب حسینؑ کے ان بھائیوں کو دربار سے انعام و اکرام ملیں گے۔ تو برسوں کے دور میں حسینؑ اور ان کے خاندان کے بارے میں جو جوش ملا ہے

ن کی چمک دمک ماند پڑ جائے گی۔

مگر جب ان چاروں کو معافی نامے دیئے گئے تو پھاڑ کر پھینک دیئے۔ شمر نے بالکل برا نہ مانا، ہنس کر بولا۔

"تمہاری مرضی، مگر تم جب چاہو۔ بغیر معافی نامے کے میری حفاظت میں چلے آؤ۔ میں تمہارا ہوں۔"

ادھر شمر نے ایک اور چالاکی کی۔ حسینؓ کے خیمے میں یہ خبر اڑا دی کہ عباسؓ دشمن کی فوج سے جا ملے۔ یہ سنتے ہی ان کی بیوی زار و قطار رونے لگیں۔ حسینؓ نے انھیں سمجھایا

"پریشان نہ ہو عزیزہ، عباسؓ کا بال بیکا نہ ہوگا۔ تم سب کی جانیں بچ جائیں گی۔"

عباسؓ کی بیوی اور بھی رونے لگیں۔

"آپ کے بھائی گئے؛ وہ جانیں اور ان کا ضمیر! مگر اس کے بعد میں اپنے آپ کو بیوہ اور بچے کو یتیم سمجھوں گی۔ حیف ہے وہ میرے بھائی کے قاتلوں سے سمجھوتا کر بیٹھے۔ اگر ایسا ہے تو خدا مجھے ان کی صورت نہ دکھلائے۔"

چھوٹی بھاوج جو بہو کی طرح حسینؓ کا ادب کرتی تھیں۔ کبھی ان کے سامنے سر اٹھا کر بات کرنے کی ہمت نہ کی۔ اس وقت جلال سے چہرہ تمتما رہا تھا۔ اور بلند آواز سے کہہ رہی تھیں

"نہیں، مجھے ایسا سہاگ نہیں چاہیے۔ وہ آپ کے لاڈلے بھائی جو ہوئے آپ تو ان کی غداری کے لیے بھی کوئی عذر ڈھونڈ نکالیں گے۔ لعنت ہے ایسی زندگی پر جو آپ جیسے بلند مرتبہ بھائی سے غداری جائے۔"

وہ جوش میں بول رہی تھیں۔ حسینؓ سمجھا رہے تھے۔

"تم زنوں کی تکلیف سوہان روح ہے۔ اجازت ہی نہیں۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں، ننھے بچہ پر اللہ رحم کرو، جس کی جان بچتی ہے۔ بچ جانے دو۔"

گستاخی معاف، ایک بات عرض کروں۔"

"بھیا، کسی بھی شرط پر تمہاری جانیں بچتی ہیں۔ بچ جائیں۔"

"آپ ان کے ہی نہیں، میرے بھی آقا ہیں۔ اگر میں پوچھوں کہ آپ کس شرط پر زندہ

ہاتھ پر بیعت کرنے پر تیار ہو جائیں گے۔ تو آپ کا کیا جواب ہوگا؟"

امام نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

"تو پھر آپ ہمیں فرض سے کوتاہی کرنے کا حکم کس دل سے دے رہے ہیں؟"

وہ جوش میں برسے چلی جا رہی تھیں۔ انھیں پتہ بھی نہ چلا اور عباسؑ خیمہ کا پردہ اٹھا کر اندر داخل ہو گئے۔ امام کی نظریں بھائی کی نظروں سے ٹکرائیں اور جھک گئیں۔ مگر دل خوشی سے جھوم اٹھا۔

"واللہ ایک لمحہ کو بھی یقین نہ آیا کہ عباسؑ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ میں تو بس جی کے بہلانے کو کہہ رہا تھا کہ کاش ایسا ہو جائے۔ نہیں نہیں عباسؑ تمہارا وجود تو پانی سے زیادہ اہم ہے۔"

"یقین تو مجھے بھی نہیں آیا تھا کہ شیر خدا کے فرزند کے قدم ڈگمگا سکتے ہیں۔ یہ جبر ا سر جھوٹا ہے۔ میرے سرتاج اگر واپس نہیں لوٹے تو گرفتار کر لئے گئے ہوں گے؟"

"عباسؑ کو گرفتار کرنے والا ابھی پیدا نہیں ہوا۔" ان کی بیوی چونک پڑیں پلٹ کر دیکھا۔ چاہا بڑھ کر ان کی باہوں میں سما جائیں۔ لیکن امام کی موجودگی میں جھجک کر رہ گئیں۔

"اتنے سال کا ساتھ ہے۔ اور حیرت ہے کہ ہماری بیوی نے ہمیں پہچاننے میں غلطی کی۔"

"نہیں عباسؑ اس بیچاری کا قصور نہیں۔ ہم اسے آزما رہے تھے۔ دل کا عجیب حال ہے۔ کاش تم کسی طرح بچ جاؤ۔ مگر تمہارے چلے جانے کے تصور سے ہمت جواب دینے لگتی ہے۔ یہ انسانی خصلت کا تضاد ہے۔

امام کے چلے جانے کے بعد عباسؑ نے بیوی کو باہوں میں سمیٹ لیا۔ "ہمیں نہیں معلوم تھا کہ ہماری دلربا اتنی دلیر ہے۔ تم نے آقا کو بڑا خوبصورت جواب دیا۔ ہمارا دل رقص کرنے لگا۔۔۔۔۔۔ کتنی دفعہ دل میں خیال آیا کہ تمہیں کسی محفوظ مقام پر پہنچا دوں۔"

تمہاری باہوں سے بڑھ کر محفوظ مقام کیا ہوگا۔ مگر یہ مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میں نے

تمہاری نیت پر لمحہ بھر کے لیے شک کیا۔"

"مگر اس شرط کی طرف سے آقا کی محبت تھی۔ جو تمہارے دل میں مجھ سے کم نہیں۔"

تھوڑی دیر کے لیے دونوں بھول گئے کہ یہ میدان جنگ ہے۔ چاروں طرف دشمن نیزے تانے کھڑے ہیں۔ ان کی دنیا میں بس وہی رہ گئے۔

آخری شمع

نویں تاریخ آلِ حسینؑ پر وہ قہر ہے کہ الامان! بچوں میں اب رونے کا بھی دم نہ رہا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے، خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے پھر غشی طاری ہو جاتی۔ ماؤں کا دودھ خشک ہو چکا تھا۔ جھولے میں چھ ماہ کا نازک بچہ کے معصوم، اصغرؑ پیاس سے نڈھال تھا۔ عباسؑ کا نورِ نظر تڑپ رہا تھا۔ سکینہ بلک بلک کر دم بخود خاموش سہم کر رہ گئی تھیں۔ خیموں کے باہر تو آگ برس رہی تھی۔

شام ہوتے ہی ابن سعد نے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اور حسینؑ پر حملہ کر دیا۔ حسینؑ عصر کی نماز کے بعد خیمے کے دروازے پر تلوار کا سہارا لئے گھٹنوں پر سر رکھے کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کچھ تھکان سے نیند کا غلبہ تھا۔ کچھ پیاس کی بے ہوشی طاری تھی۔ اچانک حملہ ہو گیا۔ ابنِ سعد نے پہلے پہ تیر جوڑ کر آلِ رسولؐ کے خیموں کی طرف مارا اور چلایا۔

"گواہ رہنا، پہلا تیر میں نے ہی مارا" سب نے اس کی بہادری اور جواں مردی کی خوب جی کھول کر داد دی۔ گھوڑوں کی ٹاپوں سے میدان کربلا ہلنے لگا۔ فوج کا شور سن کر زینبؑ گھبرا گئیں۔

"بھائی حملہ ہو گیا!"

امام نے چونک کر آنکھیں کھولیں بہن کو تسلی دی۔

"خاموش رہو زینبؑ، یہ حواس کھونے کا وقت نہیں۔ ابھی میری جو آنکھ لگ گئی۔

تو خواب میں دیکھا نانا جان کھڑے ہیں۔ کہہ رہے ہیں "حسینؑ کب آ رہے ہو؟"

زینبؑ منہ ڈھانک کر رونے لگیں۔ اتنے میں عباسؑ بھی آ گئے۔

"کیا حکم ہے آقا؟"

"قربانت شوم، ذرا جا کے ان لوگوں سے پوچھو، یہ اچانک حملہ اور وہ بھی بچوں اور عورتوں کے خیموں پر یہ عرب قوم کی رسم تو نہیں۔ اعلانِ جنگ کی بھی توفیق نہ ہوئی۔ ایک دم حملہ کر دیا۔"

عباسؑ نے بیس سوار لیے اور دشمن کی طرف چلے، انھیں آتا دیکھ کر لشکر نے ہاتھ روک لیے۔ سمجھا شاید صلح کا پیغام لے کر آ رہے ہیں۔ کسی کا دل اس جنگ میں تھا۔ سب کچھ عاجز سے ہو رہے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی جنگ تھی۔ صلح کا بہانہ پا کر [illegible]

"کیا چاہتے ہو!" عباسؑ نے کہا۔

"امیر ابن زیاد کا ابھی حکم آیا ہے کہ حسینؑ بن علیؑ بن ابی طالب سے خلیفہ کی اطاعت کرنے کا مطالبہ کیا جائے۔ اگر انکار کریں تو وقت ضائع کرنے اور تاخیر کرنے سے کیا حاصل، جلد از جلد فیصلہ ہو جانا چاہیے۔"

"ذرا صبر کرو، میں تمہارا پیغام اپنے امام کو پہنچا کر ابھی ان کا جواب لاتا ہوں۔"

عباسؑ سرپٹ گھوڑا دوڑاتے واپس پلٹے۔ جو اصحاب ساتھ گئے تھے۔ وہ وہیں ٹھہرے رہے۔ یہ رہتی بات چل نکلی۔ حبیب بن مظاہر فوجیوں کے ایک ممتاز گروہ سے کہنے لگے۔

"یہ تم لوگ کیا کر رہے ہو۔ پیغمبر خداؐ کے پیارے نواسے کو قتل کرنے کے منصوبے بنا رہے ہو۔ للہ کچھ تو سوچو سمجھو، حسین اللہ کے نیک بندے ہیں۔ ان گنت خوبیوں کے مالک، عبادت گزار اور پرہیزگار۔ انھیں کس جرم میں قتل کر رہے ہو؟"

"انھوں نے بیعت سے انکار کیا۔"

"بیعت سے انکار جرم نہیں۔ بیعت نام ہے آزاد رائے کا جس کا جی چاہے کرے ورنہ انکار کر دے۔ بارہا ایسا ہو چکا ہے۔ کچھ لوگوں نے بیعت نہیں کی۔ ان سے کبھی

مزاحمت نہیں کی گئی؟"

"یہ ہم نہیں جانتے، ہم فوجی ہیں۔ سیاست داں نہیں۔" انہوں نے کچھ تردد کے بعد جواب دیا۔

"خلیفہ کو اکثریت کی بیعت حاصل ہے۔" عمر بن سعد نے جواب دیا۔

"اگر اکثریت خلیفہ کے ساتھ ہے۔ تو پھر وہ ایک حسینؑ کی بیعت پر کیوں مصر ہیں؟"

"آپ یہ سوال ہم سے کیوں کر رہے ہیں؟"

"کیونکہ وہ تلواریں جو حسینؑ کے خلاف اٹھ رہی ہیں تمہارے ہاتھوں میں ہیں۔ خدا کو کیا منہ دکھاؤ گے؟"

عذرہ بن قیس نے جھلا کر کہا، "حبیب تم کو کبھی علیؑ اور آل علیؑ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی۔ تم تو عثمانی جماعت سے تعلق رکھتے ہو۔ تم کیوں حسینؑ کے پیچھے اپنی جان کے دشمن ہو گئے۔ تم تو شام والوں کے ہم خیال ہوا کرتے تھے۔ اس عجیب و غریب تبدیلی کی وجہ؟"

حبیب ابن مظاہر تھوڑی دیر سوچتے رہے پھر بولے۔

"تم ٹھیک کہتے ہو تو سوچتا ہوں، واقعی مجھے حسینؑ سے دشمنی نہ سہی کبھی کوئی خاص عقیدت بھی نہ تھی۔ نہ میں نے انہیں بلانے کے لیے خط لکھے۔ نہ کبھی ان کی حمایت میں آواز اٹھانے کا خیال آیا۔"

"پھر اس کی کایا پلٹ کی وجہ؟"

"راستہ میں ملاقات ہو گئی۔ انہیں دیکھ کر بے ساختہ رسول اللہؐ یاد آ گئے۔ وہ حسنؑ و حسینؑ سے کس درجہ محبت کرتے تھے۔ اور جب حسینؑ نے بتایا کہ حالات کس درجہ ان کے خلاف ہیں۔ تو میرا جی نہ مانا کہ منہ چھپائے بیٹھا رہوں۔ اور میرے آقا کے نواسے یوں صحراؤں کی خاک چھانیں۔ پھر جب حسینؑ نے ساتھ چلنے کو کہا تو جی نہ مانا اور بخوشی تیار ہو گیا۔ بس اتنی سی کہانی ہے۔"

"مگر ہم نے تو سنا ہے حسینؑ بھاگ [illegible] فوج جمع کرنے کے ساتھ آنے والوں کو بھگا گ

ثنا دیتے ہیں۔ وہ آپ کو کیوں ساتھ آنے کی دعوت دیتے۔ جبکہ آپ معاف کیجئے گا۔ اتنے ضعیف بھی ہو چکے ہیں۔ کوئی خاص معرکہ تو سر نہ کرلیں گے۔"

"ہاں یہ بھی تم ٹھیک کہتے ہو۔ مگر ضرور کوئی مصلحت ہوگی۔ اور رہی میرے بڑھاپے کی بات تو اگر حسینؓ مجھے نکما سمجھتے تو ساتھ کیوں لاتے اس لیے ضرور کوئی خاص بات ہے جو انہوں نے مجھے منتخب کیا۔ خیر تم خاطر جمع رکھو، اس بڑھاپے میں بھی تم جیسے روباہ خصلت پہلوانوں کے چھکے چھڑا سکتا ہے۔"

"ارے اس بڑھاپے میں تو گھر میں بیٹھ کر عبادت کیجئے۔"

"حسینؓ جیسے انسان پر جان قربان کرنا خود ایک عظیم عبادت ہے۔ وہ انسانی حقوق جو خدا نے انسان کو سونپے ہیں۔ اگر کوئی شیطانی صفت ہم سے چھیننا چاہے اور ہم دم سادھے بیٹھے رہیں۔ یہ ہماری بزدلی اور نکمے پن کا ثبوت ہوگا۔"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ عباسؓ آ گئے۔

"امامؑ فرماتے ہیں کہ شب بھر کی مہلت دو۔ صبح جو جی میں آئے کرنا تمہیں اختیار ہوگا۔"

شمر ذی الجوشن کو عمرو بن سعد پر جاسوسی کرنے کے لیے تعینات کیا گیا تھا۔ کہ اگر ان کے رویے میں ذرا بھی نرمی نظر آئے تو فوراً ان کے خلاف حفاظتی قدم اٹھا لیے۔ انہیں شمر کی صورت سے وحشت ہو رہی تھی۔ اپنی زبان تیاری ظاہر کرنے کے لیے حسینؓ کے خلاف اور زیادہ سختی سے کام لے رہے تھے۔ تاکہ شمر مخبری نہ کر دے کہ ان کے دل میں آلِ رسولؐ کے لیے جگہ ہے۔ انہیں اپنے مستقبل کی بہت فکر تھی۔ وہ شہنشاہ جو دغا اور فریب سے غداروں اور نمک حراموں کی مدد سے تاج و تخت حاصل کرتے ہیں۔ انہیں کبھی ان پر بھروسہ نہیں ہوتا۔ وہ سمجھتے ہیں یہ حوالی موالی سب مکار ہیں۔ صرف مکروفریب ہی سے حکومت حاصل کی جا سکتی ہے۔ انہیں چاروں طرف مطلبی اور دھوکہ باز ہی نظر آتے ہیں۔ جس پر ذرا سا بھی شبہ ہو فوراً قتل کر دیا جاتا ہے۔ یا انہیں ایک دوسرے پر جاسوسی کرنے اور ہر قول و فعل پر نگاہ رکھنے کے لیے مقرر کر دیا جاتا ہے۔

اس طرح بھائی بھائی کا دشمن ہو جاتا ہے۔ مخبری سے عروج اور عہدے ملتے ہیں

عمر بن سعد پر شمر کو مقرر کیا گیا تھا خود شمر کی گردن پر دوسرے شیطان سوار تھے۔ یہ سلسلہ اوپر تک پہنچا ہوا تھا۔ اس ماحول میں حسینؑ ابن علیؑ کے وجود کی کھپت نہ تھی۔

شمر کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے وہ ہر بات میں اس کی رائے لیتے تھے کہ کبھی لپیٹ میں آ جائیں۔ تو اپنے ساتھ اسے بھی گھسیٹ لے جائیں۔ جب امام حسینؑ نے ایک شب کی مہلت مانگی تو پوچھا "شمر تمہاری کیا رائے ہے؟"

"مہلت دینا پڑے گی۔ عرب قوم پناہ مانگنے والے کو پناہ دینے سے گریز نہیں کرتی۔ ایک شب کی مہلت کے لیے انکار کر دینا۔ ہمارا دستور نہیں۔ کافر بھی مہلت مانگے تو دینا پڑتی یہ تو پیغمبر خدا کے نواسے ہیں۔"

غرض ایک شب کی مہلت مل گئی۔ اور بڑھتی ہوئی فوج اطمینان کا سانس لے کر پیچھے ہٹ گئی۔

مگر سب شش و پنج میں پڑ گئے۔ امام نے یہ مہلت کیوں مانگی؟ کیا کہیں سے فوج آنے کی امید لگائے بیٹھے ہیں؟"

حسینؑ ابن علیؑ نے جو اپنی خودداری کو بالائے طاق رکھ کر ظالموں سے ایک شب کی مہلت مانگی تو اس لیے نہیں کہ انہیں کہیں سے فوجی امداد کی امید تھی یا اپنی مختصر سی فوج کو کچھ جنگی ہدایات دینا تھیں۔ وہ تو بس یہ آخری شب اپنے دوستوں اور عزیزوں کی صحبت میں گزارنا چاہتے تھے۔ پھر ہنگامۂ جنگ میں کب مہلت ملے گی۔

جب شہزادیٔ شب خاندانِ سادات کی زبوں حالی پر گریاں، ماتم کناں سیاہ زلفیں بکھرائے آئی۔ تو چہار طرف غل ہوا "وہ پیاسے حسینؑ کی شہادت کی رات آگئی۔ جناب امیر کی روح پیاسی اور بے قرار میدانِ کربلا میں سرگرداں تھی۔ فضا سوگوار تھی۔ اس رات پیغمبر اسلامؐ کے خاندان نے کیا کیا۔ سوچیں اور غم ہے! خدا دشمن کو بھی ایسی اندھیاری رات نہ دکھائے۔

غم و اندوہ سے چاند کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ تارے مردہ انسانوں کی بے نور آنکھوں کی طرح ٹمٹما رہے تھے۔ حور و غلمان ماتم کناں تھے۔ خدا ایسی ہولناک شب پھر نہ لائے۔

آلِ رسولؐ کے خیموں پر غم و ہراس کے بادل چھا رہے تھے۔ فضا میں ہل چل تھی آندھی ایسے تھپیڑے چل رہی تھی کہ دل تہ و بالا ہوتے جاتے تھے چراغ بجھے جاتے تھے۔ ہر چہار طرف خاک اڑ رہی تھی۔ درندوں کی دہاڑ سے سہمے ہوئے بچے ماؤں کی گودیں سمٹ آئے تھے۔ ہر لمحہ یہی لگتا تھا کہ اب ڈر سے ان کا دم نکل جائے گا۔ بیبیاں خاموش آنسو پیئے، بچوں کو کلیجے سے لگائے بہلا رہی تھیں دُعائیں پڑھ پڑھ کر پھونک رہی تھیں۔

سب سے زیادہ زینبؓ بنتِ علیؓ مضطرب تھیں۔ سرِ شام ہی سے منہ اترا ہوا تھا مسلسل آنکھوں سے خون کے آنسو جاری تھے۔ جانِ حزیں پر ایک کرب سا طاری تھا۔ کبھی تڑپ کر اٹھ بیٹھتیں، پھر تھک ہار کر گر جاتیں۔ جب کلیجہ پر چھریاں سی چل رہی ہوں تو چین کیسے آ سکتا ہے۔

اس وقت سب دوست، احباب، بھانجے، بھتیجے اور بیٹے حسینؓ کے وسیع خیمے میں جمع تھے۔ جنہیں اندر جگہ نہ ملی وہ اِدھر اُدھر کھڑے یا بیٹھے تھے۔ خیمے کے سب پردے اٹھا دیئے گئے تھے۔ امام کے ایک پہلو میں علی اکبرؓ تھے۔ دوسرے بازو قاسمؓ ابن حسنؓ تھے۔ عباسؓ کے چھوٹے بھائی جعفرؓ، عبداللہؓ اور عثمان بیٹھے تھے۔ ان کے پاس ہی عونؓ اور محمد بیٹھے تھے۔ خود عباسؓ سامنے مودب زانو بیٹھے تھے۔

سب نے یک زبان ہو کر بار بار وفاداری اور جاں نثاری کی قسمیں کھائیں۔

امام حسینؓ ابن علیؓ نے بڑے پیار سے اپنے عزیزوں اور دوستوں پر نظر گھمائی۔ ان کا مرجھایا ہوا چہرہ یک لخت تر و تازہ پھول کی طرح کھل اٹھا۔

"تاریخ گواہ ہے کہ میرے دوستوں جیسے مخلص دوست اور میرے عزیزوں جیسے پیارے کنبہ والے کہیں ایک جا جمع نہیں ہوئے۔ آج تمہیں اپنے پاس پا کر مجھے اپنی قسمت پر ناز ہو رہا ہے۔ میرا سر غرور سے بلند ہے۔ میرے پاس وہ الفاظ نہیں جن سے تمہارا شکریہ ادا کر سکوں۔ تمہاری غم خواری اور محبت سے بڑھ کر دنیا میں میرے لیے کوئی لشکر نہیں، کوئی ہتھیار نہیں۔"

پھر حسینؓ نے حکم دیا۔ سب چراغ گل کر دیئے جائیں۔ اندر باہر گھپ اندھیرا چھا گیا۔

صرف امام کی آواز ایک نورانی آبشار کی طرح خاموشی کو اجاگر کرتی رہی۔

"اس وقت جو کچھ تم مجھے دے رہے ہو اس کا نعم البدل نہیں۔ خدا ہی میرا یہ قرض اتار سکتا ہے۔ ابھی تک تو مجھے کچھ موہوم سی امید تھی کہ حالات زیادہ خراب نہ ہوں گے۔ وطن چھوڑ دینے کے بعد مجھے دنیا چھوڑنے پر مجبور نہ کیا جائے گا۔ میں سکون سے ایک غیر معروف کونے میں ایک پر امن شہری کی زندگی گزار سکوں گا۔ لیکن اب تو یہ امید بھی ختم ہو گئی۔ بس اب میں تم سے اپنے عہد و پیمان اٹھائے لیتا ہوں۔ تمہیں اطاعت کے بار سے سبک دوش کرتا ہوں۔ اور بخوشی اجازت دیتا ہوں کہ تم جس طرف پناہ چلے جاؤ۔ رات کا وقت ہے۔ اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ اے ملیت مجو، اپنی اپنی سواریاں تیار کرو۔ اور صبح ہونے سے نکل جاؤ۔ تم میں سے ہر شخص میرے عزیزوں میں سے ایک ایک کا ہاتھ پکڑ لے اور مختلف شہروں کی طرف روانہ ہو جائے یہ لوگ صرف میرے خون کے پیاسے ہیں۔ جب مجھے پالیں گے۔ تو تمہارا پیچھا نہ کریں گے عزیزو! میں نے چراغ گل کر دیئے ہیں۔ اس اندھیرے میں کوئی کسی کو نہ دیکھ سکے گا۔ مروت کا احساس قدم نہ روکے گا۔"

خیمے میں خاموشی طاری رہی۔ نہ سرسراہٹ ہوئی۔ نہ کسی نے پہلو بدلا۔ ہر جیتی کا دل دھڑک رہا تھا۔ سانس تک کی آواز رک گئی تھی۔ امام نے آنکھیں بند کر لیں۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ایک شمع روشن کی۔

اس آخری شمع کی روشنی میں جو امام نے اپنے ہاتھ سے آخری بار روشن کی تھی انھوں نے دیکھا سب اسی طرح اپنی اپنی جگہ پر موجود ہیں۔ کوئی اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں۔

خیمہ میں سناٹا چھایا رہا۔ جذبات کی فراوانی نے زبانیں بند کر دیں۔ پھر عباسؓ نے عزیزوں کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا۔

"خدا نہ کرے کہ ہم آپ کے بعد زندہ رہیں۔"

پھر مسلم بن عوسجہ نے کہا۔

"یا حسینؓ، خدا کی قسم ایسا ہرگز نہ ہوگا۔ آپ کے دشمن میرے دشمن ہیں جب تک

میرے ترکش میں تیر ہیں۔ ہاتھ میں نیزہ اور تلوار ہے میں ان نابکاروں سے لڑتا رہوں گا۔ اگر میرے ہتھیار ناکارہ ہو گئے۔ تو ان پر پتھر برساؤں گا۔ اگر مجھے ستر بار قتل کیا جائے۔ پھر دوبارہ زندہ کر کے میرے جسم کو شعلوں کی نذر کر دیا جائے پھر جل جانے کے بعد میری راکھ کو دشت و بیابان میں منتشر کر دیا جائے۔ تب بھی میں آپ کے دشمنوں سے لڑتا رہوں گا۔ آپ کا ساتھ میں ہرگز نہ چھوڑوں گا۔ ہم میں سے کسی کو اپنی جان آپ سے زیادہ پیاری نہیں۔ اس جنگ سے ہٹنا اپنے ضمیر سے غداری ہے ہمیں مجبور نہ کیجئے۔ ہم آپ کا حکم ہرگز نہ مانیں گے۔ اور یہ احساس کہ ہم اپنے عزیز ترین دوست اور آقا سے نافرمانی کر رہے ہیں۔ سوہان روح بن رہا ہے۔ لِلّٰہ ہم پر سے یہ پابندی اٹھا لیجئے۔"

امام کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ وہ خاموش اس شمع کو دیکھتے رہے جو دنیا میں انہوں نے آخری بار روشن کی تھی۔ اس کی روشنی ابھرتے سورج کی طرح دم بدم بڑھتی گئی۔

"میرے پیارو" یہ اب میری جنگ نہیں رہی، ہم سب کی جنگ ہے۔ ہمارا انجام جو بھی ہو ایک ساتھ ہو گا۔ آج ہم الگ الگ افراد نہیں۔ ایک مضبوط ارادہ ہیں۔ اَن مٹ یقین ہیں۔ اس شمع کی طرح روشنی کا مخزن ہیں۔ فتح آخر میں ہماری ہو گی" پھر انہوں نے باری باری سب کو گلے لگایا اور کہا یہ "آؤ اپنے بچوں سے دو باتیں کر لیں!"

اور شمع جگمگاتی رہی۔

آخری شب

زنانہ خیموں سے غم و اندوہ میں ڈوبی آہوں کی صدا سن کر حسینؓ بے قرار ہو گئے۔ "پھوپھی جان کے رونے کی صدا ہے!" علی اکبرؓ نے بڑے ضبط سے کہا۔ "یوں تو کئی دن سے پریشان ہیں۔ مگر آج حالت بہت ہی غیر ہو رہی ہے۔ بے انتہا مضطرب اور بے قرار ہیں۔ گھڑی بھر کو آنکھ لگ گئی تھی کہ نہ جانے کیا خواب دیکھا چونک کر رونے لگیں۔ ننگے سر ننگے پاؤں بے تحاشہ ٹہل رہی تھیں۔ میں نے پوچھا پھوپھی جان، کیا بات ہے؟ تو میرے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگیں۔ کہنے لگیں میرے بیٹے دعا کر خدا مجھے بھائی کا غم سہنے سے پہلے اٹھا لے۔ کوئی جان لے لے۔ مگر میرے بھائی کا غم نہ ہو۔ ادھر امی جان کا عجب حال ہے۔ ایک پل کے لیے آنسوؤں کی جھڑی نہیں رکتی۔ بابا ذرا آپ ان کے پاس جا کر سمجھائیے۔ آپ کو دیکھ کر ہی ڈھارس بندھ جائے گی۔"

امام فوراً زنانہ خیموں کی طرف گئے۔

بہن کی پیاس سے کمھلائی ہوئی صورت دیکھ کر حسینؓ کا جی بھر آیا۔ یہ وہی تو پانچ برس کی بچی ہے جو ماں کی وفات پر سہم کر بھائیوں سے چمٹ گئی تھی۔

بھائی کو دیکھا تو زینبؓ کی ساری کلفتیں دور ہو گئیں۔ دوڑ کر بھائی کے قدموں پر گر گئیں۔ بھائی نے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

"اے بنتِ علیؓ! یہ تم نے کیا صورت بنا رکھی ہے ننگے سر، بال بکھرے، چہرے پر خاک کی تہیں، ابھی سے ہمارا ماتم کرنے لگیں؟ ابھی تو ہم زندہ ہیں۔ رونے کا وقت آئے تو جی بھر کے رو لینا۔ ابھی سے یہ حال ہے تو ہمارے گلے پر جب خنجر چلے گا تو کیسے ہو گی۔"

میرے تو ہوش حواس گم ہو گئے ہیں بھائی۔ دم سینے میں گھٹا جاتا ہے۔ جی موت کا سا

"جی ہلکان نہ کرو، ابھی تو صبح دور ہے۔ خدا پر بھروسہ رکھو زینبؑ۔ آئی موت نہیں ٹلتی پھر بھی شاید پردۂ غیب سے کوئی مدد مل جائے۔ ابھی سے تمہیں کیوں یقین ہو گیا کہ تمہارا بھائی مارا جائے گا۔"

"تمہاری آئی مجھے لگ جائے بھیا۔ اللہ تمہیں آفتوں سے بچائے۔ کاش تمہارے سر کی ساری آفتیں میں اپنے سر لے کر مر جاؤں۔ اللہ ان آنکھوں سے بچوں کی یتیمی اور بانو کی بیوگی نہ دکھائے۔"

"اگر تم تڑپ گئیں تو میرے بچے بالکل ہی جان سے گزر جائیں گے۔ ماں سے زیادہ تم سے مانوس ہیں۔ تم نے ہمت ہار دی تو یہ بچے دم توڑ دیں گے۔"

"بہت جی کو سنبھالتی ہوں نہیں سنبھلتا۔ طرح طرح کے وسوسے ستاتے ہیں، اندیشے سر اٹھاتے ہیں۔ تمہارے دشمنوں پر عذاب ٹوٹے۔ جب تم سے جدا ہونے کا خیال آتا ہے۔ پھر اگر ذرا لگنے لگتا ہے۔ ہر دم سر پر موت کے پروں کی سرسراہٹ سنائی دیتی ہے۔ لگتا ہے کوئی رسی لیے میری مشکیں کسنے چلا آتا ہے۔ کوئی بے شرم میرے سر سے چادر چھینے لیے جاتا ہے۔ کبھی بھولے سے جو گھڑی بھر کو آنکھ لگ جائے تو نانا جان حیران و پریشان نظر آتے ہیں۔ اماں جان برہنہ سر روتی پیٹتی نظر آتی ہیں۔ مجھ سے کہتی ہیں۔ واہ بیٹی کیا مزے سے پڑی سو رہی ہو۔ ادھر میرے لال کے سر پر موت منڈلا رہی ہے۔ بس ایک رات کا مہمان ہے، کیا اسی کو بھائی کی الفت کہتے ہیں۔ کئی دن سے بابا جان خواب میں نظر آ رہے ہیں۔ چہرہ زرد ہو جاتا ہے۔ ماتھے پر موت کا پسینہ ہے۔ مجھ سے کہہ رہے ہیں۔ زینبؑ جاگ جاؤ۔ نیند تمہارے مقدر میں نہیں جب حسینؑ کو نیند آ جائے، تم جب بھی نہ سونا۔ تب میری آنکھ کھل جاتی ہے اب تو پلک جھپکاتے ڈر لگتا ہے۔"

بھائی بہن میں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ سکینہ بابا کو پکارتے آ گئیں۔

"بابا جان آپ کہاں چلے جاتے ہیں۔ آپ ہمیں اپنے پاس سلاتے بھی نہیں۔ آپ کے بغیر ہمیں نیند نہیں آتی۔ ساری دنیا سوتی ہے پر آپ کی سکینہ جاگتی ہے۔ یہاں تک کہ صبح کا تارہ جھلملانے لگتا ہے۔ اللہ پیارے بابا جان اپنی سکینہ کو سلا دیجیے۔ نہ جانے ہماری نیند کہاں اڑ گئی ہے۔ ہماری آنکھوں میں ریت کھٹکتی ہے پر نیند نہیں آتی۔ بس پھوپی جان سے باتیں کر چکے اب ہمیں ذرا سی دیر کو گود میں لے لیجیے۔"

امام نے لرزتی کانپتی بچی کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

"میری مینا تو کیسی شیریں لگتا ہے تیرے ہونٹوں سے شہد کی بوندیں ٹپکتی ہیں۔ نیند کیوں نہیں

"اب آپ کی گود میں آنے لگی۔"

"مگر جانِ پدر، یہ عادت اچھی نہیں، کبھی اپنی امی کے پاس بھی سو جایا کرو۔"

"امی کو فرصت کہاں، وہ تو رات رات بھر اصغر کو لے کے ٹہلتی ہیں۔ وہ تو روئے چلے جاتے ہیں۔"

حسینؑ کے سینے پر گھونسہ سا لگا۔ مگر وہ ضبط کر کے بولے۔

"تو اکیلے سونے کی عادت ڈالو۔"

"نہیں ہم تو آپ کے پاس سوئیں گے۔"

"اور اگر کبھی ہم نہ ہوئے تو تمہیں کیسے چھاتی پر سلائیں گے۔"

"آپ ہمیں چھوڑ کر چلے جائیں گے؟"

"اگر جانا پڑا تم تو سمجھدار ہو۔ برسوں کے ساتھ دم بھر میں چھوٹ جاتے ہیں۔ قافلے لٹ کر بکھر جاتے ہیں۔ ہم جب اپنی امی سے چھٹے تھے تو ہم بھی بہت چھوٹے تھے۔ ہم ان سے لپٹ کر سویا کرتے تھے ورنہ نیند ہی نہیں آتی تھی۔ جب وہ گئیں تو نہ رونے کا کام چلا نہ چلانے سے انہیں جانا تھا چلی گئیں۔ کسی کے ماں باپ ہمیشہ زندہ نہیں رہتے۔"

"کسی کے بچے بھی تو مر جاتے ہیں۔ بس ہم بھی مر جائیں گے۔"

امام چپ رہ گئے۔

"آپ ہمیں نہ سلائیں گے تو ہم یوں ہی جاگ جاگ کر مر جائیں گے۔"

کہتے کہتے سکینہ باپ کی گود میں سو گئیں۔ حسینؑ بچی کو لئے ہوئے بانو کے خیمے میں گئے۔

ٹہلتے ٹہلتے بانو ایک دم رک گئیں۔ اگر امام لپک کر سہارا نہ دیتے تو بچے سمیت پٹ پڑ جاتیں۔ بچے کو پنگوڑے میں لٹا دیا اور سکینہ کو لینے گئیں۔

"لائیے مجھے دیجئے، آپ تھک جائیں گے۔"

"نہیں پھر یہ تھکن کہاں نصیب ہوگی۔ یقین مانو اولاد کو گود میں اٹھا کر دنیا کے سارے بوجھ سر سے اتر جاتے ہیں۔"

"میرے کہنے سے تو سوتی نہیں، یہ آپ کی گود کا سحر ہے جو اسے نیند آنے لگی۔"

"ابھی کچی نیند ہے۔" حسینؑ بچی کو زانو پر لٹا کر بیٹھ گئے۔ اصغر پھر کلبلانے لگے۔ ماں نے پھر

اٹھا لیا۔ حسینؑ نے بچی کو لٹا دیا۔ اور بانوؑ کے ہاتھوں سے بچے کو لے لیا۔ کتنا ہلکا ہو گیا تھا ایک پھول جس کی نمی خشک ہوتی جاتی جا رہی تھی۔ حسینؑ کے ہاتھ لرزنے لگے۔ باپ کی گود میں آتے ہی بچے نے کراہنا شروع کر دیا۔ ماں دان کے تلنے پر سر رکھ کر لمبی لمبی سانسیں بھرنے لگیں۔

"بانو! ان دو چھوٹے بچوں کو لے کر کسی طرف نکل جاؤ۔ حجتؑ اور فضہ کو اپنے ساتھ لے لو۔"

"آپ بھی چلئے۔" بانو نے معصومیت سے کہا۔

"میں کیسے جا سکتا ہوں یہ ساری فوج کشی تو ایک میری جان کے لئے ہے۔"

"اور آپ کے بچے؟ کیا وہ زندہ چھوڑ دیئے جائیں گے۔ خاص طور پر اولاد زینہ۔ اور پھر ذرا سوچئے اصغر بڑے ہوں گے تو کیا سوچیں گے۔ ماں باپ کو موت کے منہ میں چھوڑ کر بھاگ نکلی تب میں انھیں کیا جواب دوں گی۔ اور پھر آپ بغیر خدا کے بیٹے میں تو بس انہی کی بہو ہوں۔ آپ کا راستہ میرا راستہ ہے۔ آپ مجھے کسی طرح کم ہمت نہ پائیں گے۔"

بچہ سو گیا تو حسینؑ نے سکینہ کے قریب لٹا دیا۔

"دنیا میں آتے ہی میرے بچے ویران ہو گئے۔ سکینہ کو پانچواں سال ہے۔"

"مگر کیسی بڑی بوڑھیوں جیسی باتیں کرتی ہے۔ میں تو لاجواب ہو جاتی ہوں۔ میں نے کہا میری شہزادی نہ رو۔ تو بولی۔ میں جان کے تھوڑی روتی ہوں۔ آنسو آپ ہی آپ جاری ہو جاتے ہیں۔ بابا کیوں نہیں آتے۔ اور آنسو کیوں آتے ہیں۔ ہیں یہ آنسو بڑے بُرے لگتے ہیں۔ آنکھیں بند کرو تب بھی نہیں بند ہوتے! بابا کو دیکھ کر ڈر جاتے ہیں۔ مگر بابا نہیں آتے۔ ہم جانتے ہیں کیوں نہیں آتے۔"

میں نے کہا "کیوں نہیں آتے؟" تو بولی۔

"ہماری پیاس کی فریاد سے انھیں وحشت ہوتی ہے۔ اس لیے وہ نہیں آتے اور ہم روئیں آپ کو بُرا لگتا ہے تو اچھا ہم اب چپکے چپکے روئیں گے۔"

اس کی باتیں سن کر جی ڈرتا ہے ایسے ہوشیار بچے بڑی مشکل سے جیتے ہیں۔" بانو نے کہا

جب امام واپس اپنے خیمے میں آئے۔ تو ان کے دل کا بوجھ اور بھی بڑھ گیا تھا۔

قاسم بن حسنؑ کچھ ابوالفضل عباسؑ سے باتیں کر رہے تھے اما کو دیکھ کر ایکدم سے خاموش ہو گئے

امام سب سے باری باری باتیں کرتے رہے۔ گزرے ہوئے غنیمت زمانے کی قابلِ
خوش گوار باتیں۔ وہ باغ و بہار باتیں جب نانا زندہ تھے۔

قاسم اب بھی بے چینی سے بار بار چچا کی طرف ملتجی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ کچھ پوچھنا
چاہتے تھے۔ مگر ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔

"کیا قصہ ہے؟ قاسم کیوں بے چین سے ہیں؟" امام نے جھک کر عباسؑ سے پوچھا۔

"آپ سے کچھ دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ ہمت نہیں پڑتی۔"

"تکلف کی کیا وجہ ہے؟" امام کو اپنا بھتیجا عزیز تھا۔ بھتیجا بھی تھا اور داماد بھی۔ اپنی
پیاری بیٹی فاطمہ کبریٰ اسے انھوں نے بھائی کی وصیت کے مطابق منسوب کر دیا تھا۔ وہ انہیں باپ کی
جگہ سمجھتا تھا۔ اور کبھی تکلف محسوس کیا۔ انہوں نے اشارے سے بلا کر کہا۔

"کچھ پوچھنا چاہتے ہو، مجسم سوال بنے ہوئے۔ مگر زبان نہیں کھلتی، کیا چچا سے ناراض ہو کر
اتنی غیریت برت رہے ہو۔"

"کئی دن سے ایک بات پوچھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مگر..." قاسمؑ پھر خاموش ہو گئے

"تو پوچھتے کیوں نہیں؟"

"جواب سے ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر لگتا ہے تو پھر سوال کی ضرورت ہی نہیں۔"

قاسمؑ پھر کشمکش و پیچ میں پڑ گئے۔ علی اکبرؑ اور عباس کے چہروں پر ہلکی سی مسکراہٹ دیکھ کر
امام سمجھ گئے۔ یہ دونوں بزرگ اس بچے کو چھیڑ رہے ہیں۔ مسکرا کر بولے۔

"تم ان دونوں کی باتوں میں نہ آؤ، بے تکلف پوچھو، پھر شاید موقع نہ ملے۔"

"کیا آج کے مجاہدوں میں میرا بھی نام ہے۔ چچا عباس کہتے ہیں میں نابالغ ہوں مجھے جہاد کا
حق نہیں۔"

"یہ تو عباسؑ سچ کہتے ہیں کہ تم نابالغ ہو۔ مگر جہاد کا حق ہے۔ یا نہیں اس کے بارے میں
فیصلہ نہیں ہوا۔ یہ مسئلہ غور طلب ہے۔"

"تو کب ہوگا فیصلہ؟" قاسم بے چین ہو گئے۔

"پہلے یہ تو بتاؤ، موت کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"موت تھکے ہارے مسافر کی نیند سے زیادہ سکون بخش اور شہد سے زیادہ شیریں ہے بشرطیکہ وہ حق کی حمایت میں جہاد کے بعد نصیب ہو۔"

"تو بس فیصلہ ہو گیا۔ تم نابالغ نہیں، تمہیں جہاد کرنے کا حق ہے۔"

ساتویں تاریخ سے پیارے قاسمؑ بن حسنؑ کے نوخیز چہرے پر مسرت کی بہاریں کھل گئیں۔ نہایت فخر سے عباسؑ اور علی اکبرؑ کی طرف دیکھا۔ اور ہنس پڑے۔

"اس کے علاوہ یہ کوئی عام جہاد نہیں۔ دو فوجوں کا مقابلہ نہیں۔ ایک جبردست ظلم فوج نے مٹھی بھر امن پسندوں کو چاروں طرف سے گھیر کر قتل کرنے کا سامان کیا ہے اس لیے جہاد کی ساری شرطیں زائل ہو گئیں۔ آج ہماری اس بے بساط فوج کا بچہ بچہ سپاہی ہے تم پر، عون و محمد پر، حتیٰ کہ چھ ماہی علی اصغر پر سے بھی پابندی اٹھ چکی ہے تم میں سے ہر ایک اپنے مورچہ کا سپاہی ہے۔"

قاسمؑ مسرت سے جھوم اٹھے۔ جیسے انہیں پروانۂ موت نہیں ہفت اقلیم کی بادشاہت مل گئی ہو۔

ایک قطرہ

رات کا سوگوار گریبان چاک ہوا۔
اور غم و اندوہ سے نڈھال صبح نمودار ہوئی۔
چاند کا سنہرا مکھڑا افق ہوگیا۔
سورج کا کٹورا بلند بلند نور کی کرنوں سے بھرنے لگا۔
تاروں کی تھکی ماندی فوج نے آسمان سے کوچ کی ٹھانی۔
اور خاک کے ذرّے سونا لٹانے لگے۔

جیسے ہی دنیا کو منور کرنے والے سورج نے سر اٹھایا تاروں کی چاندی اوس کی مانند لامحدود خلاؤں میں پگھل گئی۔ سسکتی شمع نے پروانوں پر ایک حسرت بھری نظر ڈالی اور دم توڑ دیا۔

امام کے خیموں میں سناٹا تھا۔ شب بیداری کے خمار میں ڈوبے ہوئے تھے اور تھکے ماندے دم بخود تھے۔ کائنات پیغمبرِ خداؐ کے بے کس نواسے کے قتل کے خوف سے لرز رہی تھی۔

بوڑھے آسمان کی کمر جھک گئی تھی۔ خاک ماتم کناں تھی۔ فرات کی موجوں کا کلیجہ شدتِ غم سے چاک تھا۔

حسینؑ ابن علیؓ نے اپنے ساتھیوں کو جمع کیا اور کہا۔

"دوستو، لو صبح ہوگئی، خدا کی حمد و ثنا کا وقت ہے۔ اٹھو فجر کی نماز ادا کریں۔"

یہ سن کر سب بستروں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ لباسِ فاخرہ زیبِ تن کیے۔ بالوں میں کنگھی کی عمامے باندھے، کاندھوں پر خوش رنگ عبائیں اور کمر میں ریشمی پٹکے ڈالے۔ جسموں کو عطر و مشک سے بسایا۔ چہرے تقدس کے نور سے روشن تھے۔ اور پیاسے ہونٹوں پر اللہ کا نام تھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ قتل گاہ جانے کی تیاری نہیں۔ کسی جشن میں شرکت کی دھوم دھام ہے سب شاداں و فرحاں

خیموں سے نکلے۔ رات کی گھٹن اور کرفت کا چہروں پر نام و نشان بھی نہ تھا۔ ایکدم امام کی پکار سن کر سب چاق و چوبند ہو گئے۔ یاسیت کے بادل چھٹ گئے۔ پھولوں کی خوشبو سے فضا مہک اٹھی نسیم سحر کے لطیف و خنک جھونکوں سے پیاس کی شدت میں کمی آ گئی۔ چڑیاں چہچہانے لگیں سب نے حسرت سے نہر کی جانب دیکھا۔ مگر دل بوجھل نہ ہوئے۔ فرات کی موجیں بیقراری سے مچل رہی تھیں۔ سورج کی پہلی کرن جھینپی، شرماتی چمکی۔ صحرا کے دامن میں اوس کے موتی جگمگانے لگے۔ ہوا ایسے پیر چل رہی تھی کہ پھولوں کے چہرے گرد آلود نہ ہو جائیں بلبلیں میں امنگیں جاگ اٹھیں۔ فضا میں ایک انجانا سا حسن سرایت کر گیا۔ دل آپ ہی آپ کھل اٹھے۔

پتّوں پر اوس کے قطرے نگینوں کی طرح لرز رہے تھے۔

مگر حسینؓ اور ان کے ساتھی پانی کی ایک ایک بوند کو ترس رہے تھے۔ سب کچھ فراموش کر کے بڑے انہماک سے سب نے خدا کے حضور میں سر جھکایا۔ حسینؓ ابن علیؓ نے خطبہ کہا

"اے میرے عزیزو، میرے بہادر جانثارو، آزمائش کا دن آ پہنچا۔ آج جنگ و جدل کا دن ہے۔ اپنے خالق سے وصال کا دن ہے۔ مبارک ہے یہ صبح کہ ہم حق کی خاطر جہاد کر رہے ہیں شکر ہے خدا کا کہ ہم نے مکروفریب کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے۔ یہ مرتبہ خوش نصیبوں ہی کو ملتا ہے ہم خدا کے چیدہ بندے ہیں کہ اس نے ہمیں ایک خاص مقصد کے لیے منتخب کیا ہے۔ ہم سچائی کے امانت دار ہیں۔ آؤ مل کر ہم سب اپنے خالق کا شکر یہ ادا کریں اور دعا کریں کہ وہ ہماری یہ حقیر سی قربانی قبول کرے۔ یہ صبح بھی مبارک ہے اور آج کی شام بھی مبارک ہو گی۔ یہاں سے کوچ ہو گا۔ تو منزلِ عرشِ بریں ہو گی۔ ہماری یہ پیاس تو دنیا نہ بجھا سکی۔ انشاء اللہ ہم آسمانی چشمہ پر سیراب ہوں گے۔ بس اب تو ہماری یہی آرزو ہے کہ ہمارے قدم لڑکھڑائیں نہ اور ہم عزت و آبرو کے ساتھ اپنی منزل پر سرخرو ہو کر پہنچیں۔ موت آج نہیں آتی ہے تو کل بھی آ کر رہے گی کیوں نہ ہم لبیک کہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ دشمن کی فوج عظیم ہے۔ بہترین ہتھیاروں سے لیس ہے، تازہ دم گھوڑے ہیں۔ اس حدوشمار کے سمندر کے مقابلے میں ہم ایک حقیر قطرہ ہیں مگر یہی قطرہ آج طوفان بننے کا تہیہ کر رہا ہے۔"

مجمع میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ آنکھیں روشن ہو گئیں ایک دوسرے سے بغلگیر

ہو کر سب ہنسنے بولنے لگے۔ امام نے علی اکبرؑ سے اذان دینے کو کہا۔ تکبیر کی آواز سے دشت صحرا گونج اُٹھے۔ پتا پتا وجد میں آگیا۔ باذوق بیٹے کی آواز سن کر خیمے کے دروازے پر آگئیں۔ زینبؑ نے دور ہی سے بھتیجے کی بلائیں لیں۔ ہیم کے دل انجانے خوف سے لرزنے لگے۔ اور پسینے چھوٹ گئے۔

اِدھر دشمن کی فوج میں قتل حسینؑ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ابن زیاد اور شمر ہر چہار طرف صفوں کو ترتیب دے رہے تھے۔ برچھیاں چمک رہی تھیں۔ تیر بلند ہو رہے تھے۔ گھاٹ پر اب تک سیلہ سا لگا ہوا تھا۔ پانی آپس میں چہلیں کر رہے تھے۔ ایک دوسرے پر پانی اچھال رہے تھے۔ ستے مشکیں بھر بھر کر خوب چھڑکاؤ کر رہے تھے۔ کوئی دم میں سورج طلوع ہو کر آگ برسنے لگے گی۔ جانور بھی پانی سے نکلنے کو تیار نہ تھے۔ مگر پورے گھاٹ پر فوج کا پہرہ دو چند کر دیا گیا تھا۔ ایک آہنی دیوار تھی جو امام حسینؑ کے عزیزوں اور دریا کے درمیان کھڑی تھی۔ دریا جیسے قیدی کی طرح کناروں پر سر پٹک رہا تھا۔ پانی بند ہوئے تیسرا دن تھا۔ سب کے حلق پیاس سے خشک ہو رہے تھے۔ ہر چہار طرف سبزہ لہلہا رہا تھا۔ مگر فاطمہ زہراؑ کا چمن سوکھ رہا تھا۔ نہر علقمہ کا روپہلا پانی آہنی دیوار کے پیچھے موجیں مار رہا تھا۔ مگر آلِ رسولؐ بوند بھر پانی کو ترس رہے تھے۔

مگر پھر بھی کسی کی پیشانی پر شکن نہ تھی۔ کسی کے دل میں کوئی وسوسہ نہ تھا۔ ایکدم سے دشمن کے لشکر میں طبل جنگ بجنے لگا۔ امام کے خیمے گونج گرج سے ہلنے لگے۔ بچے دہل کر رونے لگے۔ امام دوستوں کو تیاری کا حکم دے کر تیزی سے خیموں کی طرف چلے۔

مستورات خوف سے بے حال ہو رہی تھیں۔ بچے بلک رہے تھے۔ زینبؑ بنت علیؑ مصلے پر بیٹھی گڑگڑا کر دعائیں مانگ رہی تھیں۔

"الہٰی میرے بھیا کی خیر۔ انھیں تیری امان میں سونپا۔ میری بانو کا سہاگ نہ اجڑے گود بھری رہے۔ ان معصوموں پر رحم فرما میرے مولا۔ تیرے رسولؐ کی اولاد ہیں۔ فاقوں سے جان بہ لب اور پیاس سے بے دم ہو رہے ہیں۔" اے پروردگار ہم سے کیا خطا ہوئی کہ دنیا کی ہر مصیبت ہم پر ہی نازل ہو رہی ہے۔ نانا جان، امی اور بابا کے بعد حسنؑ کو بھی ہم سے چھین لیا۔ اب ہم بے کسوں کا سہارا حسینؑ رہ گئے ہیں۔ آج اُن کی بھی خیر نظر نہیں آتی۔"

امام حسینؑ بہن کے پاس جا کر مصلّے پر ہی بیٹھ گئے۔

خدا کا شکر ادا کرنے کے بجائے تم شکوہ کر رہی ہو بنت علیؑ۔ آج تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے تو ہمیں یہ وسیع دنیا دی جس کی نعمتوں کا کوئی حساب نہیں مگر انسان نے ناکہ بندی شروع کر دی۔ پہرے لگا دیے۔ قفل ڈال دیئے اور زندگی کو مسموم کر ڈالا؟

"مگر کیوں بھائی، کیا کوئی راستہ نہیں۔ ذرا بچوں کی صورت دیکھئے۔ دل پر چھریاں چلنے لگتی ہیں۔ مجھ سے اب نہیں دیکھا جاتا۔ خدارا کچھ کیجئے"۔

"میں ابھی جا کر ان بدبختوں کو سمجھاؤں گا۔"

"نہیں نہیں، خدارا آپ نہ جائیے گا۔ نامراد آپ کو جیتا نہ چھوڑیں گے۔ اپنی طاقت کے غرور میں اندھے ہو رہے ہیں۔" زینبؑ گھبرا گئیں۔

"بہر حال یہ میرا فرض ہے کہ میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہ اٹھا رکھوں۔ اچھا اٹھو ذرا بانو کو بلاؤ۔ ہماری بیٹیاں کہاں ہیں۔ کیا میدانِ جنگ میں جانے کے لیے تم لوگ ہمیں تیار نہیں کرو گی۔ جاؤ زینبؑ ہمارے نانا جان کی عبا لاؤ۔ آج ہم وہی پہن کر مقتل کی طرف جائیں گے اور بابا کی تلوار بھی۔ آج یہ دونوں ہمیں بڑی شدت سے یاد آ رہے ہیں۔ اُن کے لباس اور اسلحہ سے ہمیں ان کی قربت محسوس ہو گی۔ ہماری ہمت بڑھ جائے گی۔ ہمارے علم بھی لے آؤ کہ ہماری فوج کا علم بردار بھی سب کی رائے سے منتخب کیا جائے گا۔"

سب نے مل کر امام حسین ابن علیؑ کو زرہ بکتر پہنائی۔ امام نے علیؑ ابن ابی طالب کی ذوالفقار کو بوسہ دے کر کمر سے باندھا۔ سیدزادیاں سر جھکائے کھڑی زار و قطار رو رہی تھیں۔ زینبؑ علم تھامے خاموش آنسو بہا رہی تھیں۔ عونؑ اور محمدؑ ماں کے پاس آئے اور پوچھا۔

"امی، علم برداری کی سعادت کسے نصیب ہو گی؟ ہم بھی تو ماموں جان کے جاں نثاروں میں سے ہیں۔ پر اُن سے کچھ عرض کرتے ڈر لگتا ہے۔ آپ ہماری سفارش کر دیجئے نا۔"

"خاموش، امام مالک و مختار ہیں وہ جس کو چاہیں گے یہ عزت بخشیں گے۔ میں ایک لفظ بھی نہ کہوں گی۔"

"ہم شیرِ خدا کے نواسے ہیں۔ علم برداری کا حق ہمیں پہنچتا ہے۔"

دونوں اپنی ضد پر قائم رہے۔

"بس زیادہ بڑھ چڑھ کر باتیں نہ بناؤ۔ ایک تم ہی شیرِ خدا کے نواسے نہیں۔ میں تو جدھر نظر اٹھا کر دیکھتی ہوں، علیؓ کے جگر گوشے ہی نظر آتے ہیں۔ اور پھر یہ بھی پتہ ہے کہ بابا کو جو علم برداری کا شرف ملا تھا وہ ان کی جواں مردی اور جان بازی کا ایک ادنیٰ سا اعتراف تھا۔ کیا نازک وقت تھا۔ اسلامی فوجیں روم اور شام کے لشکر جرار کے آگے پسپا ہو رہی تھیں۔ تب میرے بابا نے تلوار کے وہ جوہر دکھائے کہ رہتی دنیا تک ان کا نام رہے گا۔ نانا جانؐ نے انھیں علم سونپا اور انہوں نے اس کی شان دوبالا کر دی۔ غنیم کے چھکے چھڑا دیئے۔ دشمن پیٹھ دکھا کر بھاگا۔ تم نے ابھی تک کون تیر مارا ہے؟ کون سے معرکے جیتے ہیں کہ علم برداری کے خواب دیکھنے لگے ہو۔ ہوش کی باتیں کرو!"

"ہمارے دادا جان بھی علم بردار تھے۔"

"جعفر طیارؓ نے یہ شرف اپنی تلوار کے زور سے حاصل کیا تھا۔ باپ دادا کے کارناموں کا سہارا نہ لو۔ آج موقع ہے تم بھی کچھ جوہر دکھاؤ۔ اپنا لوہا منواؤ کہ لوگ بے ساختہ کہہ دیں کہ ہاں تم علیؓ کے نواسے ہو، جعفر طیارؓ کے پوتے ہو۔ اپنے منہ میاں مٹھو نہ بنو۔"

بچوں کے منہ اتر گئے۔ شرم سے نگاہیں جھک گئیں۔

"کچھ خبر ہے اس وقت میرے جی پہ کیا گزر رہی ہے۔ میرا حسینؓ تین دن کا پیاسا ان ظالموں کے مقابل جا رہا ہے۔ اُن کی جان خطرے میں پڑی ہے۔ میرا دل ہولا جاتا ہے۔ حشر کے دن اماں کو کیا جواب دوں گی، غیرو! تمہیں کیوں میری فکر ہونے لگی۔ تمہیں تو اپنے منصب کی فکر پڑی ہے۔"

بچوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ امام حسینؓ نے تو آکر دونوں کے کندھوں پر پیار سے ہاتھ رکھ دیئے اور بولے۔

"زینبؓ تم میرے بھانجوں کی دل شکنی کر رہی ہو۔ یہ تو شیروں کے شیر ہیں۔ تم دیکھنا میدانِ جنگ میں ایسے جوہر دکھائیں گے کہ دنیا انگشت بہ دنداں رہ جائے گی۔ آخر کس ماں کے لال ہیں۔ اگر آنحضرت کی بھی رائے ہے کہ انہیں علم دیا جائے تو مجھے انکار نہیں؟"

"یہ بالشت بالشت بھر کے بچے علم کیوں کر اٹھا سکیں گے۔ علم کی شان میرے خیال میں عباسؓ ابن علیؓ ہی قائم رکھ سکیں گے۔ وہی اس کے اہل ہیں۔" زینبؓ نے کہا۔

"یہی ہم سب کی رائے ہے۔" سب نے بلند آواز میں کہا۔

"عباسؑ ابن علیؑ سامنے آؤ۔" امام مسکرائے۔

عباسؑ نے آستین سے پیشانی کا پسینہ پونچھا اور جھک کر قدم بوس ہوئے۔

زینبؑ نے بھائی کی پیشانی کا بوسہ لیا۔ اور علم ان کے سپرد کر دیا۔

"بھائی اس علم کی شان قائم رکھنا۔"

سب عباسؑ کو مبارک باد دینے لگے۔ ان کی بیوی ایک کونے میں بچے کو گود میں لیے کن انکھیوں سے اپنے وجیہ شوہر کو دیکھ رہی تھیں۔ فخر سے ان کا سر اونچا ہو گیا۔ آنسو آنے لگے۔ زینبؑ کے سامنے جھک کر بولیں۔

"اس عزت افزائی کا شکر کس منہ سے ادا کروں۔"

زینبؑ نے بھاوج کو گلے لگا لیا۔

"خدا تمہاری مانگ کوکھ سلامت رکھے۔"

"میں تو آپ کی کنیز ہوں۔ اللہ ہمارے امام کو جیتا رکھے۔ بانو کا سہاگ قائم رہے۔ بچے جئیں۔ ماں باپ کے سائے میں پروان چڑھیں۔"

"لوگ کیسا ہجوم ہے۔" اچانک سکینہ بھیڑ کو چیرتی چلی آئیں۔ کسی نے انہیں بتایا۔ کہ چچا عباسؑ کو علم برداری ملی ہے۔

"اللہ کہاں ہیں ہمارے عمو جان، ذرا ہمیں پیار تو کرنے دو انہیں۔"

سب خوش ہو رہے تھے۔ مگر عونؑ و محمدؑ ایک طرف بجھے سے کھڑے تھے۔ زینبؑ انہیں روہانسا دیکھ کر سمجھ گئیں کہ علم نہ ملنے کا غم ہے۔ بے اختیار بچوں پر پیار آ گیا اشارے سے بلایا۔

"میرے منہ کیوں اترے ہوئے ہیں؟"

دونوں نیچی نظریں کیے کھڑے رہے۔

"تمہارے اس رویئے سے جانتے ہو میرا کیا دل دکھا ہے۔ تمہیں ذرا بھی میرا خیال نہیں؟ تم میری دس برس کی ریاضت کا ثمر ہو۔ میری زندگی کا سہارا ہو۔ اگر تم نے کوئی بچپنے کی حرکت کی تو میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ تمہیں میرے دودھ کی قسم۔ اگر اس وقت تم نے کم ظرفی کا اظہار کیا تو میں"

سمجھوں گی میری دس برس کی محنت پر پانی پھر گیا۔ کسی نے تاڑ لیا تو لوگ کیا کہیں گے میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گی۔"

دونوں رو کر ماں سے لپٹ گئے۔ قدموں پر سر رکھ دیا۔

"اب ایسی غلطی کبھی نہ ہو گی۔ اللہ معاف کر دیجئے۔ ہم تو عباسؑ ماموں کے غلام ہیں۔ ابھی ہم ان کے قدم چوم لیں گے۔ نہیں امی جان آپ کے سر کی قسم ہمیں علم نہ ملنے کا کوئی غم نہیں ہمیں تو شرم آ رہی ہے۔ اپنی حماقت پر۔ ہم ایسی بچپنے کی باتیں کرتے چلے گئے۔ اب سب ہمارا دل ہی دل میں ہمارا مذاق اڑا رہے ہوں گے۔ اس لیے ہماری گردن جھکی ہوئی ہے۔"

"تمہاری عمر دراز ہو، دنیا بھر کی کامیابیاں نصیب ہوں۔ جاؤ مبارک دو۔ اور اپنے سچے دل سے پتہ دیکھے کو نہیں۔"

جب عونؓ اور محمدؓ مبارک باد دینے گئے تو عباسؑ نے عونؓ سے کہا۔

"ذرا ہمارا یہ علم تو تھامو ہم ذرا یہ تسمہ اچھی طرح باندھ لیں؟"

عونؓ کا منہ فق ہو گیا۔

"نہیں بدشگونی ہو جائے گی تو ...."

"تم دونوں مل کر تھامو ...... بدشگونی نہیں ہو گی۔" انہوں نے دونوں کو علم تھما دیا۔

دونوں کے دل دھک دھک کر رہے تھے۔ چہروں پر ایک رنگ آ رہا تھا۔ ایک جا رہا تھا۔ عباسؑ بڑے اطمینان سے تسمہ باندھ رہے تھے۔ علی اکبرؓ اور قاسمؓ بھی قریب آ گئے۔ شاید اس خیال سے کہ علم ڈگمگائے تو سنبھال لیں گے۔ مگر عباسؑ نے ان کو اشارے سے منع کر دیا۔

"علم جب ہی گرتا ہے، جب علم بردار گرتا ہے۔ عمر کی قید نہیں۔ یہ تو جذبے کی شدت پر ختم ہے۔ عونؓ، محمدؓ۔ امام کے الفاظ یاد نہیں۔ اس جہاد میں چھوٹا بڑا، ہر فرد سپاہی ہے اور اپنا مورچہ سنبھالے ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وقت پڑا تو تم اکیلے نہ سہی دونوں مل کر اس علم کی دعوت کو قائم رکھو گے؟"

بچے چاروں طرف سے علم کو گھیرے کھڑے تھے۔ کوئی چوم رہا تھا۔ کوئی آنکھوں سے لگا رہا تھا۔ سبز پھریرا ہوا میں لہرا رہا تھا۔ آنکھوں کو عجیب تراوٹ مل رہی تھی۔

"اب علم کو دیکھتی ہوں تو میری پیاس کم ہو جاتی ہے۔" سکینہ نے سوکھے ہونٹوں پر خشک زبان پھیر کر کہا۔

اُدھر امام حسینؑ کی مختصر سی فوج علم اور علم بردار کے انتظار میں بے قرار تھی۔ سب جانتے تھے کہ حسینؑ ابن علیؑ کو اپنی بہن سے بے انتہا لگاؤ ہے۔ وہ فاطمہؑ ثانی ہیں۔ بغیر ان کے پوچھے وہ ہر کام میں ان سے مشورہ ضرور لیتے ہیں۔ علم برداری کے لیے خود انھوں نے عباسؑ ابن علیؑ کا نام تجویز کیا تھا۔

اتنے میں عباسؑ علم سنبھالے آہستہ قدم اٹھاتے باہر آ گئے۔ لوگ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ ایسا معلوم ہوا خود شیر خدا علیؑ ابن ابی طالب علم اٹھائے چلے آ رہے ہیں۔ چہرے پر انتہائی جلال، آنکھوں میں سرخ ڈورے خون بھری تلواروں کی طرح کھنچے ہوئے تھے۔ لوگ انہیں ماہ بنی ہاشم کہا کرتے تھے۔ اتنے حسین و جمیل تھے کہ جب سڑک پر نکلا کرتے تھے تو راہ چلتے ٹھٹھک کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ قد آور ایسے کہ عربی گھوڑے پر سوار ہوتے تو آسانی سے پیر زمین پر ٹکا لیتے۔ روز صبح ان کا چہرہ دیکھنا اچھا شگون مانا جاتا تھا۔ لوگ انہیں رحمت کا پیامبر کہتے تھے۔ ہر چہار طرف مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ پہلے علم بردار علم اٹھائے نکلے۔ پھر خیمے کا پردہ اٹھا۔ اور امام حسینؑ نے قدم باہر رکھا۔

مختصر سے مجمع پر سناٹا طاری ہو گیا۔ ایک عرصۂ دراز کے بعد امام کو سپاہی کے لباس میں دیکھا تھا۔ ستاون برس کی عمر میں کوئی عرب بوڑھا نہیں ہوتا۔ پھر امام نے ایسی پابند اور اصولی زندگی گزاری تھی کہ اپنی عمر سے بہت کم معلوم ہوتے تھے۔ جسم پھرتیلا اور انتہائی سڈول تھا۔ چال میں اعتماد اور یقین تھا۔

سب با ادب کھڑے ہو گئے تو ابن مظاہر نے کہا۔

"خدا کا شکر ہے کہ وقت آزمائش آ پہنچا۔ ہاں دوستو! سرفروشی کی تمنا دلوں میں گھٹ کر دم نہ توڑ دے۔ آج جنگ کا مزہ ہے۔ خوب دل کے ارمان نکلیں گے۔ دیکھنا ہے سرفروشی میں کون فضیلت پاتا ہے۔ کس کس کی لاش مقدس کا سایہ نصیب ہوتا ہے۔" انہوں نے علم کے پھریرے کا کونا آنکھوں سے لگا کر چوم لیا۔ علم برداری کا عہدہ پانے پر سب نے عباسؑ ابن علیؑ کو

پُرجوش مبارک باد دی۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

"عباسؑ جیسے جانِ رعنا سے بہتر اور کون اس عزت کا حق دار ہے۔ علیؑ کا ہونہار فرزند، حسینؑ کا دستِ راست، بزرگوں کی وقعت کرنے میں پیش پیش، ہمراہوں کا ہمدرد ہمراز، بچوں پر جان فدا کرنے والا، کون سی ایسی صفت ہے جو اس اللہ کے حبیب نجیب با وقار وفا شعار کریم اور دل کا غنی، جان بازی جس نے ورثہ میں پائی اور سچائی جبلی خصلت ہے۔ دنیا میں ابوالفضل عباسؑ جیسا سخی اور منکسر المزاج سورما مشکل سے ملے گا۔ ان کی دوستی نعمت اور غصّہ خدا کی پناہ۔"

سبز پرچم ایک تناور درخت کی طرح جھوم رہا تھا۔ اس کے سائے میں علیؑ کا لالِ غیّور سر اٹھائے کھڑا تھا۔ پنجے کے نور سے سورج کی آنکھیں بھی چکا چوند ہو رہی تھیں۔ پھر یرے کی ایک ایک شکن مرجِ کوثر کی یاد تازہ کر رہی تھی۔ ننھی سکینہ نے بڑی پتے کی بات کہی۔

"علم کو دیکھ کر پیاس بجھ جاتی ہے۔"

اللہ اللہ کیا عجیب و غریب فوج تھی۔ گنتی کے چند افراد مگر ایک ایک اپنی جگہ بے مثال، دشمن کے ہزاروں پر بھاری، ایک ایک شخص جوان اپنی مثال آپ تھا۔ ایک طرف خوب رو علی اکبرؑ تھے۔ جنہیں سب ہم شکلِ پیغمبرؐ کہا کرتے تھے۔ چہرے پر زہرا فی کے باوجود رعب اور دبدبہ تھا۔ قاسمؑ کی شان ہی نرالی تھی، کچھ بچپن تھا، کچھ آمدِ شباب کی حدت، جنگی پوشاک کا بوجھ عجب بے تکا سا لگ رہا تھا۔ شیرِ خدا کے نواسے عون اور محمد کو اس کم سنی میں مسلح دیکھ کر کلیجہ مسل جاتا تھا۔ یہ عمر کھانے کھیلنے کے لیے ہوتی ہے۔ یا جنگ و جدل کی۔ کھلونوں سے کھیلنے والے ہاتھوں میں زمانے نے تلوار پکڑا دی تھی۔ ذرا ذرا سے بچے دلیری اور شجاعت کا نمونہ بنے ہوئے تھے۔ کاندھوں پر بیچھے دھرے ایسے مستعد کھڑے تھے کہ ان کے آگے رستمِ زماں بھی آ جائے تو ایک دفعہ تو چونک پڑے۔ بڑے جوش و خروش سے آستینیں چڑھائے بے تاب ہو رہے تھے۔ جیسے جنگ نہیں کوئی بچوں کا کھیل ہو۔ پیاس کی شدت سے ہونٹ خشک تھے۔ مگر ہونٹوں پر زبان پھیرنے کے بھی روادار نہ تھے۔

طبلِ جنگ پھر گرجنے گرجنے لگا کہ صحرا کی زمین ہل گئی۔ جنگل کانپ گیا۔ ڈھالیں جاننے

آہنی اور تلواروں کے پھل چمک اُٹھے۔ سب سر سے کفن باندھ کر موت کو لبیک کہنے کے لیے تیار ہو گئے۔ یکبارگی حسینؑ کی فوج سے نعرہ بلند ہوا۔

یا حیدر!

غنیم کی فوج میں غل پڑ گیا۔ یہ نعرہ بڑی بڑی فوجوں کو پیٹھ دکھانے پر مجبور کر چکا تھا۔ نیزے بلند ہوئے اور طیوں پر تیر چڑھائے جانے لگے۔

"ابھی کوئی ہماری طرف سے کوئی پہل نہیں کرے گا۔ میں صاحب قرآں کا فرزند ہوں میں پہلے دشمن پر کبھی حملہ نہ کروں گا۔ قتل وغارت میرا پیشہ نہیں۔ صرف اپنے عزیزوں کی جان اور ناموس کی حفاظت میں جہاد کرنے پر مجبور ہوا ہوں۔"

پھر بلند آواز میں غنیم کی فوج سے مخاطب ہو کر کہا۔

"اگر مناسب سمجھو تو تھوڑی دیر کے لیے باجوں کا شور بند کر دو۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ غور سے سن لو۔"

یہ سنتے ہی گویا ساری فوج پر ایک دم سناٹا چھا گیا۔ طبل جنگ خاموش ہو گئے۔ قرنا کی آواز گھٹ گئی۔ اور جھانجھ ساکت ہو گئے۔ باجے کہاں بجاتے۔ ان لوگوں کے تو حواس بجا نہ تھے۔ بڑے زور شور سے چڑھائی کر کے آئے تھے۔ مگر دلوں میں رسول خدا کے نواسے کا رعب وجلال دہشت بٹھائے ہوئے تھے۔

جب غل کم ہو گیا تو امام حسینؑ کی آواز دشت وصحرا میں گونجنے لگی۔

"جانتے ہو یہ فوج کشی تم کس کے خلاف کرنے آئے ہو؟ میں حسینؑ اس پیغمبر خدا کا نواسہ ہوں، جس نے تم کو سیدھا راستہ دکھایا۔ انسان بنایا۔ اور تمہیں مسلمان یعنی امن اور سلامتی کا امانت دار بنایا۔ میں اس شیر خدا کا فرزند ہوں۔ جس کے زور بازو سے اسلام عروج کو پہنچا۔ بس تو میرا یہی قصور ہوا نا کہ میں اسلام کے بانی کا نواسہ ہوں۔ اور عرب قوم کے عظیم فاتح کا بیٹا ہوں۔ میں تم سے پوچھتا ہوں۔ میں نے کسی کو کیا نقصان پہنچایا ہے۔ کیا کسی کی جائداد ہضم کی ہے۔ کسی کا خون کیا ہے؟"

"نہیں۔" فوج سے بے اختیار آوازیں بلند ہوئیں۔

"تو پھر کس جرم کی سزا میں تم مجھ پر چڑھائی کر کے آئے ہو، کیا قتلِ سادات سے تمہیں ثواب ملے گا۔"

"نہیں" فوج کے حلق سے وہی صدا بلند ہوئی۔

"کیا اپنے نبی کے خاندان کا آخری چراغ بجھا کر تمہاری نفرت کی آگ بجھ جائے گی؟"

"نہیں!"

"تو پھر کیوں مٹھی بھر مظلوموں پر اتنی زبردست فوج لے کر حملہ آور ہوئے ہو۔ کیا یہی عرب قوم کی بہادری اور جواں مردی کا تقاضا ہے؟"

شمر کی فوج میں پریشانی پھیل گئی۔ ابنِ زیاد بوکھلا گیا۔

"حسین ابنِ علیؑ ہماری فوج کو ورغلا رہے ہیں۔ ان کے یقین اور ایمان پر چوٹ کر کے انھیں بوکھلا دینا چاہتے ہیں۔ ان سپاہیوں سے کہو یہ کتوں کی طرح بے سمجھے بوجھے نہیں نہیں نہ بھونکیں۔"

فوراً سرداروں نے اپنے دستے کے منہ زور سپاہیوں کے منہ بند کر دیئے۔ ایک خاص دستہ جو چنے ہوئے ہٹے کٹے سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ لشکر پر چابک کی طرح استعمال کیا جاتا تھا۔ امام جو کچھ کہہ رہے تھے۔ وہ زیادہ سپاہیوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

سپاہیوں میں ویسے بھی عقل کتنی ہوتی ہے۔ پھر یہ فوج کسی عظیم مقصد کو واضح کرنے کے بعد تیار نہیں کی گئی تھی۔ زیادہ تر کو تو یہ بھی خبر نہیں تھی کہ وہ کس کے خلاف فوج کشی کر رہے ہیں۔ بہتوں کو امام حسینؑ کے بارے میں کچھ ٹھیک معلومات نہ تھیں۔ امیر معاویہ نے اپنی زندگی میں ہی آلِ رسولؐ کا ذکر کرنا فضول اور اکثر جرم قرار دے دیا تھا۔ سب انھیں کو پیغمبرِ خدا کا جائز وارث اور مسلمانوں کا خلیفہ مانتے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو بس یہ جانتے تھے کہ پیغمبر کے کچھ رشتہ دار بقیدِ حیات ہیں۔ مگر وہ کون ہیں، کہاں ہیں۔ یہ قطعی نہیں معلوم تھا۔

کچھ ایسے بھی تھے جو یہ جانتے تھے کہ ان کے ایک نواسے امام حسین ابنِ علیؑ مدینہ میں ہیں۔ ان سے انھیں غائبانہ عقیدت تھی۔ کبھی دیکھا نہ تھا اور خواب و خیال میں بھی نہ سوچتے تھے کہ اس وقت امیر المومنین جو خدا کی رحمت ہے، پیغمبرِ خدا سے بیر پال سکتا ہے۔

بہت تھوڑے لوگ ایسے تھے جو صحیح حالات سے بخوبی واقف تھے۔ مگر باقی حُر کی طرح کسی مغالطے میں تھے اور حکم حاکم سمجھ کر ڈیوٹی پر آئے تھے۔ مگر یقین تھا کہ خون خرابے تک نوبت نہیں پہنچے گی۔ کوئی راہ نکل آئے گی۔ سمجھوتہ ہو جائے گی۔ حسینؑ قائل ہو جائیں گے۔ کچھ یزید کی طرف سے مروت اور رعایت ہوگی۔ یہ خبریں انہی لوگوں کے منہ سے نکل رہی تھی۔ مگر اس کی پیش بندی ضروری تھی۔ اس لیے ابن سعد نے امام کی بات کاٹ کر کہا۔

"یا حسینؑ یا ابن علیؑ آپ ہمیں بے وقوف نہ سمجھئے۔ ہم ان باتوں میں آنے والے نہیں۔ آپ خلیفہ وقت کے خلاف بغاوت کر رہے ہیں۔ آپ بیعت کر لیجئے، بات ختم ہو جائے گی۔"

"اگر جیسا کہ تم کہتے ہو بے وقوف نہیں تو اپنی عقل مندی کا ثبوت دو اور صاف کہو کہ بات ختم نہیں ہوگی جب تک میں زندہ ہوں، بات چلتی رہے گی۔"

"ہم آپ سے قسم کھا کر وعدہ کرتے ہیں کہ اگر بیعت کر لیں تو ہم آپ کو بڑی عزت سے کوفہ کے حاکم کے پاس لے جائیں گے کہ یہی حکم ہم کو ملا ہے۔ ہمیں آپ کو ختم کرنے کا کوئی حکم نہیں ملا۔"

"یا تو تم جھوٹے ہو یا تم اپنے آقا کے ساتھ نمک حرامی کر رہے ہو۔ کیونکہ اگر ہمیں قتل کرنے کا حکم نہیں تو پھر ہم پر پانی کیوں بند کیا ہے۔ رہی عزت کے ساتھ کوفہ لے جانے کی بات تو یہ بھی معلوم ہوگا کہ پھر کوفہ عزت کے ساتھ ہمیں یزید کے دربار میں بھیج دیں گے۔"

"واللہ آپ کا بال بیکا نہ ہوگا۔ اگر آپ صلح و آشتی کے ساتھ خود کو ہمارے حوالے کر دیں تو آپ کی جان کو کوئی خطرہ نہیں۔"

"میں خدا کے علاوہ خود کو کسی کے حوالے نہ کروں گا۔ میں جھوٹ پر سچ کو ترجیح دیتا ہوں۔ اور ضمیر فروشی سے موت کو بہتر سمجھتا ہوں۔ میں تمہارے بادشاہ کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ اس کے ہاتھ پر بیعت کروں۔ رسول اللہؐ کی امت کو ایک ایسے انسان کے رحم و کرم پر ہرگز نہیں چھوڑ سکتا۔ معصوم اور بے گناہ انسانوں کے خون سے آلودہ ہاتھ پر بیعت کر کے اپنے یقین اور شعور کا گلا نہیں گھونٹ سکتا۔"

"یہ ناعاقبت اندیشی ہے حسینؑ! اگر آپ بیعت کر لیں تو اپنے اہل و عیال کی جانیں بچا

"اور تمہارا شہنشاہ مجھ سے خوش ہو کر مجھے مالا مال کر دے گا۔ زر اور جاگیر سے نوازے گا اور میری آل و اولاد بجائے پیاسی دم توڑنے کے عیش و عشرت کی زندگی گزارے گی۔"

"اس میں کیا شک ہے، ہمارا آقا سخی اور دریا دل ہے۔"

"مگر وہ جو مجھے اس قدر نعمتیں کا وعدہ کرتا ہے۔ اس کے عوض میں وہ مجھ سے کیا لے گا؟"

"کچھ نہیں، دوستی اور آپ کی خوشنودی۔"

"وہ اس جواب کے بعد بھی کیا تمہیں وہم ہی ہے کہ تم احمق نہیں۔ میری دوستی اور خوشنودی کے لیے وہ میرے قتل کا سامان کر رہا ہے۔ کتنی مضحکہ خیز بات ہے۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ اسے میری بیعت کی اس لیے ضرورت ہے کہ وہ غاصب اور مکار ہے۔ فریبی اور دروغ گو ہے۔ اسلام کا ہر اصول پیروں تلے مسل کر داد عیش دینے کے لیے انسانوں کی زندگی اجیرن کر چکا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس نے تلوار اور لشکر کے زور سے لوگوں کے منہ بند کر دیئے ہیں۔ زبردستی ان کے سر اپنے قدموں پر جھکا دیئے ہیں۔ مگر عرب قوم کی خودداری اگر بیدار ہو گئی اور انہیں پوری طرح یہ احساس ہو گیا کہ ان کے حقوق سلب ہو گئے ہیں تو وہ اس کا تختہ الٹ دیں گے۔ اسے ڈر ہے کہ یہ جذبہ ان میں مجھے دیکھ کر پیدا ہو گا۔ کیونکہ میں جو رسول خدا کا نواسہ ہوں۔ اور اس کی شہنشاہیت کو میں اسلام کی توہین سمجھتا ہوں۔ کچھ لوگ ہیں کہ جو میرے ہم خیال ہیں میرے اصولوں کی قدر کرتے ہیں۔ وہ آج پیچھے دھکیلے گئے ہیں؛ خاک میں ملا دیئے گئے ہیں۔ کل یہ مٹی بھڑک کر آندھی بن جائے تو تمہارے آقا کا تخت و تاج خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ یہ ایک بے حقیقت قطرہ کل طوفان بن سکتا ہے۔ جو اس کے جمے جمائے نظام کو بہا دے گا۔ وہ نظام جو صرف چند طاقت ور چھوکروں کی مطلب پرستی سے چل رہا ہے۔ تمہارا شہنشاہ عرب قوم سے اور مسلمانوں سے لرزاں و ترساں ہے۔ میری بیعت اس کا ثبوت ہو گی کہ اس کے افعال شرع محمدی کے عین مطابق ہیں۔ ان پر قابو پانے کے لیے میری مدد درکار ہے۔ اسی لیے وہ میری دوستی اور خوشنودی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ پھر جن لوگوں کے دلوں میں شبہے ہیں۔ وہ مٹ جائیں گے۔ اور وہ سچے دل سے اسے اپنا خلیفہ مان لیں گے آنکھ بند کر کے بیعت کر لیں گے۔ اور ان کی اس غلطی کی اصل ذمہ داری مجھ پر عائد ہو گی۔ وہ مجھے بھی شریک کار تصور کریں گے۔ میں نے ہر شے سے ہاتھ کھینچ کر گوشہ نشین ہو گیا ہوں۔ میں اپنے وطن میں غریب الوطن ہوں۔

ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو۔ تم اپنے آقا کے نمک خوار ہو اس کا حکم تمہارا دین و ایمان ہے تم اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہر جا و بے جا حکم ماننے کو تیار ہو۔ حتیٰ کہ تمہیں میرا اور میرے بچوں کا خون کرنے سے بھی گریز نہیں۔ تم اپنے ضمیر کے مالک ہو تو مجھے بھی اتنی اجازت دو کہ میں بھی اپنے مالک کو روزِ محشر منہ دکھانے کے قابل رہ سکوں۔ میں تمہارے نبی کا نواسا اور مسلمان ہوں۔ مجھے ایمان فروشی پر مجبور کر کے گناہ گار نہ بنو۔"

قیم کی فوج کو پگھلتے دیکھ کر سپہ سالار اور اہم عہدے دار خائف ہو گئے۔ زور زور سے پکارنے لگے "اے عرب کے جانبازو! حسینؓ جادوگر ہیں۔ الفاظ کا جال بن کر تمہیں پھانس رہے ہیں۔ ان کی باتیں نہ سنو، اپنے کان بند کر لو۔ یہ تمہیں ورغلا رہے ہیں۔ خلیفۂ وقت جن کے سر پر خدا کی برکتوں کا سایہ ہے۔ جو تمہارا بہی خواہ اور رہنما ہے۔ یہ تمہیں اس کے خلاف بھڑکا رہے ہیں۔ ان کی باتوں میں آؤ گے تو دین و دنیا سے جاؤ گے۔ ہمارا خلیفہ رحم دل اور فیاض ہے۔ مگر اس کی نافرمانی کرو گے تو اس سے زبردست قاہر اور جابر دنیا کے پردے پر نہیں۔ اس کی حکم عدولی کا کیا انجام ہو گا۔ تمہارا گھر بار آل و اولاد تباہ و برباد کر دیا جائے گا۔ تمہارے گھروں کو آگ لگے گی۔ بچے غلام بنا کر بیچے جائیں گے تمہاری کمسن کنواری بیٹیاں جذامیوں کو بیاہ دی جائیں گی۔"

"یہ جھوٹ اور افترا ہے۔ مجھے ملک گیری کی کوئی ہوس نہیں۔ تمہارے بادشاہ کا تاج و تخت ٹھوکر پہ مارتا ہوں۔ اگر آج میں چاہوں تو میری آواز پہ لاکھوں سپاہی لبیک کہنے کو تیار ہیں۔ اگر میں فاتح بننا چاہوں تو عظیم الشان فوج میرے علم کے سائے میں جمع ہو سکتی ہے۔ میری ایک پکار پہ لاکھوں تلواریں میان سے نکل سکتی ہیں۔ عرب قوم ہی نہیں بیرونی ممالک سے مجھے ہتھیار مدد مل سکتی ہے۔ اور میں برسوں یہ جنگ جاری رکھ سکتا ہوں۔ مگر میں ایسا نہیں کرنا چاہتا۔ میری مصلحت تمہیں مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہو گی۔ مگر میں نے رسولِ خدا کی آغوش میں پرورش پائی ہے۔ ماں کے دودھ میں سچائی ملی۔ اور دلیری اور بہادری باپ کے زانو پہ بیٹھ کر زندگی کے اصول سیکھے ہیں۔ میں ضمیر فروشی نہیں کر سکتا۔ مطلب پرستی میرے خمیر میں نہیں۔ دیکھو ذرا غور سے دیکھو میرے جسم پہ یہ قبا کس کی ہے؟ پہچانتے ہو۔ اس دستار کو، اس بد نصیب جسم پہ چار آئینہ اور بکتر کس کا ہے؟ یہ گھوڑا جس پر میں سوار ہوں، یہ تیر، یہ تلوار ذوالفقار، یہ وہ تحفہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجھے بخشا ہے۔ کیا تم اپنے نانا رسول

خدا کی امت کا خون بہانا برداشت کر سکتا ہوں؟ میں نے تمام ایسی تجویزوں کو جو اکثر میرے سامنے پیش کی گئیں سختی سے رد کر دیا۔ میں اسلام میں پھوٹ ڈالنا نہیں چاہتا۔ کہ بھائی بھائی کا خون بہائے۔ میں تو امن سکون کی تلاش میں اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ وطن کو خیرباد کہہ کر نکلا ہوں کہ دنیا کے کسی گمنام سے کونے میں خدا کی حمد و ثنا میں زندگی گزار سکوں۔ میں احسان جتانے والوں میں سے نہیں، مگر تم حر سے پوچھو میں چاہتا تو اسے اور اس کی پیاسی فوج کا دم بھر میں قلع قمع کر دیتا۔ مگر جب میں نے دیکھا کہ پیاس سے انسانوں اور جانوروں کی زبانیں نکل پڑی ہیں، مجھ سے ان کی یہ بدحالی نہ دیکھی گئی۔ دو شر میں ملی ہوئی شجاعت اور نرم دلی آڑے آئی۔ مگر ایک وہ دن تھا، ایک آج کا دن ہے۔ دوسروں کو پانی پلانے والے آج خود تین دن سے پیاسے ہیں۔ اگر اس دن ہم نے حر کو پانی نہ دیا ہوتا تو باوجود تمہاری ناکہ بندی کے آج ہمارے پاس کم از کم بچوں کے لیے پانی تو ہوتا۔ اور ہمارے حلق یوں پیاس سے نہ چٹختے۔" امام کی آواز رندھ گئی۔ بڑی دھیمی آواز میں فرمایا: "میں کس سے کیا امید کروں۔ سبھی نے نگاہیں پھیر لی ہیں۔ کوئی ایک بوند پانی کا روادار نہیں۔ ہر نبی کی اولاد کا اس کی امت پر حق ہوتا ہے مگر میں اس حق کا واسطہ نہیں دیتا۔ انسانیت کا واسطہ دیتا ہوں۔ بچوں کی پیاس مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ ان میں اکثر معصوم اور کمسن ہیں۔ بس لبوں پر دم ہے۔ سامنے دریا موجیں مار رہا ہے اور میرے بچے بوند بوند کو ترس رہے ہیں۔ تمہارے جانور پانی کو غلاظت سے ناپاک کر رہے ہیں۔ غلام تمہارے گرد زمین پر چھڑکاؤ کر رہے ہیں۔ میرے پیاروں کے حلق میں کانٹے پڑ رہے ہیں۔ سجاد بیمار ہیں۔ دوا تو کیا پانی تک زبان تر کرنے کو نہیں۔ علی اصغر کو دودھ نہیں ملتا۔ کوئی بات نہیں، مگر ایک چلو پانی بھی حلق میں ٹپکانے کو نہیں۔ جب ان بچوں کے نیم مردہ چہرے دیکھتا ہوں مجھ پر جانکنی کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ اے مسلمانو! خدارا باز آؤ اس ظلم و جبر سے، آلِ رسول کے خون سے ہاتھ نہ رنگو۔"

امام حسینؑ ابن علیؓ کی تقریر ختم کر چکے تو سارے لشکر پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ پھر سب چیخیں مار مار کر رونے لگے۔ بے قرار ہو کر صفیں آگے بڑھیں۔ دوسرے لمحے خاطی دستان کے اور امام کے درمیان آہنی دیوار کی مانند در آیا۔

"وا حسینا!"

لشکر کے حلق سے نعرے بلند ہونے لگے اور عمر سعد نے خود اپنی فوج کو گاجر، مولی کی طرح کاٹنے کا حکم دے دیا۔

امام گھوڑا پلٹا کر اپنے خیموں کی طرف لوٹ گئے۔ بڑی دیر کے کشت و خون کے بعد صفیں دوبارہ مرتب کی گئیں۔ نہ جانے کتنی لاشیں ریت کے ٹیلوں کی اوٹ میں تڑپ دی گئیں۔

عمر سعد بار بار حر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ حر اس ڈرامے کے دوران پتھر کے بت کی طرح اپنے گھوڑے پر کر تختہ کیے بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں کسی نامعلوم محور پر جمی ہوئی تھیں۔ بے اختیار آنسو بہہ رہے تھے۔ لب ہل رہے تھے۔

"یا خدا، یا خدا" حر زیرِ لب کہہ رہا تھا۔ "حسینؑ ابن علیؑ نے ایک ایک لفظ درست کہا۔ جو بغض کرے وہ کافر مردود۔ حسینؑ رحمتِ خدا ہیں۔ جنتی ہیں ان کے دوست و طرفدار، دین و دنیا کی دولتیں ان کے قدموں میں ہیں۔ سخاوت و دریا دلی ان کا ورثہ ہے! ہیہات جن کے در سے کبھی کوئی سائل خالی ہاتھ نہ گیا۔ وہ آج ہم درندوں کے آگے ہاتھ پھیلا رہا ہے۔ بس دو بوند پانی کی خاطر کہ دم توڑتے بچوں کی جان بچ جائے۔ اے مسلمان قوم تیرا کیا انجام ہونے والا ہے؟"

یہ سن کر عمر سعد بوکھلا گیا۔

"تم امام کی حمایت کر رہے ہو۔ یہ صاف غداری ہے۔ اپنے آقا کی تعریفوں کے بجائے حسینؑ کے گن گا رہے ہو۔ میرے مخبر کہتے ہیں کہ کئی دن سے تمہارا رنگ ڈھنگ بدلا ہوا ہے تمہاری باتوں سے صاف نمک حرامی کی بو آتی ہے۔ محمدؐ کا نواسہ جو خود بے پر اور کنگال ہے تمہیں کیا تاج و تخت بخش دے گا۔ انھوں نے تمہیں کون سے سبز باغ دکھائے ہیں۔ ہنہہ! یہ محتاج کیا سخاوت کریں گے۔ شاید تم بہشت کے لالچ میں یوں ڈانواڈول ہو رہے ہو۔ حسینؑ ابن علیؑ سے یہ لگاوٹ اچھی نہیں۔ بہت پچھتاؤ گے۔"

"اب اس سے زیادہ کیا پچھتاؤں گا۔ میں ہی انھیں گھیر کر ادھر لایا ہوں۔" حر نے مردہ دل سے کہا۔

"حر! مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ تم ایک بہادر سپاہی اور اول درجے کے سردار ہو، بال بچے والے آدمی ہو، تمہارا مستقبل روشن ہے۔ دربار میں تمہاری اس ہوشیاری کی بڑی واہ واہ ہو رہی ہے

تم نے بڑی دوراندیشی سے حسینؑ کا پانی ختم کروا دیا۔ ورنہ شاید یہ لڑائی اور زیادہ دن گھسیٹنی پڑتی، تمہاری مہربانی اور عقل مندی کی بدولت آج حسینؑ کی ہمت ٹوٹ چکی ہے۔ کوئی دم جاتا ہے کہ وہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو کر بیعت کر لیں گے۔ ذرا سوچو تو ہمیں کیسی سرخروئی اور شہرت نصیب ہوگی۔ ہم نے وہ شیر زیر کیا۔ جس کی دہشت سے ہمارا آقا بدحواس ہو رہا ہے۔ عربوں میں ہمارا نام آفتاب کی مانند چمکے گا۔ انعام و اکرام بے حساب ہاتھ آئے گا۔ بس حسینؑ ٹوٹنا ہی چاہتے ہیں۔ ایک آنچ کی کسر ہے۔ بس سونا ہی سونا!"

"حسینؑ قیامت تک نہیں ٹوٹیں گے۔ وہ ہرگز بیعت نہیں کریں گے۔" حرؑ ترشی سے بولا۔

"تو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ کچھ بھی ہو قصہ ختم ہو جائے گا۔ میں بھی سوچتا ہوں اگر حسینؑ نے بیعت کر لی تب بھی انہیں یزید کے دربار میں حاضر تو ہونا ہی پڑے گا۔ بڑی طوالت ہوگی۔ کہیں راستے میں ہنگامے شروع ہو گئے۔ مصیبت یہ ہے کہ بیعت کی صورت میں بھی بڑی مصیبتیں نازل ہوں گی۔ ان کے موافق اور مخالف گروہ تباہ کاریوں پر تل جائیں گے۔"

"امام بیعت نہیں کریں گے۔ تم خاطر جمع رکھو۔" حرؑ نے بڑے یقین سے کہا۔

"راستہ میں پانی پلا کر حسینؑ نے تمہارا ایمان خرید لیا۔ گھوم پھر کر تم ان کی تعریفوں پر آ جاتے ہو۔ کتنی شرم کی بات ہے۔ کھلم کھلا دشمن کی طرف داری کئے جاتے ہو۔ جنگ میں تو نبی ہو یا رسول، ہم مروت کے قائل نہیں۔ بس ہمیں تو حاکم کے حکم سے کام ہے۔"

"لعنت ہو تم پر بد بخت تم گردن زدنی ہو۔ کیا تمہیں لمحہ بھر کو بھی یہ خیال نہیں آتا کہ حسینؑ کون ہیں، رسول اللہؐ کے چہیتے نواسے ہیں۔ جن پر ہم درود بھیجتے ہیں۔ جن کا نام ہم خدا کے نام کے ساتھ لیتے ہیں۔ آج وہ اس بلا میں گرفتار ہیں۔ میرا کلیجہ پھٹ گیا۔ آج ان کی یاسیت سے بھری تقریر سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔"

عمر سعد کا رنگ سفید پڑ گیا، جھنجھلا کر کہا۔

"کیا بزدلوں والی باتیں کر رہے ہو، تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ حرؑ کیوں تمہاری شامت آئی ہے۔ کیا واقعی خاک میں ملنے کا ارادہ ہے؟"

"حسینؓ جیسے خدا کے عزیز بندے جب خاک میں مل سکتے ہیں تو ہم کس شمار و قطار میں ہیں۔ عمر سعد تم واللہ نہایت سمجھ رہے ہو۔ یہاں جانوں پر بنی ہے اور تمہارا دم انعام و اکرام میں پڑا ہوا ہے۔" حُر نے بل کر کہا۔

"حُر کیوں اپنی جان کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہے۔ تو جانتا ہے ہم سب کے پیچھے مخبر لگے رہتے ہیں، تیری حرکتوں کی اطلاع جب مجھے مل گئی تو خلافت کے دربار تک بھی پہنچ جائے گی۔ پھر سوچ تیرا کیا انجام ہوگا؟"

"تمہیں کیوں میری اتنی فکر پڑی ہے۔ نہ میں تمہارا جنتی ہوں نہ داماد، تمہاری بلا سے۔"

"بس بس، سر پر ہی چڑھا آتا ہے نا معقول پاجی، میرے اہل کار تمہاری زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ لکھتے رہے ہیں۔ یہ مہم ختم ہوئے تو دربار میں تمہارا مقدمہ اٹھایا جائے گا۔ تم نے اب تک خلیفہ کی مہربانیاں دیکھی ہیں۔ ان کا غصہ بھی چکھ لینا۔"

"یہ دھمکیاں اسے دو جو عذاب دنیا سے ڈرتا ہو۔ کہہ دو اپنے اہل کاروں سے۔ جو جی میں آئے شوق سے میرے خلاف لکھیں۔" یہ کہہ کر حُر نے گھوڑا گھمایا اور ایک طرف چل دیا۔ عمر سعد نے کچھ سپاہیوں کو پیچھے لگا دیا کہ "خبردار آنکھ سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ اس کے ارادے اچھے نہیں۔ نیت میں فتور معلوم ہوتا ہے۔ سخت نگرانی کی ضرورت ہے۔"

امام حسینؓ ناکام واپس خیمے تک پہنچے۔

"میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔" انھوں نے ساتھیوں سے کہا۔

"میرا دل کہتا ہے کہ میں بھی ایک دفعہ ان نا عاقبت اندیش احمقوں سے بات کر کے دیکھوں۔" زہیر ابن قین نے کہا۔

"ضرور" امام مسکرا کر کہا۔ "یہ بھی ایک طریقہ جنگ ہے۔ فرق اتنا ہے یہاں تلواروں کے نہیں لفظوں کے وار ہوتے ہیں۔"

زہیر ابن قین گھوڑے پر سوار سر سے پیر تک زرہ میں غرق صف سے باہر نکلے اور پکار کر کہا۔

"اے کوفہ والو! خدا کے غضب سے ڈرو، ابھی تو ہم اور تم مسلمان ہیں۔ آپس میں۔ ایک ہی نبی کی امت ہیں۔ جب تک ہمارے تمہارے درمیان تلواریں نہیں کھنچیں ہمارا رشتہ قائم ہے۔ اسلیے مجھے حق ہے کہ تمہیں نصیحت کروں اب تک جب ہمارے درمیان تلوار چلنے لگے گی۔ اور بیچ میں خون گرے گا۔ اس وقت اسلامی رشتہ داری ختم ہو جائے گی۔ پھر ہم ایک امت اور تم دوسری امت ہو جاؤ گے۔ خدا نے آج حسینؓ ابن علیؓ کو ہمارے درمیان اس مجبور اور لاچار حالت میں کھڑا کر دیا ہے۔ اب وہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ ایسے وقت میں ہم اس کے بھیجے ہوئے پیغمبر کے نواسے کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ یہ بڑے امتحان کا وقت ہے۔ یزید اور عبیداللہ ابن زیاد کو تم بھی اچھی طرح جانتے ہو، میں بھی جانتا ہوں۔ انھوں نے ہمارے عالموں اور قرآن کے حافظوں کو بھی بے رحمی سے قتل کیا ہے وہ بھی ہم نے دیکھا ہے اور برداشت کیا ہے۔ اے مسلمانو! کب تک یونہی خاموش دیکھتے رہو گے۔ اور جو کچھ آج امام حسینؓ ابن علیؓ پر ستم توڑے جا رہے ہیں۔ کیا یہ بھی یونہی خاموش دیکھتے رہو گے۔ نہیں، عرب کے سردارو، تم اتنے بے حس اور بے حیا نہیں۔ تمہارا خون کھول رہا ہے۔ عمر ابن سعد کے وجود پر لعنت بھیجو، اس قتل سے باز آؤ اور اپنے اپنے گھروں کو واپس لوٹ جاؤ۔"

حکومت کے ہوا خواہ اور خوشامدی زہیر ابن قین کو برا بھلا کہنے لگے اور ابن سعد کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے۔ مگر بہت سے ہونٹ خاموش تھے۔ حسینؓ کے ورغلائے "قابو میں آ چکے تھے۔ اب زہیر ابن قین ان کے ایمان کو جھنجھوڑ رہے تھے۔

"خدا تیری زبان خاموش کرے۔" شمر نے ایک تیر لگایا اور جھلا کر کہا۔

زہیر ابن قین نے تیر کی نہ پرواہ کی نہ جواب دیا۔ شمر سے بولے۔

"اے شمر کیوں گناہگار ہوتا ہے۔ اب بھی وقت ہے توبہ کر اور اپنے ارادے سے باز آ۔"

"بس تھوڑی دیر میں تمہاری یہ زبان ہمیشہ کے لیے بند ہونے والی ہے۔"

شمر نے کہا۔

"تو مجھے موت سے ڈراتا ہے، خدا کی قسم حسینؓ کے ساتھ مرنا تم لوگوں کے ساتھ جینے سے زیادہ محبوب اور خوش گوار ہوگا۔ اے بندۂ زر! اگر تو نے پیغمبر خدا کی اولاد کا خون بہایا اور

ان کے عزیزوں اور دوستوں کو قتل کیا تو تیری بخشش ہرگز نہ ہوگی۔"

امام حسینؑ نے دیکھا زہیر ابن قین کی نصیحت کا کوئی فائدہ نہیں۔ آج دشمن کا سپاہی اپنی جگہ کھڑا ہوا خوف سے لرز رہا ہے۔ اس میں دم مارنے کی مہلت نہیں۔ انھوں نے کسی سے کہا۔

"زہیر بن قین سے کہو واپس آجائیں۔ انھوں نے اپنا حق ادا کر دیا۔ ہمارا دشمن آج بہرا بھی ہے گونگا بھی۔ اس پر کوئی اثر نہ ہوگا۔"

زہیر بن قین سر جھکائے واپس آگئے۔

"یا حسینؑ کیا واقعی یہ لشکر مسلمانوں کا ہے۔ تو پھر ان کی آنکھیں کیا ہوئیں۔"

"ان پر جہالت اور لاعلمی کی گرد جم چکی ہے۔ ایک چراغ اتنے دنوں پر برسوں کی جلتی ہوئی تاریکی کو ختم نہیں کر سکتا۔"

حرؓ نے پھر ایک بار عمر سعد سے کہا۔

"تو کیا واقعی جنگ ہوگی؟"

"جنگ ہوگی اور ضرور ہوگی۔ ایسی جنگ جسے زمانہ یاد رکھے گا۔"

"اتنے مطالبے جو حسینؑ ابن علیؓ نے پیش کئے ہیں۔ کیا ایک بھی منظوری کے قابل نہیں۔"

"خدا کی قسم اگر معاملہ میرے ہاتھ میں ہوتا تو میں ضرور منظور کر لیتا۔ ہمارے خلیفہ کو وہم ہو گیا ہے۔ امام سے انہیں کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔ تم ہی بتاؤ میں کیا کروں۔ تمہارا حاکم ابن زیاد مانتا ہی نہیں۔"

اس کے بعد حرؓ کو معلوم ہو گیا کہ کچھ کہنا سننا بے کار ہے۔ ہٹ کر ایک الگ مقام پر کھڑے ہو گئے۔ قرہ بن قیس جو حرؓ کے قبیلے سے تھا مگر حرؓ کے اوپر جاسوسی کی غرض سے تعینات کیا گیا تھا۔ قریب آ گیا۔ تاکہ حرؓ پر پوری طرح نگاہ رکھے۔

"تم نے اپنے گھوڑے کو پانی نہیں پلایا؟" حرؓ نے اس سے پوچھا۔

"نہیں۔"

"تو پھر پلاؤ گے نہیں؟"

ابن قیس سمجھ گیا۔ حرؓ اسے ٹالنا چاہتے ہیں۔ شاید جنگ میں حصہ لینے کا ارادہ نہیں۔

ڈرتے ہیں کہ میں مخبری کر دوں گا۔ تم جنگ میں حصہ نہیں چاہتے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ اس نے کہا "اچھا جاتا ہوں پانی پلا کے لاتا ہوں۔"

ابن قیس سے پیچھا چھڑا کر حُر نے بڑی ہوشیاری سے گھوڑے کو امام کے خیمے کی طرف بڑھانا شروع کیا۔

اتنے میں مہاجر بن اوس جو حُر کے قبیلہ کا تھا۔ پاس آیا اور بولا۔

"کیا حملہ کی تیاری ہو رہی ہے؟"

حُر نے کوئی جواب نہ دیا۔ مگر سر سے پیر تک کانپنے لگا۔

"حُر یہ تمہاری کیا حالت ہو رہی ہے۔ تم تو کوفہ کے سب سے بہادر سپاہی ہو۔ مگر اس وقت تمہارا چہرہ فق ہے۔ اور پسینے چھوٹ رہے ہیں۔ آخر بات کیا ہے؟"

"میرے سامنے ایک طرف جنت ہے، دوسری طرف دوزخ" حُر نے گھٹے ہوئے گلے سے کہا

"کیا فیصلہ کرنے میں تکلف ہو رہا ہے۔ تعجب ہے، تم بھی کیا مسلمان ہو۔"

"ٹھیک کہتے ہو، فیصلہ کرنے میں میں نے بہت لیت و لعل کی۔ خدا مجھے معاف کرے۔" یہ کہہ کر گھوڑے کو ایڑ لگائی اور گھوڑا کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح غائب ہو گیا۔ اس سے پہلے لوگ اپنے حواس جمع کرکے کچھ قدم اٹھاتے حر زد سے نکل چکے تھے!

غنیم کے لشکر میں غل پڑ گیا۔

"وہ دیکھو امام حسینؑ ابن علیؑ کا طرف دار ان کی خدمت میں جا رہا ہے۔"

عمر سعد کا رنگ فق ہو گیا۔ چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"حُر جیسا تابعدار دغا دے گیا۔" دو چار سواروں کو حکم دیا۔

"فوراً اس غدار کا پیچھا کرو اور زندہ مردہ جیسا بھی ہاتھ آئے ہمارے حضور میں پیش کرو" مگر حُر کا گھوڑا ابلق تھا کر چھلاوہ پلک جھپکنے میں غائب ہو گیا۔

حُر کو خیمہ حسینؑ کی طرف آتے دیکھ کر سب چونکتے ہو گئے۔ یزید سنبھل گئے۔ کمانیں کھنچ گئیں اور تلواریں سونت لی گئیں۔ مگر حُر کو اپنی جانب آتے دیکھ کر پہلے امام کے مرجھائے ہوئے

چہرے پر پھیل گئی۔ مسکرا کر عباسؓ سے بولے۔

"وہ دیکھو حسینؓ کا دوست آ رہا ہے۔ سب سے کہہ دو، کوئی روکے نہیں۔ تم جا کر اس کا استقبال کرو کہ بڑا مردم شناس آ رہا ہے۔ یا درعزیز جلدی پیشوائی کو بڑھو کہ ہمارا بہت پیارا دوست ہماری جانب آ رہا ہے۔"

دور ہی سے حُرؓ نے نعرہ لگایا۔

"اے جانِ رسولؐ زندہ باد۔ میں گناہ گار معافی کے قابل تو نہیں مگر آپ کی سخاوت اور دریا دلی آس لگا کر آیا ہوں۔ مجھے معاف فرما کر میری دنیا اور دین سنوار دیجیے۔ میرے آقا کئی روز سے مذبذب میں تھا۔ میرا دل و دماغ قابو میں نہیں تھا۔ کوئی راہ نظر نہ آتی تھی۔ بس اس کے سوا کوئی ٹھکانہ نظر آیا کہ آپ کے قدموں میں پناہ لوں۔ یہ گناہ گار بندہ اپنے وجود سے شرمسار ہے۔ مولائے دوعالم میری حالت پر رحم فرمایئے۔ مجھے اس کشمکش سے نجات دلایئے۔ میرا ضمیر کئی دن سے مجھے ملامت کر رہا ہے۔ خود سے گھن آ رہی ہے۔ آپ ہی مجھے اس عذاب روحانی سے نجات دلا سکتے ہیں۔ شیرِ خدا کا صدقہ ایک بھولے بھٹکے کو راہ دکھایئے۔"

امام حسینؓ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ ہنستے ہوئے دونوں بازو پھیلا دیئے اور تیزی سے حُرؓ کی جانب بڑھے۔ حُرؓ نے دوڑ کر قدم چوم لیے۔ امام نے اسے اٹھا کر چھاتی سے لگا لیا۔

"میں نے معاف کیا۔ میرے خدا نے معاف کیا۔ تیری رفاقت پر مجھے ناز ہے میرے عزیز۔ تو صاحبِ ضمیر، منصف و دانا ہے۔ تو نے حق کی آواز کو سنا اور پہچانا۔ تیری تنہا ہستی ہزار دشمنوں پر بھاری ہے۔ یہ میری نہیں اس سچائی کی جیت ہے جو میرا دین و ایمان ہے اور تو میرا شریک کار ہے۔"

بڑی شان و شوکت سے امام حُرؓ کو اپنے خیمے میں لائے۔ دائیں بائیں قاسم بن حسنؓ اور علی اکبرؓ تھے۔ عباسؓ کے ہاتھ میں پرچم تھا۔ یہ [illegible] پیارا بندہ اپنی خوش نصیبی پر نازاں امام کے جلو میں چلا رہا تھا۔ سارے گناہ، ساری [illegible] معاف، جیسے ابھی ابھی ماں کے پیٹ سے نیا جنم لیا [illegible]۔"

"آپ کمر کھول دیجئے۔" عباس نے ادب سے کہا۔

"اور تھوڑی دیر آرام کر لو۔" امام نے شفقت سے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"آقا! شمر نے خدا کا نام لے کر کمر باندھی ہے۔ یہ تو اب اس وقت کھلے گی جب میں اپنی قسم پوری کر لوں گا۔ مجھے شمر ذی الجوش اور عمر بن سعد سے نپٹنا ہے۔ انہیں جہنم واصل کرنے کا ہی میں ارمان لے کر آیا ہوں۔ مجھ پر انہیں بہت غصہ ہے۔ میرے احتجاج نے ان کے یقین کی بنیادیں اکھیڑ ڈالی ہیں۔ وہ دیکھئے بدبختوں نے تیر اندازی شروع کر دی۔ اس سے پہلے کہ کوئی مجھ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے، مجھے قدم بوسی کے بعد جاں نثاری کا موقع دیجئے۔"

امام اداس ہو گئے۔ بھرے گلے سے بولے۔

"دوست تمہاری اس محبت کو میں مر کے بھی نہ بھلا سکوں گا۔ چڑھتے سورج کو تو سب ہی سلام کرتے ہیں۔ مگر تم نے اس بے کسی اور لاچاری کے وقت میرا ہاتھ تھامنا منظور کیا۔ بھلا میں تمہاری اس عظیم قربانی کا بدلہ کیسے چکا سکوں گا۔ افسوس تم نے خاطر مدارت کا بھی موقع نہ دیا مگر سوائے محبت کے ہمارے توشہ خانے میں کچھ نہیں۔ ہم پر خود تین دن کا فاقہ ہے۔ اس غریب الوطنی میں تمہاری خاطر بھی کیا کروں؟"

حر نے ادب سے سر جھکا کر کہا۔

"آپ کی محبت کی ایک نظر میری بخشش کا پروانہ ہے۔ آپ نے جو میری عزت افزائی فرمائی ہے۔ یہی زندگی بھر کا سرمایہ ہے۔ اس کے علاوہ آج تک جو کچھ بھی کمایا خاک ہے۔"

حر کی آمد سے عورتوں اور بچوں کے خیمے میں ایک امید کی لہر دوڑ گئی۔ جیسے نہر علقمہ کی ایک عظیم الشان لہر ساری تشنگی کو سیراب کر گئی۔

باری باری حر سے سب بغل گیر ہوئے۔ خوشی سے حر کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کی بیوی دشمن کے لشکر میں تھی۔ خدا جانے لوگ اس پر ستم توڑیں گے۔ خیر جب ایک بار کشتی طوفان میں ڈال ہی دی۔ تو اب [illegible] کیا ڈرنا۔

وہی حر جو چوروں کی طرح [illegible] سے بھاگتا بچتا آیا تھا۔ دشمن کے لشکر کی طرف عجیب شان سے بڑھ رہا تھا۔ وہ آنکھوں [illegible]نے سے پہلے احساس شرم و ندامت سے

بجھی ہوئی تھیں، اب نورِ ایمان سے چمک رہی تھیں۔ چہرے پر جلال طاری تھا۔ فضا نے پر کان ہاتھ میں شمشیر برہنہ، پہلو میں نیزے کا پھل سانپ کی طرح پھن اٹھائے جیسے ایک دم تیقن کے ساتھ اس کا وجود ہی بدل گیا ہو۔

لشکر نے اسے عجیب نگاہ سے ہم کر دیکھا۔ یہ وہ عمر بن سعد کا فرماں بردار ماتحت نہیں تھا۔ حکومت کے آلۂ کار کے بجائے وہ سچے معنی میں حرؔ یعنی آزاد تھا۔ وہ اب آلِ رسولؐ کا طرف دار اور سچ کا علم بردار تھا۔ امام حسینؓ ابن علیؓ کا عزیز دوست۔ وہ کسی کی حق تلفی کرنے نہیں جا رہا تھا۔ وہ مظلوموں، بیکس معصوموں اور امن پسند انسانوں کی جانب سے جبر اور استبداد سے ٹکر لینے جا رہا تھا۔

اس نئے حر کو انھوں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے ان پر دہشت طاری تھی، ہاتھ پیر پھول گئے تھے۔ اس کی تلوار کی ضرب کے خوف سے گھاس کے تنکوں کی طرح لرز گئے تھے۔ ایک معمولی سے حقیقت انسان ایک امنڈتا گرجتا طوفان بن گیا تھا۔ حر نے دیکھا۔ فوجی شرمندہ بھی ہیں۔ خوف زدہ بھی۔ اس نے اونچی آواز میں انہیں للکارا۔

"احمقوں کی طرح میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو؟ جانتے نہیں میں دوبارہ پیدا ہوا ہوں۔ میں وہ حر نہیں جو کچھ دیر پہلے غلاظت میں غوطہ زن تھا۔ اس وقت میں امام ابن علیؓ کا ایک ادنیٰ جاں نثار ہوں۔ مگر تمہارے مقابلے میں افضل اور بلند مرتبہ ہوں۔ دیکھ رہے ہو میرے چہرے کا جلال میں ابھی اپنے امام کے قدم چوم کر آیا ہوں۔ جب انھوں نے اٹھا کر مجھے اپنے مبارک سینے سے لگایا تو مجھ میں وہ قوت آ گئی جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ تم احمق، ناسمجھ محض مٹی کے تودے ہو۔ تم چراغِ نبوت گل کرنا چاہتے ہو۔ دنیا کو دین و ایمان کی روشنی سے محروم کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ کیا تمہارے دماغوں میں اتنا سوچنے کی بھی سکت نہیں کہ امام کے خون سے داغ دار دامن لے کر تم کس منہ سے خدا کے حضور میں جاؤ گے۔"

حر کی آواز نے نیم مردہ دلوں کی اور بھی [illegible] کھینچ لی۔ حوصلے اور بھی پست ہو گئے۔ عذابِ دوزخ کا خوف دلوں کو لرزانے لگا [illegible] میں تلواریں کانپنے لگیں۔ اور علم سرنگوں ہو گئے۔ جیسے ایک بجلی گری اور پور [illegible] جھلسا گئی۔

عمر بن سعد حیران و پریشان ادھر اُدھر گھوم رہا تھا۔ اپنی فوج کو للکار رہا تھا۔ مگر سب جیسے سماعت کھو چکے تھے یا مر چکے تھے۔

"بزدلو، ہوش میں آؤ، یہ غدار تمہیں بے وقوف بنا رہا ہے۔ اس کے چکمے میں نہ آؤ خدا کی نعمتیں ہمارے خلیفہ کے ساتھ ہیں۔ اس اکیلے سے تم خوفزدہ ہو۔ خبردار جو کسی نے پیچھے قدم ہٹائے۔"

مگر لرزتے کانپتے سپاہی حُر کے بے پناہ حملے کے سامنے خشک پتوں کی طرح گر رہے تھے مدافعت کی خواہش مر چکی تھی۔ امام کے ساتھی حُر کی بہادری کی داد دے رہے تھے۔ اس کی ہمت افزائی کر رہے تھے۔

عمر بن سعد غصے سے دیوانوں کی طرح چلا رہا تھا۔ آخر انہوں نے اپنے خاص دستے کو حکم دیا کہ ایک دم سے چاروں طرف سے حُر کو گھیر کر کچل ڈالیں۔ حُر کو نرغے میں دیکھ کر امام کے ساتھی بے چین ہو گئے۔

"آقا! مجھے اجازت ہے حُر کی مدد کے لیے جاؤں۔"

ابھی عباسؑ کے منہ سے الفاظ پوری طرح ادا بھی نہ ہوئے تھے کہ حُر گھوڑے پر سے نیچے گرے۔ امامؑ نے چند ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ اور خود بھی گھوڑا بڑھا کر حُر کے قریب پہنچے انہیں آتے دیکھ کر سب بادل کی طرح چھٹ گئے۔

فوج میں حُر کے بہت سے دوست اور ساتھی تھے۔ ان لوگوں کے بجگا کھڑے ہونے کے ڈر سے خاص دستہ ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ چند سرکش جوانوں کو روند ڈالا۔ اور لشکر پیچھے ہٹ گیا۔

امام نے حُر کو خاک و خون میں غلطاں پایا۔ ابن مظاہر نے جلدی سے سہارا دے کر دم توڑتے ہوئے جانباز کو اٹھایا اور بے اختیار آنسو بہانے لگے۔

"تم نے تو امام کے عزیزوں اور بچپن کے ساتھیوں کو بھی مات کر دیا دوست اور ہم سب پر سبقت لے گئے۔ خوش نصیب ہو کہ امام کی طرف داری میں جان دینے والوں میں پہلا منصب تم نے پایا۔" ابن مظاہر بے اختیار رونے لگے۔

امام نے حُر کا سر اپنے سینے سے لگا کر خون آلود پیشانی کو بوسہ دیا۔ اپنی عبا کے دامن سے خون و پسینہ پونچھا۔ حُر نے مسکرا کر دم بھر کے لیے آنکھیں کھولیں۔ نظر بھر کے امام کو دیکھا "واللہ میرے نصیب کہ امام کے سینے پر میرا سر ہے اور اُن کے آنسو میرے چہرے پر برس رہے ہیں۔ اے خدا گواہ رہنا! میں نے تاریکی سے منہ موڑا اور تیرے نور کی طرف قدم بڑھایا۔ ایک ناچیز ذرہ آج آفتاب بن گیا۔ یا امام کچھ اڑھا دیجیے مجھے ٹھنڈ لگتی ہے۔ نیند آرہی ہے" اور ہنس کر امام کے ہاتھوں میں دم توڑ دیا۔

حُر کا نوجوان بیٹا بھی فوج میں اس کا ہم رکاب تھا۔ باپ کی غداری کے بعد نگاہیں اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔ حُر کا ایک بھائی مصعب بھی فوج میں اچھے عہدے پر فائز تھا مگر وہ اور حُر ہم خیال تصور نہیں کیے جاتے تھے۔ اس نے حُر کی حرکت کو حماقت اور پاگل پن سمجھا تھا۔ بیٹے نے بھی باپ کی حمایت میں ایک لفظ نہ کہا تھا۔ زمانہ ہی ایسا تھا سارے لطیف رشتے ٹوٹ کر بس ایک مصلحت اور منافع کا رشتہ باقی رہ گیا تھا۔ جو خوب پروان چڑھ رہا تھا۔ بھائی بے دریغ بھائی کے سر کا سودا کر لیتے۔ اور جہاں پر کچھ بھی خدائی مگر جُڑے ضمیروں میں انسانیت کے اجزا باقی رہ گئے تھے۔ امام حسینؑ کے خلوص نے انہیں اور ابھار دیا تھا۔

بیٹے نے جب حُر کو گرتے دیکھا تو خون نے جوش مارا اور وہ بے قرار ہو گیا۔ بغیر سوچے سمجھے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور آن کی آن میں جا لگا۔ چند سپاہیوں نے مزاحمت کرنا چاہی مگر پھر یہ سوچ کر نہ روکا کہ شاید باپ کی لاش اٹھانے جا رہا ہے۔ امام حسینؑ کے ساتھیوں نے جب اسے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا تو حملے کے لیے تیار ہو گئے۔ بیٹا گھوڑے سے کودا اور باپ کی لاش پر گر پڑا۔

حُر کا بھائی بھی دشمن کی فوج سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس نے میان سے تلوار کھینچی اور گھوڑا اڑھا کر نکلا۔ لوگ سمجھے وہ بھتیجے کو راہِ راست پر لانے کے لیے جا رہا ہے۔ کیونکہ سب ہی جانتے تھے وہ بھتیجا بھی ہے اور داماد بھی۔ ابھی کچھ ہی دن ہوئے کہ اس کی بیٹی حُر کے بیٹے کو بیاہی گئی تھی۔

معصب جب قریب پہنچا تو وہ سکتے میں رہ گیا۔ حُر کا فرزند اور معصب کا چہیتا داماد امام کے قدموں سے لپٹا اجازتِ جنگ مانگ رہا تھا۔

"ناخلف ہے وہ بیٹا جو اپنے باپ کے قاتلوں کا ساتھ دے۔ یا امام میرا خون کھول رہا ہے۔ مجھے اجازت دیجئے۔"

"تمہارے باپ کے احسان کے بوجھ سے میں کبھی سبک دوش نہ ہو سکوں گا۔ اب تمہیں جنگ کی ضرورت نہیں فرزند۔"

"للہ مجھے اپنے بابا کے قرب سے محروم نہ کیجئے۔"

"جاؤ اے نوجوان! تمہاری یہی مرضی ہے تو میں کیسے روک سکتا ہوں۔ خدا تمہارا نگہبان۔"

"حُر کا بیٹا تیزی سے تلوار کھینچ کر پلٹا تو اپنے چچا کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

دونوں طرف کے لوگ یہ ڈرامہ دیکھ رہے تھے۔ چچا اور بھتیجے دونوں کی تلواریں میان سے نکلی ہوئی تھیں۔

معصب گھوڑے سے اُترا۔ دونوں دیر تک ایک دوسرے کو گھورتے رہے پھر معصب کی آنکھ جھک گئی۔ تلوار واپس میان میں ڈال دی۔ پھر بڑھ کر امام حسینؑ کے قدموں کو بوسہ دیا۔ اپنے مرحوم بھائی کی پیشانی کو چوما۔

"زندگی میں ہمارا ساتھ رہا تو اب موت کی کیا حقیقت ہے۔ جو ہمیں جدا کر سکے۔ یا امام میرے پاس تو معافی مانگنے کی بھی مہلت نہیں۔ میرے اعمال میری آخرت کے ضامن ہوں گے بس مجھے اجازتِ جنگ دیجئے کہ یہی میرے لیے سب سے بڑا معافی نامہ ہوگا۔ میں ہی نہیں یہ جو دشمن کی فوج نظر آ رہی ہے، ان میں جسم مفلوج ہیں۔ مگر ہزاروں دل اب بھی آپ کے قدموں میں جھکے ہوئے ہیں۔"

جذبات کی شدت سے امام کا گلا بھر آیا۔ ابن مظاہر نے مسکرا کر کہا۔

"یہ معجزے دیکھے تم نے۔ ہمارے مہربان کہاں کہاں سے چلے آ رہے ہیں۔"

چچا بھتیجے آخری بار بغل گیر ہوئے۔ گھوڑوں پر سوار ہوئے اور آن کی آن میں مثلِ طوفان غنیم کی صفوں پر ٹوٹ پڑے۔ فاصلے کی وجہ سے فوج کو نہیں معلوم تھا کہ معصب ہیں اور امام

حسینؓ میں کیا باتیں ہوئیں۔ جب چچا بھتیجے کو ساتھ آتے دیکھا تو کوئی شبہ بھی نہ ہوا مگر جب حبیب نے قریب پہنچ کر بہ آواز بلند کہا۔

"میرے بھائی کے قاتلو، چند لمحوں قبل میں بھی تمہاری طرح اندھا، بہرہ اور گونگا تھا۔ خدا نے مجھ پر رحم فرما کر مجھے بصارت بخشی اور میں سن بھی سکتا ہوں اور بول بھی سکتا ہوں۔ یہ دن قیامت سے کم نہیں۔ جب بھائی بھائی کو گھوڑوں کی نعلوں تلے روند رہا ہے سارے اصول، شعور اور جذب سب بالائے طاق رکھ کر آج انسان طاقت کے بھوکے حیوانوں کے ہاتھوں بک گیا ہے۔ پر کان کھول کے سن لو امام حسینؓ ابن علیؓ اور ان کے خاندان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے سے پہلے تمہیں ہم سے نپٹنا ہوگا۔ آ جاؤ سامنے اگر ہمت ہے۔"

مصعب اور ان کا نوجوان بھتیجا بڑی شان سے لڑے اور شہید ہو گئے۔ علی اکبرؓ جنگ کی اجازت پر مصر ہوئے مگر پھر سب ساتھیوں نے بڑے شوق سے کہا۔

"یا امام ہماری جانیں آپ کی جانوں پر صدقے۔ قسم ہے خدا کی جب تک ہمارے جسموں میں جان باقی ہے کوئی آپ تک نہیں پہنچ سکتا۔"

اس کے بعد بڑی دلیری سے جنگ کر کے تمام اصحاب شہید ہو گئے۔ جون ابوذرؓ کافی ضعیف ہو چکے تھے۔ مگر بار بار درخواست کرتے تھے۔

"جون ابوذر، اس بڑھاپے میں جہاد تم پر واجب نہیں۔ تم کہیں چھپتے بچاتے نکل جاؤ یہ میری بھی خواہش ہے۔" امام نے کہا۔

"یا حسینؓ میں نے راحت کے دن تو آپ کے ساتھ گزارے۔ اب ایسے نازک موقع پر مجھے اپنے قرب سے محروم کر رہے ہیں۔؟"

جون ابوذر پر رقت طاری ہو گئی۔ وہ حبشی نژاد تھے۔ لہذا کہنے لگے۔

"کیا میرا سیاہ چہرہ اور حسب و نسب اس قابل نہیں کہ میں شہید ہو کر بہشت میں داخل ہو سکوں۔ کیا ایک غلام جہاد نہیں کر سکتا۔؟"

امام نے بڑی محبت سے کہا۔

"بہشت میں رنگ و نسل نہیں۔ اعمال کا محاسبہ ہوگا۔ اور تمہارے ساتھ آخری زندگی گزارنے کے بعد میں دعوے سے کہتا ہوں کہ بہشت میں بہت بلند مرتبہ پاؤ گے۔ تم جیسا خدا ترس متقی وفادار مشکل سے ملے گا۔ اگر فیصلہ ہی کر چکے ہو تو تمہیں نہیں روکوں گا۔"

جون ابوذر نے باوجود سن رسیدہ ہونے کے تلوار اور نیزے کے وہ ہاتھ دکھائے کہ دشمن کے دانت کھٹے کر دیے۔ جب زخموں سے چور ہو کر گھوڑے سے گرے تو امام نے لپک کر انھیں سہارا دیا اور انھوں نے دم توڑ دیا۔

عباسؑ ابن علیؑ کے تینوں بھائی جعفرؑ، عثمانؑ اور محمدؑ جو انتہائی شوق سے بار بار اجازت مانگ رہے تھے۔ بڑی جانبازی سے دشمن کے لاتعداد سپاہیوں کو ختم کر کے شہید ہو گئے۔ ان کے بڑے بھائی عباسؑ نے انہیں اپنے ہاتھوں سے ہتھیار سجا کر میدان جنگ میں بھیجا۔

حضرت فاطمہ زہراؑ کی وفات کے بعد جب علیؑ ابن ابی طالب نے دوسرے نکاح کا قصد کیا تو انہوں نے اپنے بھائی عقیلؑ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ کوئی ایسی نیک اور باعقل خاتون کا نام تجویز کریں۔ جو بہادر اور لائق بچوں کی ماں بن سکے۔ انہوں نے امّ البنین کا نام پیش کیا۔ وہ حزام بن خالد کی بیٹی تھیں۔ اُن کا قبیلہ شجاعت اور دلیری میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ امّ البنین کی تربیت نہایت اعلیٰ پیمانے پر ہوئی تھی۔ علمی اور اخلاقی لحاظ سے بھی بلند مقام تھا۔ اُن کا نام فاطمہ وحیدیہ تھا۔ چونکہ چار بہادر اور جری بیٹوں کی ماں تھیں۔ اس لیے انہیں لوگ امّ البنین یعنی "بیٹوں کی ماں" کہا کرتے تھے۔

ان میں سب سے بڑے عباسؑ ابوالفضل تھے۔ جو امام حسینؑ کے پرستار، پیارے بھائی اور شاگرد تھے۔ جو پیار انھیں امام حسینؑ سے ملا وہی انہوں نے اپنے چھوٹے بھائیوں، جعفرؑ، عثمانؑ اور محمدؑ کو دیا۔ انہیں بیٹوں کی طرح پالا۔ ان کی اعلیٰ پیمانے پر تربیت کی تھی۔ وہ ان تینوں نوجوانوں میں سے تھے جو عباسؑ کی رہنمائی میں امام حسینؑ کے باڈی گارڈ تھے۔ اور وہ جہاں بھی جاتے تھے۔ یہ ان کے ساتھ سائے کی طرح رہتے تھے۔

روز عاشورہ جب امام کے بیشتر عزیز اور دوست شہید ہو گئے۔ تو عباسؑ نے اپنے بھائیوں سے ملاکر کہا۔

"میری خواہش ہے کہ تم مجھ سے پہلے میدانِ جنگ میں جا کر آقا پر جان نثار کرو۔"

تینوں بھائی امام کی قدم بوسی کے بعد میدان میں آئے۔ علیؑ کے بیٹوں نے اپنے والد کے مقدس نام کا نعرہ لگایا اور یہ ثابت کر دیا کہ شجاعت انھوں نے ورثہ میں پائی ہے۔

امام حسینؑ نے ابوالفضل عباسؑ کی مدد سے اپنے پیارے بھائیوں کی لاشیں اٹھائیں اور دوسرے شہیدوں کے ساتھ خیمے میں رکھ دیں۔

اپنے پرائے جب آقا پر سے جان نچھاور کر چکے تو ابوالفضل عباسؑ، علی اکبر اور قاسم بن حسنؑ نہیں بحث چل گئی کہ کون اب میدانِ جنگ میں جانے کا سب سے زیادہ حق دار ہے۔

اس وقت زینبؑ بنت علیؑ حیران و پریشان سوچ رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں "یا اللہ یہ عون و محمد کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ بیٹے مجھے بھائی سے شرمندہ کروائیں گے۔ سب جا رہے ہیں۔ اور یہ مزے سے کھڑے تماشا دیکھ رہے ہیں۔ ایسا موقع پھر کہاں نصیب ہو گا۔ دنیا یہی کہے گی بزدل تھے۔ عین وقت پر جنگ سے ڈر گئے۔ اور جان بچا کر دبک رہے۔" مگر امام حسینؑ نے انہیں سمجھایا۔ بانوؑ نے کہا۔

"بہن ان کی ابھی عمر ہی کیا ہے۔ کبھی گھر سے باہر قدم نہ نکالا۔ نہ کوئی جنگ دیکھی۔ بچے شیروں کے شیر ہیں۔ انہیں ڈر سے کیا واسطہ۔"

"امی جان ہم کتنی دیر سے ماموں جان کی خوشامد کر رہے ہیں۔ وہ اجازت ہی نہیں دیتے۔" بچے روہانسے ہو گئے۔ "بتائیے ہم کیا کریں؟"

"یہ سب کہنے کی باتیں ہیں کہ ماموں اجازت نہیں دیتے۔ بہادر کہیں رکنے سے رکے ہیں۔ اور کچھ نہیں مرنے سے ڈرتے ہو۔ بہادروں کی اولاد کے یہ طور و طریق نہیں ہوتے۔ مجھے تو اشمہ پر لاشہ آ رہا ہے۔ یہ کھڑے تیرا میرا منہ تک رہے ہیں۔"

"بچے ٹھیک کہتے ہیں۔ امام انہیں کس دل سے جنگ میں جانے کی اجازت دیں۔ ان پر جہاد واجب نہیں۔" بانوؑ نے سمجھایا۔

"یہ بات نہیں بھائی جان۔" بچے آنسو پونچھ کر بولے۔ "ہم نے اپنے کانوں سے سنا

ماموں جان قاسم بھائی سے فرما رہے تھے۔ یہ جنگ مختلف ہے۔ اس میں جہاد کے لیے عمر کی قید اٹھا دی گئی ہے۔ علی اصغر تک اپنے مورچے پہ جا چکے ہیں۔ پھر ہمیں کیوں اجازت نہیں دیتے۔"

بانو نے سہم کر نڈھال سسکتے ہوئے علی اصغر کو چھاتی سے لگا لیا۔

"تو پھر غصہ نہ آئے کہ تم جان بوجھ کر اجازت نہیں لیتے۔ یا اللہ میں نے کیسی کیسی دعائیں مانگیں۔ یا پروردگار، میرے لال اس امتحان میں پورے اتریں۔ بس یہی میری آرزو ہے۔ خیر بھئی تمہارا جو جی چاہے کرو۔ آج سے نہ تم میرے بیٹے، نہ میں تمہاری ماں!"

اسی دم غلغلہ ہوا۔ دشمن نے حملہ کر دیا۔ اور تیروں کی بارش ہونے لگی۔ عون و محمد اپنا بچپنا بھول گئے۔ فوج کا رخ ماں بہنوں کے خیموں کی طرف دیکھ کر ان کا خون کھول گیا۔ تڑپ کر امام کے قدموں پر گر پڑے۔

"ماموں جان، خدارا ہمیں اجازت دیجیے، ہم سے اب یہ ذلت برداشت نہیں ہوتی۔ سب عزیز اقارب شہید ہو گئے۔ ہم فقیروں کی طرح کھڑے منہ تک رہے ہیں۔ اماں جان ہماری صورت سے بیزار ہو رہی ہیں۔ ان کے خیمے کی طرف جاتے شرم آ رہی ہے وہ کہہ رہی ہیں کہ ہم بزدل ہیں۔ موت سے ڈرتے ہیں۔ خیبر کشا کے نواسے، جعفر طیارؑ کے پوتے ہیں۔ موت ہمارے سامنے کیا چیز ہے۔؟"

امام حسینؑ نے اشک بار آنکھوں سے دونوں کو نظر بھر کے دیکھا اور سر جھکا لیا۔ پھر بولے۔

"کس دل سے تمہیں مرنے کی اجازت دوں۔ تم بہت کم سن ہو۔ یہ ظلم مجھ سے نہ ہو گا۔ تم میری دکھیا بہن کی آنکھوں کا نور ہو۔ اس کی زندگی کا سہارا ہو۔ تمہیں مقتل میں کیسے بھیج دوں۔"

"نہیں ماموں جان ہماری امی بڑی بہادر ہیں۔ عورت ہیں مگر مردوں سے زیادہ باہمت ہیں۔ رات ہی کہہ رہی تھیں، یہ نہ سمجھنا میں تم پر جان دیتی ہوں تو تمہارا ہر قصور آنکھ بند کر کے معاف کر دوں گی۔ بھائی سے زیادہ مجھے اولاد بھی پیاری نہیں۔ تم نے

جان نثاری میں کوتاہی کی تو دودھ نہیں بخشوں گی۔ ماموں جان اسی کا دل دکھا کر ہم جینا نہیں چاہتے۔"

طوعاً و کرہاً امام نے بچوں کو اجازت دے دی۔

"جاؤ میرے پیارو۔ تم سب چلے جا رہے ہو۔ کوئی ہمارا لاشہ اٹھانے والا بھی نہ رہے گا۔ خیر اللہ تمہارا نگہبان، جاؤ کہ اس کے سوا چارہ بھی نہیں۔ ہم سب کو باری باری جانا ہے۔"

بچے خوشی سے بے قرار ماں کے پاس بھاگے گئے۔

فضہ نے یہ الفاظ سنے تو گرتی پڑتی بھاگیں۔

"بی بی بچوں کو مقتل میں جانے کی اجازت مل گئی۔ ہائے لوگوں میری زینبؑ کی کمائی لٹ رہی ہے۔"

مگر فضہ کی ضعیف آواز زینبؓ بنت علیؓ کے کانوں تک نہ پہنچی۔

"میں کسی سے کیا شکایت کروں۔ میری تقدیر کا لکھا ہے۔ غضب خدا کا غیر تو قربان ہو گئے اور یہ ماموں کے پیچھے منہ چھپائے بیٹھے ہیں۔ آخر حرؑ ہمارے کون ہوتے! ان کے بھائی اور بیٹے سے کیا رشتہ تھا؟ غیر ہی تو تھے۔ مگر مرتبہ انہوں نے بڑھ کر پایا۔"

بچے انہیں غصے سے منہ موڑے دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔ بے اختیار آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہہ رہے تھے۔ ماں نے دیکھا تو اور بگڑ اٹھیں۔

"اب رو کیوں رہے ہو کیا ٹھیس لگ گئی ہے۔ ارے یہ بھی دل کا سودا ہے۔ یہاں کوئی زبردستی تھوڑی ہی ہے۔ جب میرا بھائی شہید ہو جائے گا۔ تب یہ اپنی تلواروں کے جوہر دکھائیں گے۔ جب سب ختم ہو جائیں گے۔ تب شاید ان کی باری آئے گی۔ اسی منہ سے اپنے آپ کو علیؓ کا نواسہ کہتے ہیں۔ ہنہہ، کون سے معرکے سر کئے ہیں۔ کون سے کارنامے دکھائے ہیں کہ لیں "پدرم سلطان بود۔" یہ گم تم کیوں میرے سر پہ کھڑے ہو دفع ہو جاؤ میری نظروں سے۔ مجھے منہ دکھانے کے قابل نہ رکھا تم نے۔"

اتنے میں خود امام خیمے میں داخل ہوئے کہ بہن کو بچوں کو مقتل میں جانے کی اجازت

کا عذر کریں انھیں سمجھائیں، بجھائیں۔ جب دیکھا کہ وہ تو اُلٹی بچوں پر برس رہی ہیں اور وہ خاموش سر جھکائے رو رہے ہیں۔ اپنی صفائی میں ایک لفظ نہیں کہتے۔ جلدی سے بہن کے پاس آئے اور انہیں ٹوکا۔

"توبہ کرو بہن! ایسے نیک نصیبوں والی کو کہتے ہیں۔ خواہ مخواہ بے چاروں کو ڈانٹے جا رہی ہو۔ یہ سچ کہہ رہے تھے۔ یہ تو بار بار ضد کر رہے تھے۔ میں نے ہی انھیں روکا تھا۔ تم ان کی ماں ہو، چاہے غصہ کرو یا پیار، مگر خدارا بے انصافی تو نہ کرو۔ یہ تم سے رخصت کی اجازت لینے آئے ہیں۔ آخری بار تمہاری قدم بوسی کو حاضر ہوئے ہیں۔ اس وقت ان کا دل توڑ دو گی تو ساری عمر پچھتاؤ گی؟"

"مجھے تو اس بات کا غصہ ہے کہ انھوں نے اتنی ٹال مٹول کیوں کی؟ جیسے اب اٹھ کے اجازت لے آئے! اس سے پہلے بھی لا سکتے تھے۔ اور مجھے آپ سے بھی شکایت ہے! انہیں کیا غیر سمجھا جو اب تک ان کے فرض سے دور رکھا۔"

"انہیں ظالموں کی فوج میں بھیجتے ہوئے ہمارا دل خون ہوا جاتا ہے۔ تمہاری اولاد کی ضد نے ہمیں مجبور کر دیا۔ ورنہ ہم ہرگز اجازت نہ دیتے۔ لو اب انہیں رخصت کرو۔"

ماں نے نظر بھر کے بچوں کو دیکھا، دونوں بازو پھیلا دیئے۔ جیسے وہ قارون کا خزانہ جیت کر آئے ہوں۔ بچے دوڑ کر ماں کی گود میں سما گئے۔

"مبارک ہو میرے شہزادو۔ دیکھو میرے دودھ کی لاج رکھنا۔ جوانمردوں کی طرح تلوار کے جوہر دکھانا۔ ایسا نہ ہو لوگ کہیں زینبؑ کے بیٹوں نے دشمن کو پیٹھ دکھائی۔" زینبؑ جلدی جلدی بچوں کو نئے کپڑے پہنا کر بال سنوار رہی تھیں، بہنیں آگئیں۔ کوئی ہتھیار سجانے لگی، کوئی عمامہ درست کرنے لگی۔ کسی نے جوتوں کے تسمے کسے۔

"بھائی کو بھی زندہ نہ چھوڑنا، نہر کا گھاٹ کھول دینا، پھر ہم جی بھر کے پانی پئیں گے۔" پیاسی سکینہ کو ہر طرف پانی ہی نظر آ رہا تھا۔

"ہاں تم دو ہی اور اور وہ ہزاروں ہیں۔ مگر وہ بزدل تمہاری جوتیوں کی گرد کے برابر بھی نہیں۔" کبریٰ بنت حسینؑ نے کہا۔

"وہ مفسد اور ضمیر فروش ہیں۔ تم حق کے علم بردار ہو۔" بانو نے فرمایا۔

"آج سمجھ لو یہ حق و باطل کی جنگ ہے حق کو ہمیشہ فتح ہوتی ہے۔ تمہاری شہادت ہی تمہاری جیت ہے۔ تم نہ رہو گے مگر تمہارا نام دنیا کے ہونٹوں پر ہمیشہ زندہ رہے گا۔ حق کے نام لیوا تم پر درود بھیجیں گے۔" ام کلثوم نے بلائیں لے کر ان کی پیشانیاں چومیں۔

"ذلت کی زندگی کے ہزار سالوں سے عزت کی موت بدرجہا بہتر ہے۔ جانتی ہوں میرے بچو تم پر تین دن کی پیاس ہے۔ مگر خبردار بھول کر بھی دریا کی طرف نظر نہ ڈالنا۔ عش عش کر گرو تو پانی سے دور رہنا۔ جب تک امام پیاسے ہیں۔ سکینہ کا گلا پیاس سے خشک ہے۔ ننھا اصغر ترس رہا ہے۔ ہم پر پانی مکروہ ہے۔ ان کے حلق خشک ہیں۔ تو ہم سیراب نہیں ہو سکتے" بچوں نے کہا

"آپ بالکل فکر نہ کیجئے امی، ہم اپنی آنکھوں تک کو پانی کے نظارے سے سیراب نہ ہونے دیں گے۔ اگر ذرا بھی ہمارے قدم ڈگمگائیں تو بے شک ہماری لاش پر آنسو بھی نہ بہایئے گا بس اب تو ہمیں رخصت کیجئے، کہیں دشمن میدان خالی دیکھ کر شیر نہ ہو جائیں۔"

زینبؑ نے مجسم ماں بن کر دونوں کو کلیجے سے لگایا۔ ہزاروں درازیٔ عمر کی دعائیں دیں۔ منہ چوما اور بچوں کو رخصت کر دیا۔ ان کے جاتے ہی خالی ہاتھ دعا کے لیے اٹھا دیئے۔

"اے پروردگار، میری حقیر قربانی قبول کر۔"

عون اور محمد دونوں ہم عمر تھے۔ دونوں زینب کے بیٹے نہیں تھے۔ انہی میں سے ایک ان کی سوت کا بچہ تھا۔ پیدائش کے وقت ماں بیمار پڑ گئیں اور دودھ خشک ہو گیا۔ تو دونوں کو زینبؑ نے ہی دودھ پلایا، پالا پوسا۔ وہ دونوں کا فرق بھول چکی تھیں۔ یہ بھی یاد نہ تھا۔ کون اپنے پیٹ کی اولاد ہے اور کون ان کی سوت کا بچہ ہے۔ نہ بچوں کو علم تھا۔ انہوں نے کبھی فرق نہ محسوس کیا، اس کی ماں کی اجازت کی بھی ضرورت نہ تھی، اپنا جانا اور راہ خدا پر قربان کر دیا

غیر ضروری

دونوں ننھے سپاہی عجیب شان سے اکڑتے ہوئے خیمے سے نکلے تو عباسؑ، علی اکبرؑ اور قاسمؑ نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لے کر گھوڑوں پر سوار کر دیا۔ امام نے دونوں گھوڑے رکاب چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ دونوں کو پیار کیا۔ بچوں کو جانے کی بڑی عجلت تھی۔ ڈر رہے تھے کہ

کہنہ بزرگ اتنا خیال نہ بدل دیں۔ اور انھیں روک نہ دیں۔ پلک جھپکتے میں دور، درخشاں تارے گرد کے بادلوں میں چھپ گئے۔

امام نے آنسو آستین میں جذب کیے اور دیکھا بدنصیب بنتِ خیمہؑ کا پردہ پکڑے کھوئی کھوئی نظروں سے گرد میں اپنے لال تلاش کر رہی تھیں۔

بچوں کا کیا ہے۔ وہ تو بڑے بڑے طوفانوں کو کھیل سمجھ بیٹھتے ہیں۔ عونؑ و محمدؑ کی معصوم آنکھیں بچپن ہی سے قتل و غارت کو دیکھ دیکھ کر بڑھی ہونگی تھیں۔ ذرا ذرا سے بہانوں پر معصوموں کے قتل زیج چھڑانے پر ہوا کرتے۔ سپاہی بے گناہوں کی پشت پر کوڑے برساتے، سر کاٹ کر مسجد کی دیواروں پر نصب کیے جاتے۔ بچے دیکھتے رہتے۔

انھیں زیادہ کھیل کود اور گلیوں میں آوارہ گردی کی اجازت نہ تھی۔ بچپن سے ہی یہ ذہن نشین کرا دیا تھا کہ وہ عام بچوں سے مختلف ہیں۔ ان کا زیادہ وقت پڑھنے لکھنے اور فنِ سپاہ گری میں مہارت حاصل کرنے میں صرف ہوتا تھا۔ ابوالفضل عباسؑ ان نوخیز سپاہیوں کے سردار رہتے۔ روزانہ مشق کرائی جاتی۔ کئی بار حکومت نے اس پر پابندی عائد کرنے کی کوشش کی کہ امام خفیہ فوج تیار کروا رہے ہیں۔ حکومت سے ٹکر لینے کے لیے سپاہی تیار کر رہے ہیں۔ مگر کسی ثبوت کی غیر موجودگی کی وجہ سے بازپرس بند ہو گئی۔

مگر غنیم کی فوج پر امام کے سپاہیوں کی دہشت چھائی ہوئی تھی۔ عجیب عجیب افسانے سن رکھے تھے کہ امام کے سپاہیوں کو عجیب و غریب فنِ شمشیر زنی سکھائے گئے ہیں۔ جو عام انسانوں کے علم میں نہیں۔

مگر جب عون و محمد دلیری سے گھوڑے دوڑاتے میدان میں آئے۔ تو وہ انھیں حیرت سے منہ پھاڑے دیکھتے رہ گئے۔ بے شک وہ غداروں سے جنگ کرنے آئے تھے۔ مگر بچوں کو ذبح کرنے کوئی نہیں آیا تھا۔ سورما سورماؤں سے لڑتے ہیں۔ عجیب مقابلہ تھا۔ ادھر خونخوار جبروت پہلوان سر سے پیر تک فولاد پوش، ہتھیاروں سے لیس، ادھر دو چھوٹے چھوٹے بچے! جو تین دن کے پیاسے تھے۔ مگر ہونٹوں پر زبان پھیرنا بھی اپنی ہتک سمجھتے تھے۔ انھیں ذبح کرنا تھا؛ ان کا خون بہانا تھا کہ یہی حکم حاکم اور وقت کا تقاضا ہے۔

شرم و ندامت سے ان سورماؤں کے سر جھک گئے، اپنے لیم و شحیم وجود پر شرم آنے لگی، ان پر ہاتھ اٹھاتے جھجک محسوس ہونے لگی۔ یہ نو دس برس کے بچے جن کے دودھ کے دانت ٹوٹ کر ابھی ٹھیک سے بھی نکل نہ پائے ہیں۔ مچلے سے چہرے، روشن پیشانیاں ان کی آمد سے سارا میدان کارزار مہک اٹھا۔

"یہ کیا مذاق ہے۔ جاؤ بچو، کہیں چوٹ چپیٹ آگئی تو تمہاری اماں سر پیٹ کے رہ جائیں گی۔" ایک بدتمیز سا پہلوان بولا اور ہنسنے لگا۔

"او گستاخ، زبان سنبھال کر بات کر، جانتا ہے، ہماری ماں کون ہیں؟ شیر خدا کی بہادر بیٹی زینبؑ، میں عون ہوں۔"

"میں محمد ہوں۔"

"ہم علیؑ ابن ابی طالب کے نواسے اور جعفر طیارؓ کے پوتے ہیں، ہماری کم سنی پر نہ جاؤ، ہماری تلوار کی کاٹ دیکھو۔"

"ہم حق کے لیے زندہ رہے۔ اور آج حق کے لیے جان دینے کا ارمان دل میں لے کر آئے ہیں، مگر پہلے تمہارے ناپاک وجود سے اس دنیا کو پاک کرنے کا عزم دل میں لے کر آئے ہیں۔"

دو بجلیاں سی چمکیں، دو شعلے سے آندھی بن لپکتے ہوئے بڑھے اور غنیم کے لشکر کے حواس گم ہو گئے۔

نپے تلے وار پر وار کر رہے تھے۔ اول تو انہوں نے ان بچوں کی اہمیت دینے میں اپنی صلاحیتوں کی ہتک سمجھی، بچوں سے الجھ کر کون اپنا مذاق اڑوائے، پھر ان کے مرتبے کا خیال کر کے تلواریں جھکا دیں۔ مگر جب بچوں نے واقعی تلواروں کے جوہر دکھانے شروع کیے تو مدافعت کے لیے ڈھالیں اٹھا کر سامنے کر لیں۔ سنگی القلب ہوتے ہوئے بھی بچوں پر کبھی ہاتھ نہ اٹھانے کی وجہ سے تکلف ہو رہا تھا۔

سدھے ہوئے گھوڑے اپنے منجھے ہوئے سواروں کے ہاتھ، تھوڑی ہی دیر میں بچوں نے مدافعت پر مجبور کر دیا۔

بچوں کی بہادری اور فنِ سپہ گری کو دیکھ کر دشمن کے منہ سے بھی واہ نکل گئی۔ ابنِ سعد کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"ختم کرو یہ تماشا"! اس نے گرج کر کہا۔ اور حکم دیا بچوں کو گرفتار کر لیا جائے۔ مگر بچوں کو گرفتار کرنا بجلی کو مٹھی میں بند کرنے سے بھی زیادہ مشکل ثابت ہوا۔ یکایک وہ صفیں چیرتے در آتے اور پھر قیامت ڈھاتے۔ پلٹ کر صاف نکل جاتے۔ گھڑی بھر کو جدا ہو جاتے۔ ایک دوسرے کا نام لے کر پکارتے، پھر گھوڑے خود بخود پاس آ جاتے۔ بچے ایک دوسرے کا ہاتھ چھو کر دل کو تسلی دیتے ایک دوسرے کے وار پر صدائے تحسین بلند کرتے۔

اب خود زخم کھانے کا وقت آ گیا تھا۔ گھاؤ لگ رہے تھے، خون بہہ رہا تھا۔ مگر ہمتیں بلند تھیں، ارادے جوان تھے۔

امام کے خیمے سے لوگ دونوں کو آنسو بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ زینبؑ کے کانپتے ہاتھوں سے خیمے کا پردہ چھوٹ جاتا۔ وہ پھر تڑپ کر دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیتیں، آنکھیں خشک تھیں۔ دل لہو لہو ہو رہا تھا۔ ہر وار جو بچوں کے جسم پر لگ رہا تھا، اس کی چوٹ ماں کے کلیجے پر پڑ رہی تھی۔

"خبردار پانی کی طرف نہ دیکھنا، امی کی نظریں ہماری طرف لگی ہوئی ہیں۔" عون محمد سے کہتے۔

"سخت پیاس ہے۔ اگر پانی مل جاتا تو ہم انھیں واقعی مزہ چکھا دیتے۔ مگر ہم دریا کی طرف ہرگز نہیں دیکھیں گے۔ مگر کیا ایک چلو علی اصغر کے لیے لینے میں گناہ ہے؟"

محمد جواب دیتے۔ "دریا کو گھٹ تو نہ جائے گا۔"

ابوالفضل عباسؑ بے قرار تھے۔ بار بار کہہ رہے تھے۔

"آقا حکم ہو تو میں جا کر دونوں کو سمجھا بجھا کر لے آؤں۔"

"نہیں میں جاتا ہوں۔ میرے شاگرد ہیں۔ میرا کہنا نہیں ٹالیں گے۔" علی اکبرؑ کہہ رہے تھے۔ "بچوں کی طاقت جواب دے رہی ہے۔"

قاسم تم بھی ساتھ چلے جاؤ، تم تینوں جاؤ۔ اور بچوں کو لے آؤ۔ ہم سے ان کے

زخم برداشت نہیں ہوتے۔" امام نے سرد آہ بھر کے حکم دیا۔

"اگر کسی نے میرے بچوں کو ان کے حکم سے محروم کرنے کی کوشش کی تو میں کھلے سر خیمے سے نکل پڑوں گی۔" زینبؑ نے خون بار آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا۔ "وہ خود آ جائیں گے۔ اس شان سے جیسے فرشوار آتے ہیں۔ میرے بیٹے بھی جانبازوں کی طرح جنگ کے میدان سے لوٹیں گے، عزیزوں کے کاندھوں پر۔"

"غضب خدا کا۔ پھوپھی اماں کے یہ ننھے سہارا ہیں۔ ریت پر گر کر دم توڑیں۔ یہ مجھ سے برداشت نہ ہوگا۔" علی اکبرؑ نے گھوڑا گھمایا۔

کیوں فال بد منہ سے نکالتے ہو۔ کیا تم میرے بیٹے نہیں۔ خدا نہ کرے جو میں لاوارث ہوں۔ میرے بھائی کو اللہ جیتا رکھے۔ میرے بیٹوں کی ان کے سامنے کیا حقیقت ہے۔ ایسے ہزار بیٹے ہوں تو حسینؑ پر وار دوں۔ بے کار ضد کر کے میرا دل نہ دکھاؤ۔ عباسؑ میں جانتی ہوں، عونؑ و محمدؑ تمہیں اپنی اولاد سے کچھ کم عزیز نہیں۔ مگر آج کا دن عزیزوں کو قربان کرنے کا ہے۔ میری طرف سے نہ سہی اپنی طرف سے قربانی سمجھو۔ قربانی واپس نہیں لی جاتی۔ بس یہی دعا ہے کہ اسے قبولیت کا درجہ نصیب ہو۔"

"بچے زخموں سے چور زمین پر اسے تڑپ کر ایک دوسرے کے وار سہنے لگے۔ اب کسی میں ضبط کا یارا نہ رہا۔ امام نے پھرتی سے گھوڑے کو ایڑی لگائی۔ عباسؑ، علی اکبرؑ اور قاسم بھی لپکے۔ اعضا آتا دیکھ کر بھیڑ کائی کی طرح چھٹ گئی۔

بچے دم توڑ رہے تھے۔ امام نے دونوں کو اٹھا کر کلیجے سے لگایا۔ اور ان کے لہو میں شرابور ہو گئے۔ بچوں نے ماموں کے گلے میں باہیں ڈالیں اور دم توڑ دیا۔

امام بھائی اور بیٹے کی مدد سے بچوں کو لے کر واپس آئے۔ زینبؑ بنت علیؑ نے باہیں پھیلا دیں۔ جیسے زندگی کا عظیم ترین انعام مل رہا ہو۔ بچوں کو زانو پر لٹا کر خاک و خون سے بھرے مکھڑوں کو آنچل سے صاف کیا۔ منہ پر منہ رکھ کر بولیں۔

"واللہ، ایسی بھی کیا غفلت کی نیند، ماموں جان کھڑے ہیں۔ اور تمہیں کسی بات کی پرواہ ہی نہیں تم نے اپنے با کا فرض بھی ادا کر دیا

سا

سب بیبیوں نے ماتم میں سر کھول دیئے۔ سر جھکا کر زینبؑ کے گرد بیٹھ گئیں۔
"بیبیوں کیا ہوا؟ کیا خدا نخواستہ میرا کوئی جان سے جاتا رہا؟ تمہارے سوگ کی وجہ؟
نا بیبیو! میرے لال فوت نہیں ہوئے۔ آج انھیں حیاتِ جاودانی نصیب ہوئی۔ یوں کل
کلاں کو ہیضہ سے مر جاتے۔ طاعون سمیٹ لے جاتا۔ مگر یہ رتبہ نہ پاتے جو حسینؑ ابنِ علیؑ پر
قربان ہو کر نصیب ہوا۔ مجھے تہنیت دو کہ بڑے نصیب والی ماں ہوں۔ دیکھا نہیں کیا شیروں
کی طرح تھے میرے لال۔ ایک بار دشمن کو بھی جتا دیا کہ حسینؑ کی فوج میں کیسے کیسے دم دار
سپاہی ہیں۔"

"زینب! زینب! اب جینے سے وحشت ہو رہی ہے۔ ان معصوموں کے لہو میں ڈوب
کر سرسے پیر تک نچھکا جا رہی ہوں۔ بخدا اب ہمیں جانے دیجئے۔ ہمیں یقین ہے ہمارے لہو
ان ملعون فوجیوں کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ چند جانیں رہ گئی ہیں۔ بچ جائیں۔ یہی غنیمت ہے۔"

مگر ادھر عباسؑ اور علی اکبرؑ میں بحث ہو رہی تھی۔

"ہم دونوں میں سے ایک کو اجازت دیجئے۔" دونوں ضد کر رہے تھے۔ اور امام فیصلے
سے معذور دونوں کا منہ تک رہے تھے۔

عونؑ اور محمدؑ کی شہادت سے زینبؑ بنتِ علیؑ کی دس برس کی کمائی لٹ گئی۔ کلیجہ ہو
لہان ہو گیا۔ تو قاسمؑ کی والدہ کی مارے غیرت کے گردن جھک گئی۔ صبح سے لاش پر لاش
میدان سے آ رہی تھی۔ تو وہ سب سے آنکھیں چرائے ایک کونے میں بیٹھی تھیں۔ اب قوتِ
برداشت جواب دے گئی۔ بیٹھی بیٹھی سسکنے لگیں۔

"یا خدا زینبؑ کی قربانی قبول ہوئی۔ اور میں اپنے لال کو چھپائے بیٹھی ہوں۔ بہن سے
زیادہ بھائی کا حق ہوتا ہے۔ قاسمؑ کو تو سب سے پہلے جانا چاہیے تھا۔ حشر میں فاطمہ زہراؑ
کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ زینبؑ سے آنکھ ملاتے شرم سے پانی پانی ہوئی جاتی ہوں۔ سب گئے
- - - - بس امام کی جان سے دور اب علی اکبرؑ اور عباسؑ کی باری ہے۔ کیا یہ بھی چلے
جائیں گے۔ تب میرے لال کی باری آئے گی؟ نہیں یہ دونوں تو پورے کنبے کا سہارا ہیں۔
امام کے دست و بازو ہیں؛ عباسؑ تو علم بردار ہیں۔ کیا بھلا نشان سرنگوں ہو جائے گا۔

تب قاسم کو ہوش آنے لگا۔ گھبرا کر اٹھیں۔ پیار سے بیٹے کو بلا کر دریافت کیا۔

"کیوں میرے چاند! اب کا ہے کا انتظار ہے۔ چچا نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ تمہیں اپنی دامادی کا شرف عطا کیا کہ یہی تمہارے بابا کی وصیت تھی۔ اب تمہیں اپنا فرض ادا کرنا ہوگا۔ میری آبرو تمہارے ہاتھ ہے میرے چاند۔"

"امی میں تو صبح سے ضد کر رہا ہوں۔ خوشامد کر رہا ہوں۔ مگر چچا جان اجازت نہیں دیتے مگر اب ہم نے فیصلہ کر لیا ہے۔ خواہ اسے گستاخی تصور کر لیا جائے۔ ہم اپنے استاد اور معلم عباسؑ ابن علیؑ کو ہرگز اپنے سے پہلے نہ جانے دیں گے۔"

قاسمؑ ابن حسنؑ نے بڑے جوش سے کہا۔

"اچھا تم جاؤ جھٹ پٹ دلہن سے رخصت ہو لو۔ میں امامؑ کے پاس جا کر تمہاری سفارش کرتی ہوں۔ انھوں نے آج تک میری بات کبھی نہیں ٹالی۔"

قاسمؑ سر جھکائے ایک شب کی بیاہی اپنی کمسن دلہن سے آخری ملاقات کے لیے اس کے خیمے میں گئے۔ آنکھ کھول کر ایک دوسرے کو اپنا جانا تھا۔ بزرگوں کے فیصلے کا انہیں پتہ تھا کہ جوان ہو کر وہ ایک دوسرے کے ہو جائیں گے۔ ایک ہی گھر میں ساتھ کھیلے ساتھ تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ویسے بھی آلِ رسولؐ آپس میں شیر و شکر تھے۔ پورا خاندان ایک دوسرے سے بندھا ہوا تھا۔ قاسمؑ اور فاطمہ کبریٰ کے درمیان یہ بندھن اور بھی مضبوط ہو چکے تھے۔ بھائی کی وصیت پوری کرنے کے لیے امامؑ نے فاطمہ کبریٰ سے قاسمؑ بن حسنؑ کا نکاح کر دیا تھا۔ عجیب وقت تھا اور عجیب و غریب یہ شادی تھی۔

قاسمؑ بن حسینؑ خیمے میں داخل ہوئے تو ساتھ کی کھیلی ایک شب کی بیاہی دلہن سے مرنے کی اجازت لینے کے خیال سے وہ سر سے پیر تک کانپنے لگے۔ بس یہیں تک کا ساتھ تھا۔ وقت انھیں ایک دوسرے سے چھڑا رہا تھا۔ آخری بار ان سے کچھ کہنا تھا کچھ سننا تھا آنکھوں میں آنسو تھے۔ دل میں درد تھا۔ اور زبان گنگ تھی۔ دلہن نے قاسمؑ کو دیکھ کر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا اور چادر سر پہ کھینچ لی۔ قاسمؑ کا دل بڑے زور سے دھڑکا۔ وہ گم سم کھڑے اس کے مہندی میں رچے چھوٹے چھوٹے ہاتھ پیر دیکھتے رہے۔ تین دن کی پیاس

ہونٹ خشک تھے۔ زبان پر کانٹے تھے۔ بہ مشکل کہا۔

"ہمیں شادی راس نہ آئی۔ تم ہی بتاؤ ہم کیا کریں؟ کیا چچا جان کو ایسے وقت میں چھوڑ کر منہ چھپا کر بھاگ جائیں۔ وہ قتل کیے جائیں۔ خون میں نہائیں۔ اور ہم زندہ رہیں۔ کچھ منہ سے تو بولو؟ وہاں جا رہے ہیں۔ جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔ ایک بار اپنا چہرہ جی بھر کے دیکھ لینے دو؟ پھر کہاں موقع ملے گا۔"

بنت حسین نے آنکھوں پر ہتھیلیاں رکھ لیں اور سسکیاں لینے لگیں۔

"واللہ ملک عدم کے مسافر سے شرما رہی ہو۔ یہ سراسر ظلم ہے۔ ہمارے آخری وقت بھی تو نہیں کہ تمہیں منالیں۔ موت کی پکار کانوں میں گونج رہی ہے۔ جی بالکل تمہیں چھوڑ کر جانے کو تیار نہیں۔ مگر قسمت میں جدائی لکھی ہے۔"

پھر بھی کبریٰ کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلا، بس جی سسکنے لگا۔ کلیجے پر چھری سی چلی اور چہرے پر رنڈاپا چھا گیا۔

"کچھ بولو نا، ہمارے کان تمہاری آواز سننے کو ترس رہے ہیں۔"

کبریٰ نے ہاتھ منہ سے اٹھائے۔ ڈرتے ڈرتے آنکھیں اوپر کیں، کچھ کہنا چاہا، مگر منہ سے آواز نہ نکلی۔ آنکھیں پھر جھک گئیں۔

"اچھا جب ہمارا لاشہ مقتل سے آئے گا۔ تب بھی یونہی شرما کے بیٹھی رہو گی۔ بین بھی نہیں کرو گی، روؤ گی بھی نہیں۔"

قوت برداشت جواب دے گئی۔ کمسن دولہن پھوٹ کے رو پڑی۔ آنسو بھری آنکھوں سے ٹکٹکی باندھ کر دیکھا۔ کلیجہ کھنچ کر آنکھوں میں آ گیا۔

"ساری عمر کے نباہ کا وعدہ کیا ہوا؟ سب بھول گئے۔ کیا اسی لیے ہاتھ تھاما تھا کہ بیچ منجدھار چھوڑ کر چل دو گے۔ ہم نے آنکھ کھول کر بس تمہیں کو دیکھا اور آنکھوں میں بجز کوئی نہ سمایا۔"

"ہم نے بھی تمہیں کو اپنی دنیا سمجھا۔"

"جاتے تو ہو ہمیں بھی جینے کا طریقہ بتاتے جاؤ۔"

"کبرا بنت حسینؑ، تم بہادر باپ کی بہادر بیٹی ہو۔ ہمیں ہنسی خوشی رخصت کرو۔ اللہ کو تو بہادر۔ تمہیں پا کر زندگی کتنی پیاری سی لگنے لگی تھی۔ تمہیں کھونے کے خیال سے دل کا خون ہوا جاتا ہے بس کوئی چارہ نہیں، ہماری خوشی پر موت کو رشک آگیا۔ ہمارا ملن منظور نہیں تھا۔ اے بنت عم! واللہ مرنے کو جی نہیں چاہتا۔ بس یہی آرزو ہے کہ ساری عمر یوں ہی بیٹھے تمہاری صورت واللہ مرنے کو جی نہیں چاہتا۔ بس یہی آرزو ہے کہ ساری ساری عمر یوں ہی بیٹھے رہیں۔ لیکن بہت جلد یہ آنکھیں بے نور ہو جائیں گی۔ یہ دنیا معدوم ہو جائے گی۔ بہشت بریں میں بھی تمہاری جدائی کا غم ستائے گا۔ وہ مدینہ والا گھر، وہ مکہ کی گلیاں، تمہارا بات بے بات ہنسنا، وہ شوخیاں، شرارتیں اور پھر یکایک سنجیدہ ہو کر فنا اور ثبات کے فلسفہ میں الجھ جانا۔۔۔"

"کاش میں تمہارے سہرے کے خشک پھول کی طرح خوش نصیب ہوتی، جو تمہارے ساتھ میدان میں جا رہے ہیں۔ ادھر تم جاؤ گے ادھر ہمارا دم نکل جائے گا۔"

"نہیں نہیں تم نہ رہیں تو ہمارے لاشہ پر ماتم کون کرے گا۔ ہمارا سوگ کون منائے گا۔ موت کا خوف کم ہو جاتا ہے۔ جب تمہیں اپنے غم میں بال بکھرائے، آنکھوں میں آنسو بھرے تصور میں دیکھتے ہیں۔ اچھا جان قاسمؑ ایک بار مسکرا دو کہ تمہاری مسکراہٹ ہماری ان اندھیری راہوں میں مشعل کا کام دے گی۔"

اے صاحب دلہن کی باتوں نے ایسا دل موہ لیا کہ اپنے فرض کو بھی فراموش کر بیٹھے۔" قاسمؑ کی والدہ نے پکارا۔

ماں کی آواز سن کر قاسمؑ چونک پڑے، بڑی منتوں، سماجت سے روتی سسکتی کبرا کو اپنے سینے سے جدا کیا اور بغیر پلٹ کر دیکھے۔ تیزی سے باہر نکل گئے۔ کبرا دامن پکڑتی رہ گئیں

خیمے میں ماتم برپا ہو گیا۔ بیبیوں نے سر پیٹ لیے۔

"ہے ہے لوگو، یہ کیا اندھیر ہے، ایک شب کی بیاہی دلہن کا سہاگ لٹ رہا ہے۔ معصوم بچی کی دنیا اجڑ رہی ہے۔"

"خدارا بدشگونی کی بات منہ سے نہ نکالو۔ میرے لاڈلے کی بارات سج رہی ہے۔"

قاسمؑ کی ماں نے آنسو پونچھ ڈالے اور کہا۔ قاسمؑ جب باہر نکلے تو دیکھا۔ امام غمگین کھڑے ہیں۔ قاسمؑ ڈر گئے کہیں حضرت کی آ [illegible] بچا [illegible] امام ارادہ نہ بدل دیں اور انہیں جانے سے

روگ دیں سب بے قرار ہو کر ان کے قدموں پر گر پڑے۔

"چچا جان آپ کو بابا کی قسم اس وقت مجھے نہ روکئے گا۔ للہ اجازت دیجئے۔"

"بھائی بیوہ بھاوج کا بھی کچھ تم پر حق ہے۔ اجازت دو۔" قاسمؑ کی والدہ نے کہا۔

"حسینؑ قاسمؑ کو تمہاری پناہ میں دیا۔ اسے سرخ روئی کا موقع دینا کہ یہ اس کا حق ہے" دور سے مرحوم بھائی کی آواز آتی سنائی دی۔

امام نے بھتیجے کو سینے سے لگا لیا۔

"جو حکم الٰہی۔ جاؤ میرے عزیز، تمہاری جدائی کا داغ بھی سہنا ہوگا۔ کیا فرق پڑتا ہے، تم آگے چلو ہم بھی تمہارے پیچھے آ رہے ہیں۔ بس کوئی دم کا وقفہ ہے۔ یہ بھی نصیب میں تھا کہ ہم خوشی خوشی اپنی لاڈلی بیٹی کا اپنے ہاتھوں سے سہاگ اجاڑیں گے۔ ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔"

پھر اپنے ہاتھ سے دستار باندھ کر شملے کے دونوں سرے سینے پر لٹکا دیئے (گویا مثل کفن خاک کیا) کمر میں تلوار باندھی، پھر کچھ سوچ کر آہستہ سے کہا۔

"قاسمؑ گھبرا کے کہ اگر پیچھے سے نکل جاؤ تو اس ہنگامے میں کسی کو خبر نہ ہو گی۔ اگر تم قبیلہ بنی سعد تک پہنچ گئے۔ تو کوئی خطرہ نہ رہے گا۔ تم دونوں بچ جاؤ گے۔"

"مگر اپنے ضمیر کی ملامت سے بچ کر کہاں جاؤں گا۔ ایسی ہی آپ کو میری جان پیاری تھی تو دمشق کے دربار میں مجھے چلنے دیا ہوتا۔ اپنی مقدس گود میں مجھے کیوں پالا؟ میں آپکا حکم نہیں مان سکتا۔"

"ہمارا مقصد ملالو شہزادے یہ واضح کر دینا میرا فرض ہے کہ میں نے ساری بندشیں ختم کر دیں۔ میری جانب سے تم آزاد ہو۔ جہاں چاہو جا سکتے ہو۔"

"میں آپ کی غلامی کے مقابلے میں ہر آزادی کو ٹھکراتا ہوں۔"

کم سن بھتیجے کے چہرے پر جلال کی سرخی دیکھ کر امامؑ کو مرحوم بھائی یاد آ گئے۔

"خوش نصیب ہے میری بیٹی جسے قاسمؑ جیسا شوہر ملا۔ مگر مختصر تھا یہ مبارک رشتہ۔"

جوشِ جذبات سے امام کا گلا رندھ گیا۔

قاسمؑ بن حسنؑ نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ ایک برق سی چمکی اور ظالموں کی فوج پر نازل ہو گئی۔

نوعمر قاسمؑ کو دیکھ کر ایک بار تو ظالموں کے پتھر دل بھی موم ہو گئے۔ بچپن جا رہا تھا۔ آمد شباب تھی۔ ایک شب کی بیاہی دلہن کے تصور کا خمار آنکھوں میں ہیروں کی جوت جگا رہا تھا۔ ابھی ہاتھوں کی مہندی بھی میلی نہ ہوئی تھی۔ سہرے کے سوکھے پھول اب تک ریشمی زلفوں میں الجھے ہوئے تھے۔ بازوؤں میں کسی کے لرزاں جسم کا احساس پھڑک رہا تھا۔ نئی نویلی دلہن کو سسکتا سلگتا چھوڑ کر عروسِ اجل سے ہم آغوش ہونے کے سامان تھے۔ دُبلے پتلے جسم پر زرہ بکتر عجیب بے تکی سی لگ رہی تھی۔ جیسے کوئی کچے ہنسی ہنسی میں سوانگ بھر آیا ہو۔ زندگی کی لطافتوں سے منہ موڑ کر اتنے پیارے انسان موت کا کھیل کھیلنے پر کیوں مجبور ہو جاتے ہیں؟ ملک گیری کی ہوس نئے نئے انداز سے امن اور سلامتی کا خون کرتی ہے۔

جب قاسمؑ ابن حسنؑ نے جھوم کر رجز شروع کیا تو سننے والوں کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ اترنے لگا۔ سماعت لہو لہو ہو گئی اور جنگ بازوؤں کی تلواریں خود بخود جھک گئیں۔ کسی میں تابِ مدافعت نہ رہی۔ سجیلے نوجوان کا منہ زور گھوڑا آندھی اور طوفان کی رفتار سے روندتا، بجلیاں گراتا، قیامت برپا کرتا مفلوج لشکر پر سے گزر گیا۔ تلوار سے شعلے برسنے لگے اور صفیں کاٹ دیں۔

فرات کا پانی لہو ہو گیا۔

ابن سعد نے خوف سے لرز کر ارزق شامی کو پکارا۔

"اے ارضِ شام کے سورما! کیا کھڑے دیکھ رہے ہو؟ فوج بدحواس ہوئی جاتی ہے۔ آگے قدم بڑھاؤ۔ یہ طوفان تو برچھی بھالوں سے رکتا ہے نہ کمند کے دام میں آتا ہے۔ بڑھو چل تن اور ایک ہی وار میں اس بچے کو برچھی میں پرو کر قصہ ختم کرو۔ تمہیں اس شریر لڑکے کا سر لانے پر منہ مانگا انعام ملے گا۔ شاید تم جانتے ہو گے کہ قاسمؑ کا وجود بڑی

اہمیت کا حامل ہے۔ یہ حسنؓ کا بیٹا اور حسینؓ کا داماد ہے۔ یہ ہمارے آقا کا اہم ترین دشمن ہے۔ اس کے دل میں ہمارے لیے دو آتشہ آگ بھڑک رہی ہے۔ ایک تو اپنے باپ کی شہادت کا غصہ دوسرے اپنے چچا اور خسر کی حمایت کا جوش۔ اس کے سر کا حق دار میں تمہیں ہی سمجھتا ہوں کہ تم فوج کے سب سے افضل جنگ باز ہو۔"

ارزق شامی زبردست پہلوان تھا۔ ایک جنبشِ تیغ سے صفیں اُلٹ کر رکھ دیتا تھا۔ اس کا نام سن کر تلواریں ہاتھوں سے چھوٹ جاتی تھیں اور بڑے بڑے سورماؤں کا پتہ پانی ہو جاتا تھا۔ اس کا نعرۂ جنگ سن کر پہاڑ چیخ جاتے تھے۔ پرندے مر کر پتوں کی طرح گرنے لگتے اور دریا اپنا پاٹ چھوڑ کر پیچھے ہٹ جاتا تھا۔

اس کے لیے مشہور تھا کہ اگر فولاد کو مٹھی میں لے کر نچوڑ دے تو پانی ٹپکنے لگے اور زمین پر بھرپور ٹھوکر مار دے تو چھاتی پھٹ کر لاوا اگلنے لگے۔ وہ سوار کو مع گھوڑے کے زین پر ہاتھ ڈال کے سر سے اونچا اٹھا کر لاوا اگلنے لگے۔ وہ سوار کو مع گھوڑے کے زین میں ہاتھ ڈال کے سر سے اونچا اٹھا کر چک پھیریاں دے کر اس زور سے پٹختا تھا کہ کفن دفن کی زحمت سے رہائی مل جاتی تھی۔ سوار مع گھوڑے کے کئی ہاتھ زمین میں دھنس جاتا تھا۔ کل کے پیدا ہوئے قاسمؓ بن حسنؓ جیسے لڑکوں کو تو وہ پھونک مار کر اڑا سکتا تھا۔ مگر ابنِ سعد کا حکم سن کر بگڑ کھڑا ہوا۔

"یا امیر! تم مجھ کو نہیں سمجھے۔ میں اس کے دادا علیؓ ابن ابی طالب کا ہم رکاب رہ چکا ہوں۔ ان کے ہاتھوں شکست کھا کر بھی میں سربلند ہی مانا گیا کہ ان کے سامنے تو پہاڑ بھی سرنگوں ہو جاتے تھے۔ میں چنے ہوئے مشہور و معروف پہلوانوں کو خاک چٹا چکا ہوں۔ اس کل کے بچے سے مقابلہ کرنا میرے فنِ سپاہ گری کی توہین ہے۔ دنیا مجھ پر ہنسے گی۔ میں جو رستم پیل تن کو خاطر میں نہیں لاتا۔ میری تلوار کی آب دیکھ کر ہی مخالف اندھے ہو جاتے ہیں۔ میری عقل ماری گئی ہے جو اس ٹانگ برابر کے چھوکرے سے لڑوں۔ میرے چاروں بیٹے نہایت دلیر، جنگ آزما اور جری شیر ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کو بھیج دو۔ لمحوں میں صفایا کر دے گا۔" ارزق شامی کے چاروں بیٹے کہنے کو پیغمبر خدا کی امت میں سے تھے۔ مگر عمل میں

شیطان کے چیلے تھے۔ انھیں دیکھ کر یزید کے چیلے نے جنگ کا حکم دیا۔ اور ان میں سے جو سب سے زیادہ نحیف تھا مگر چھوٹے سے ہاتھی سے کم نہ تھا۔ اشارہ کیا اور کہا کہ "جاؤ اور پلک جھپکنے میں اس بچے کا سر کاٹ کر ہمارے حضور میں پیش کرو۔ حسنؑ کا بیٹا ہے، حسینؑ کا داماد ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ اسے اپنی ہستی پر بڑا غرور ہے۔ جب کم سن بیٹی نوشا کی لاش پر سر پیٹے گی۔ تو حسینؑ کو ہم سے مقابلہ کرنے کا مزہ معلوم ہوگا۔ جاؤ اور اسے بلاتکلف ذبح کر دو، انعام و اکرام سے مالا مال کر دیئے جاؤ گے۔ امیر المومنین اپنے دستِ خاص سے تمہیں خلعت پہنائیں گے۔ دستارِ فضیلت سے سر بلند کریں گے۔ جب اس کا سر بے جان شہنشاہ کی خدمت میں پیش کرو گے۔ تو بے حساب عزت اور مرتبہ پاؤ گے کہ پیڑھی در پیڑھی اولاد در اولاد سرخرو ہو جائے گی۔ بڑھو میرے شیر کہ ایسے موقع زندگی میں بار بار نہیں آتے۔ فوج میں ہزاروں اس زریں موقع کے لیے دین و ایمان لٹانے کو تیار ہیں۔ مگر تم ارزق شامی کے فرزند ارجمند ہو۔ ہم اس عزت کا اہل تمہیں کو سمجھتے ہیں اس لیے فائدہ اٹھاؤ پہلوان۔"

جذبۂ حق اور دولت کی ہوس کا مقابلہ تھا۔ قاسمؑ بن حسنؑ کے ہاتھ میں مددِ الٰہی شامل ہوئی تھی۔ ایمان اور یقین کے جوش سے سینہ تمتما رہا تھا۔ یکے بعد دیگرے چاروں بیٹے مقابلے میں آئے۔ اور خاک ہو گئے۔

چار جوان پہلوان بیٹوں کی موت نے ارزق شامی کو دیوانہ بنا دیا۔ وہ غصہ اور نفرت سے آگ بگولہ ہو گیا۔ آنکھیں انگارے اگلنے لگیں۔ منہ میں سے تندور کی طرح شعلے نکلنے لگے۔ کفن پھاڑ کر دیو کی چنگھاڑتا، صفوں کو چیرتا، جو سامنے آیا اسے جہنم واصل کرتا ایک پہاڑ کی طرح نکلا۔ کندھے پر ڈیڑھ من کی کمان۔ سر سے پیر تک فولاد کی زرہ بکتر میں غرق گرجتا گرجتا نازل ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کسی نے طوفانی دیو کو لوہے کے جال میں جکڑ دیا ہے۔
امامؑ نے جو اس قہر بداماں کو قاسمؑ کی طرف رخ کرتے دیکھا تو ساری امیدیں منقطع ہو گئیں بڑی حسرت سے عباسؑ سے کہا۔

"لو برادر قصہ ختم، جنگ ختم ہو چکی۔ حسنؑ کا یتیم بچہ اب شہید ہوا چاہتا ہے۔ مجسم موت اس کی طرف بڑھ رہی ہے۔ میری بیٹی کا سہاگ بس چند لمحوں کا مہمان ہے۔" پھر قبلہ رو ہو کر دست بدعا

ہوئے: "اے خالق زمین و زمان، ربِ پاک ذات، میرے قاسمؓ کو ارزق شامی کے عذاب سے بچا تو جو دنیا کا رکھوالا ہے۔ رحیم و کریم ہے۔ اسے بچا کر میرے شہید برادر کا بچہ ہے ایک معصوم دوشیزہ کی امیدوں کا سہارا ہے۔ رحم کر پروردگار، میں تجھ سے قاسمؓ کے لیے حیات ابدی نہیں مانگتا۔ بس اس درندے کے ہاتھوں موت نہ دے۔"

بڑے معرکے کا مقابلہ تھا۔

ادھر امام کے دل سے نکلی ہوئی دعائیں خدا کے حضور میں پہنچیں، ادھر نابکار ارزق شامی قاسمؓ کی طرف بڑھا اور گرج کر بولا۔

"ہوشیار اے طفلِ مکتب! میں دلیر زادوں کو جنگ سے مسل کر سرنگوں بنا چکا ہوں۔ میری ایک نگاہِ غلط انداز سے لشکر کے لشکر گمراہ بن جاتے ہیں۔ میں وہ قہر ہوں جس سے کسی کو پناہ نہیں۔"

قاسمؓ نے ہنس کر للکارا۔

"زیادہ بک بک نہ کر۔ اللہ شیخی خوروں کو پسند نہیں کرتا۔ غرور و تکبر کا سر ہمیشہ نیچا ہوتا ہے۔ میں کم عمر سہی مگر میرا یقین و ایمان، تجھ جیسے فاسق، اور گمراہ سے زیادہ بلند ہے۔ میں اس امام کا پرستار ہوں۔ جو حق کی خاطر سر سے کفن باندھ کر آیا ہے۔ زیادہ منہ پھاڑ کر بے ہودہ خرافات نہ کر، کچھ دم خم ہے تو ذرا اپنی چال دکھا۔ ہم بھی تو دیکھیں تو کس قماش کا بازی گر ہے۔ اور یہ کہ کون بڑا ہے اور کون چھوٹا۔ یہ ابھی سامنے آ جائے گا۔"

ارزق شامی غصے سے بھنبھنا کر جھپٹا۔ قاسمؓ نے بس ایک قدم گھوڑے کو جنبش دی۔

پہاڑ سا پھسلتا ہوا پہلو سے نکل گیا۔

قاسمؓ نے پھر قہقہہ لگایا۔

"تیرا نشانہ تو تیرے الٹے آ رہا ہے۔ دیکھ تو تیرے گھوڑے کی کمر بوجھ سے ٹوٹی جا رہی ہے۔ ذرا سنبھل کے، کہیں تجھ سمیت گھوڑا بیٹھ نہ جائے۔ کئی لاشوں جیسا بوجھ ہے اس غریب کی جان پر۔ ایک تو تیرا اپنا بوجھ، اوپر سے زرہ بکتر اور ہتھیاروں کا بوجھ اور سب سے زیادہ جو تیرے کندھے پر اجل سوار ہے۔ اس کا بوجھ۔ توبہ توبہ۔ تو صرف بے رحم ہی کا بوجھ ہے۔" بجلی ہوا کا جھٹکا میں نوخیز قاسمؓ کی پھرتی اور ارزق شامی

بے بوجھل ڈیل ڈول کا فرق کھل گیا۔ تلوار ہاتھ سے اڑ کر دور جا گری۔ اس نے جھنجھلا کر نیزہ طلب کیا۔ قاسمؑ کی دو دھاری تلوار سے ایک ہی وار میں ایک کے دو ہو گئے۔

اب ازرق نے کمان سنبھالی اور جتا کر چلّہ چڑھانے لگا۔ قاسمؑ بن حسنؑ کی تیر سے زیادہ تیز نظر کی تاب نہ رہی۔ حواس مختل ہو گئے۔ ہاتھ کانپے اور چلّہ اتر گیا۔ قاسمؑ نے چھیڑنے کو پھر قہقہہ لگایا۔

ارے احمق تو تو بس گوشت کا ڈھیر ہے۔ کم بخت ذرا ٹھیک نشانہ لگا کر یہ چڑیا کو پکڑ لے؟

غیظ و غضب سے ازرق شامی کی آنکھیں ابل پڑیں۔ قاسمؑ کی چھیڑ خانیوں سے تنگ آ گیا۔ خود اس کی فوج کے سپاہی زیر لب مسکرا رہے تھے۔ وہ اس مرزا کی ایک کمسن لڑکے کے ہاتھوں درگت بنتے دیکھ کر جی ہی جی میں خوش ہو رہے تھے۔ پاجی سب پر بے کار ہی دھونس جماتا تھا۔ اپنے وزن کا رعب جماتا تھا۔ آج قلعی کھل رہی تھی۔ تو سب کو لطف آ رہا تھا۔

امام حسینؑ کے خیموں میں سے بچے بچیاں جھانک جھانک کر یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ کیا ستم کا بازی گر ہے۔ بھالو کو ننگی کا ناچ نچا رہا ہے۔ ابوالفضل عباسؑ بھی گھوڑا بڑھا کر آگے آ گئے اور بڑے شوق سے اس دلچسپ اور مضحکہ خیز جنگ کا لطف اٹھانے لگے۔ بار بار منہ سے نکل جاتا۔

"سبحان اللہ، واہ، مرحبا قاسم میری جان، ہاں یہی موقع ہے۔ شاباش، واہ بازو سے۔"

قاسمؑ کی تلوار سرسرائی اور ازرق کا دایاں کان جھک پڑا۔ ہر سمت سے قہقہے ابھرنے لگے۔ ابن سعد باوجود پریشانی کے اپنی مسکراہٹ نہ چھپا سکا۔ اسے یقین تھا۔ بس کوئی دم میں ازرق لڑکے کو چیونٹی کی طرح مسل دے گا۔ ایک کان کٹ گیا تو کیا مضائقہ ہے پھر پہلوان کا کچھ نہ گھٹ جائے گا۔

کھیل ہی تو ہے ذرا اس پہلوان کے دماغ درست ہو جائیں گے۔ اپنے آپ خدا جانے کیا سمجھتا ہے۔

ارزاق چنگھاڑ رہا تھا۔ اپنے ہی فوجیوں کے قہقہے سن کر مارے غصے کے اور بھی اندھے سیدھے وار کرنے لگا۔ گھوڑا اس کے وزن سے بیٹھا جا رہا تھا۔ کئی بار ایسا لگا اب گرا کہ تب گرا۔ کبھی ایک ہتھیار اٹھاتا، اسے بیکار پا کر دوسرا کھینچ لیتا۔ مگر جب دوسرا کمان بھی کٹ کر چھٹک گیا۔ تو ہنسی میں کمی ہو گئی۔ چند خود سر قہقہوں کے سوا ہر منہ بند ہو گیا۔ ابوالفضل عباسؑ نے گھوڑا بڑھایا۔

"بہت کھیل چکے بیٹے۔" ابوالفضل عباسؑ نے آواز دی۔ "تین دن کے بھوکے اور پیاسے ہو، بس تماشا ختم کرو۔"

"جو حکم استاد!" قاسمؑ کی تلوار چمکی سنبھلتے تک ایک ہی وار میں ایک پیل تن کے دو ہو گئے۔

"مبارک ہو۔" امام کے خیمے سے صدا بلند ہوئی۔ عباسؑ خوشی سے رو پڑے۔

"آپ کی دعا ہے چچا جان۔ آپ جیسے استاد ہوں تو کیوں نہ آپ کے ادنیٰ شاگرد سرخرو ہوں گے۔ جب پشت پر میرے امامؑ کا ہاتھ ہو تو فتح لازمی ہے۔ بہت پیاس ہے۔" چچا جان، کاش دو گھونٹ پانی مل جائے۔ پھر دیکھئے یہ لاکھ بس خاک نظر آئیں گے۔"

ارزق جیسے پہلوان کو گرتے دیکھ کر فوج یزید پر سناٹا چھا گیا۔ مذاق ہی مذاق میں بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ سب کے ہوش ٹھکانے لگے۔ چونک کر ایک دوسرے کا منہ احمقوں کی طرح تکنے لگے۔ ابن سعد نے غیظ و غضب سے انگارہ ہو کر گالیاں دینا شروع کر دیں۔

"نمک حرامو، بزدلو، کیا کھڑے منہ تک رہے ہو۔ یہ لڑکا آفت کا پرکالہ ہے۔ ایک ایک کر کے اس کا مقابلہ کیا تو تم سب کے سب گاجر مولی کی طرح کٹ جاؤ گے۔ سب ساتھ مل کر ٹوٹ پڑو۔ ایک دم یلغار کر دو۔"

"مگر یہ تو عربوں کے اصول جنگ کے خلاف ہے۔ اکیلے پر وار کرنا انتہائی بزدلی ہے۔" سپاہیوں نے کہا۔

"کیا تمہیں اپنی بزدلی میں کوئی شک رہ گیا ہے۔ کیا یہ ثابت نہیں ہو گیا کہ تم نکمے اور ڈرپوک ہو۔ بس اصول جنگ رکھو طاق پر اور جان کی خیر چاہتے ہو تو تم ایک دم ہلہ بول دو۔ فکر کیوں

کرتے ہو۔ اگر سب کی توجہ اس تماشے کی طرف تھی۔ ادھر وہ دیکھو۔ ہمارے برچھی برداروں نے امام کے خیموں پر پشت سے حملہ کر دیا۔ بس کوئی دم میں قصہ ختم ہو جائے گا۔

یہ کہہ کر ابن سعد نے تلوار سے خیموں کی طرف اشارہ کیا۔ خیموں پر پشت سے حملہ! زنانہ خیموں پر۔ جونہی قاسمؑ نے اس چرکے میں آ کر پلیٹ مڑ کر دیکھا۔ ابن سعد کا خاص دستہ ان پر ٹوٹ پڑا۔

ابوالفضل عباسؑ جو قاسم کی فتح اور ارزق شامی کی پسپائی اور قتل کی خوشخبری سنانے امام کے خیمے کی طرف جا رہے تھے۔ غل سن کر پلٹے۔ مگر کام تمام ہو چکا تھا۔ قاسمؑ بن حسنؑ کے رہوار کی پشت خالی تھی۔ کچھ نظر نہ آتا تھا۔ گرد و خاک سے آسمان سیاہ ہو رہا تھا۔ ہزاروں تلواریں ایک نکتہ پر چمک کر گر رہی تھی۔ خون میں ملی ہوئی تلواریں اٹھ رہی تھیں۔ امام بے تاب ہو کر میدان میں نکل آئے۔ انہیں خالی ہاتھ اپنی طرف آتا دیکھ کر حیرت زدہ سپاہی پلٹ کر بھاگے۔ ایک دم سب بھیڑ سے اڑ گئے۔ آدم خور گدھوں کی طرح دور جا کر پلٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔

گرد بیٹھ گئی تو امامؑ نے دیکھا۔ قاسمؑ گھوڑوں کی ٹاپوں سے کچل کر ریت میں دھنس گئے۔ نزع کے عالم میں ایڑیاں رگڑ رہے ہیں۔ سوکھے ہوئے ہونٹوں پر کانٹوں بھری زبان لٹک آئی ہے۔ جھک کر ان کے منہ پر منہ رکھ کر بچوں کی طرح رونے لگے۔ نیم جان بچہ نے آخری ہچکی لی اور ہمیشہ کے لیے سو گیا۔ قاسم کا لباس تار تار تھا۔ جسم اور چہرے پر گھوڑوں کی نعلوں کے گہرے نشان تھے۔

جب امام لاشہ لے کر خیمے کی طرف آئے۔ تو نغمہ جنونیوں کی طرح چیخنے لگی۔

”اے بیبیو! کسی کا پردہ ہو تو پرے ہو جائے۔ خیر سے دولہا آرسی مصحف کے لیے آ رہا ہے۔ اے لڑکیو، دلہن کو لاؤ کیسی لاپرواہ بنی ہیں۔ دولہا بھیا کے سر پہ آنچل ڈالو۔ اے دلہن کی اماں، اے بی کہاں بیٹھی ہو۔ جہیز نکالو۔“ بڑھی نغمہ بولتے بولتے ایک دم رک گئیں۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے خون میں نہائے لاشے کو دیکھا اور امام کے قدموں پر گر کر بے ہوش ہو گئیں۔

امام نے قاسمؑ کا لاشہ سجادؑ کے سامنے رکھ دیا۔ پھر بہن سے بولے۔

"جاؤ زینبؑ بدنصیب بچی کو لے آؤ۔ کہنا اس وقت ہم سے کیا شرم؟ دولہا کا آخری دیدار تو کر لے۔"

اتنے میں سکینہ نے چیخ ماری "بابا، کبریٰ اللہ کو پیاری ہو گئیں ان کا دم نکل گیا۔"

قاسم کی والدہ دھندلی آنکھوں سے بیٹے کی لاش کو تک رہی تھیں۔ دن کی بے خوابی بھوک اور پیاس، ہر چہار طرف سے لاشوں نے حواسوں پہ بجلی گرا دی۔ بہکی بہکی باتیں کرنے لگیں۔

"قاسمؑ میرے نوشاہ اٹھو، تمہاری بی اماں کیا سوچیں گی۔ اٹھو میرے لال، دلہن کی پشت پر ہاتھ رکھ کر درود شریف پڑھتے ہیں۔ قربان جاؤں ایسی بے ہوشی کی نیند بھی اچھی نہیں۔ بیٹے کروٹ تو لو۔ میری طرف دیکھو چندا۔ اللہ کچھ دلہن کا بھی خیال نہیں۔"

کبریٰ نے دولہا کی لاش دیکھی تو کلیجے سے ہوک سی اٹھی آہ نکلی اور قدموں پر سر جھکا کر بولیں۔

"تقصیر معاف شہنشاہ۔ آگ لگے اس کم بخت شرم کو، چلتے وقت بات بھی منہ سے نہ نکلی۔ مگر اللہ اتنی سخت سزا، بس اتنا کہہ دیجئے، جا بدنصیب کبریٰ، تجھے معاف کیا۔"

ماں نے کلیجہ تھام لیا۔ بیٹی کو سینے سے لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

"واہ شہزادے، کیا قبر میں سونے کے لیے دولہا بنے تھے۔ قاسمؑ تم نے بڑا ستم کیا، میری ننھی سی دلہن بٹیا کو آنسوؤں کا تحفہ دے کر خود چل دیئے۔"

امام نے غم و اندوہ سے نڈھال بیٹی کے سر پہ ہاتھ رکھا۔ وہ ان کے قدموں پر گر پڑی۔

"بابا، میں کیسی بدنصیب ہوں۔"

"نہیں بیٹی تو خوش قسمت ہے۔ قاسمؑ جیسے شوہر نصیب والیوں کو ہی ملتے ہیں۔ ذرا سوچ اگر تیرا شوہر ظالموں کی فوج کا ایک فرد ہوتا تو کیا تو اپنے سہاگ پہ فخر کرتی۔"

"نہیں بابا۔ ایسی بھیانک بددعا نہ دیجئے۔ مگر قاسمؑ کو سیاہ لباس سے نفرت تھی۔ انہیں لال رنگ پسند تھا۔ میں کیسے پہنوں گی کالے کپڑے، نہیں نہیں یہ چوڑیاں مت

توڑ دو، قاسم نے انہیں بوسہ دیا تھا۔ اے ابن حسنؑ تم سے ایسی بے وفائی کی امید نہ تھی۔

اے موت میں نے تیرا کیا چھینا تھا کہ
تو نے میری زندگی کی ساری بہاریں چھین لیں۔
میں نے تو کبھی چیونٹی کو بھی نہیں مارا۔
پھر کیوں میں جیتے جی مر گئی۔

قاسمؑ ابن حسنؑ کی موت نے امام کو زندہ درگور کر دیا۔ بھائی بیٹے کو ان کی پناہ میں دیکر سوچا ہوگا۔ اس کی زندگی سنور جائے گی۔ امامؑ نے اسے اولاد کی طرح پالا۔ اعلیٰ تعلیم دی۔ فن سپہ گری سکھایا۔ پھر پیاری سی بیٹی بھی بیاہ دی۔

آخر میں موت بھی انہیں نے دی۔

دل پر غموں کا ہجوم تھا۔ سر جھکائے اپنے خیمے میں تنہا بیٹھے تھے۔ کتنے خیمے سنسان ہو گئے۔ میدان کربلا پیاروں کی لاشوں سے گل گلزار ہو گیا۔ بس ایک بھائی عباسؑ رہ گئے ہیں اور ایک بیٹا علی اکبرؑ، دوسرا بیٹا بھی تقریباً بستر مرگ پر ہے۔ جسے جنگ نے نہ کھایا۔ مرض نے روند ڈالا۔ خاندان سادات لٹ گیا۔

بھوک اور پیاس کی وجہ سے بدن میں رعشہ تھا۔ زرد چہرے سوکھے ہوئے ہونٹ سینے میں ہوکیں اٹھ رہی تھیں۔ دل درد سے پھٹا جاتا تھا۔ بالوں پر مٹی خاک، ہاتھوں پر پیاروں کا خون کیا یہ بذات خود موت سے کم ہے۔ جا دوستوں اور عزیزوں کے خون میں شرابور لاشیں اٹھاتے کندھے شل ہو چکے تھے۔ ہر فرد کے ساتھ بوند بوند مرنا پڑا تھا۔

ادھر عباس حسرت سے ہاتھ مل رہے تھے۔ ادھر علی اکبرؑ کا دل و جگر خاک ہوا جاتا تھا۔ زندگی عذاب لگ رہی تھی۔ کندھوں پہ سر ایک بوجھ بنا ہوا تھا۔ عباسؑ چاہتے تھے پہلے وہ امام پر قربان ہوں۔ مگر علی اکبرؑ کو ضد تھی کہ نہیں۔ امام کو عباسؑ بیٹوں سے بھی زیادہ پیارے ہیں دوسرے وہ علم بردار ہیں۔ علم کا سرنگوں ہونا شکست کی نشانی ہے۔ امامؑ کی جان میں جب جان ہے وہ ہار نہیں سکتے۔ علم جھک نہیں سکتا۔

عباسؑ کہہ رہے تھے۔

"نہیں علی اکبرؑ، سجادؑ کی زندگی کا کیا بھروسہ، علی اصغرؑ بھی اس پیاس کی شدت کو کب تک برداشت کر سکیں گے۔ لے دے کر ایک تم ہو۔ تمہیں جینا ہوگا۔ ورنہ میرے آقا کی نسل ختم ہو جائے گی۔ تمہارا غم انہیں جیتے جی مار ڈالے گا۔"

"ہماری نسل کا اب اس دنیا میں ٹھکانا نہیں۔ شاید میں اس معاملے میں بڑا خود غرض ہوں۔ خدا کرے میں ان کا غم نہ اٹھاؤں۔ بابا اپنے ہاتھوں سے مجھے سپرد خاک کریں۔ یہی میری آرزو ہے۔"

"سبحان اللہ کیا حسین دعا ہمیں دی جا رہی ہے۔ کیا ابھی کسر باقی رہ گئی ہے جو تمہاری موت کا داغ بھی سہنا پڑے گا؟ ہمارے خیال میں تو اب تم ہمیں جانے دو۔ تم جیسے جوان جائیں اور ہم تمہارا غم سہنے کو جیتے رہیں۔ اب اس بڑھے دل میں برداشت کی قوت باقی نہیں۔ ہمیں جانے دو۔ ہم اب بہت تھک گئے ہیں۔ زندگی کا بوجھ اب ہم سے نہیں اٹھایا جاتا۔"

"یہ تو ہرگز نہ ہوگا۔ ہمارے ہوتے ہوتے آپ کا بال بھی بیکا نہیں ہو سکتا۔"

دونوں یک زبان ہو کر بولے۔ باوجود اس قدر پریشانی کے امام مسکرا دیئے۔

"تم سمجھتے ہو تم دونوں شہید ہو جاؤ گے۔ ہم تب بھی زندہ رہیں گے۔ تم دونوں ہماری جان ہو۔ تمہارے بعد ہمیں زندہ لوگوں میں شمار کرنا ظلم ہوگا۔ تم دونوں کی موت ہماری موت ہوگی۔"

"معاف کیجئے گا آقا، میں نافرمانی پر مجبور ہو جاؤں گا۔ عباسؑ زندہ رہے اور حسینؑ کی طرف کوئی نظر اٹھا کر دیکھنے کی جرأت کرے۔ آقا جلدی کیجئے۔ ہم میں سے ایک کو اجازت دیجئے۔ دشمن کی فوجیں بے چین ہو رہی تھیں۔ کہیں بے حیائی پر نہ آجائیں۔ اور ہمیں غافل پا کر زنانہ خیموں پر حملہ کر دیں۔"

"مگر سوال یہ ہے پیارو، تم دونوں میں سے میں کسے منتخب کروں۔ فیصلہ بڑا مشکل ہے۔ عباسؑ تم شیر خدا کی امانت ہو۔ پیدا ہوتے ہی بابا نے تمہیں میری گود میں ڈال دیا تھا اور فرمایا تھا: "لو حسینؑ یہ تمہارا ہے۔""

"ہاں آقا! جب دنیا میں میں نے پہلی بار آنکھ کھولی تو آپ ہی کا رخ انور نظر آیا۔"

آپ کے زانو پر بیٹھ کر بزرگوں کے کارنامے سنے۔ آپ کی انگلی پکڑ کر دنیا دیکھی۔ آپ نے پڑھایا لکھایا اور فنِ سپاہ گری کے حصول میں مدد دی۔ میں نے ہمیشہ آپ کو اپنا والی وارث جگر آقا مانا۔"

"میں جانتا ہوں عباسؑ، تم میری پہرے داری نہ کرتے تو میں کبھی کا ختم ہو گیا ہوتا۔ یہ منحوس جنگ میں نے تمہارے بل بوتے پر لڑی ہے اور پھر تمہارے بعد اس علم کی شان کون برقرار رکھے گا؟ عورتوں اور بچوں کو بھی بس تمہارا ہی آسرا ہے۔"

اچانک عورتوں اور بچوں کے خیموں سے آہ و بکا کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ عباسؑ لپک کر باہر گئے۔ فوراً الٹے قدم آئے۔ ان کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ آنکھیں اشکبار تھیں۔

"آقا! میں میدانِ جنگ میں جانے کے لیے سبقت نہیں چاہتا۔ مگر مجھ سے بچوں کی اب پیاس نہیں دیکھی جاتی۔ کچھ بھی ہو سب سے پہلے پانی لانے کی کوشش کرنا ہوگی۔"

"مگر برادر دریا تک پہنچنے کے لیے لہو کا دریا پار کرنا ہوگا۔"

"جانتا ہوں آقا! مگر اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔ للہ مجھے جانے کی اجازت دیجیے۔ بچوں کا رونا بلکنا مجھے پاگل کیے دیتا ہے۔ میں جنگ کے ارادے سے نہیں جاتا۔ بچوں کے لیے پانی لینے جانا چاہتا ہوں۔ شاید انہیں رحم آ جائے۔ اور میں پانی لانے میں کامیاب ہو جاؤں۔"

"یہ تمہارا وہم ہے برادر، پتھر سے آبِ حیات نچوڑنے کی امید رکھتے ہو۔ بچوں کی حالت تو مجھ سے بھی دیکھی نہیں جاتی۔ وہ زر و جواہر نہیں مانگتے۔ تاروں کا خزانہ نہیں چاہتے۔ بس حلق تر کرنے کو چلو بھر پانی کے طلب گار ہیں۔ میں کیسا امام ہوں کہ ان کی اتنی سی ضرورت بھی پوری کرنے کی سکت نہیں۔ مگر عباسؑ کیا اچھا ہو، جو اب ہم جائیں۔ قصہ ختم ہو۔ ہمارے ہوتے ان کی پیاس بجھ جائے گی۔ تم اور علی اکبرؑ بچے کھچے خاندان کو لے کر کہیں دور ہجرت کر جانا۔"

"ہماری قسم نہ تڑوائیے بابا۔ چچا کو نہیں تو مجھے پانی لانے کی اجازت دیجیے۔" علی اکبرؑ نے پیر تھام لیے۔

"اس سے پہلے بھی میں پانی لا چکا ہوں، میں وعدہ کرتا ہوں کہ جنگ نہ کروں گا۔"

پانی کے لیے ان کے سامنے سر جھکا کر بھیک مانگوں گا۔ علی اکبرؑ تم خیموں کی پہرے داری سے غافل نہ رہنا۔ ملعون جانتے ہیں کہ ظلم و ستم کے لیے راستہ صاف ہو چکا ہے۔ آقا اس بحث میں قیمتی وقت برباد ہو رہا ہے۔ اللہ مجھے اجازت دیجیے۔"

"جاؤ برادر تمہیں خدا کے سپرد کیا، پانی لانے کا تو بہانہ ہے۔ تم جا رہے ہو اور ہم روک نہیں سکتے۔ یا خدا مجبوری کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔"

جیسے ہی خیموں میں یہ خبر پھیلی کہ ابوالفضل عباسؑ کو اجازت مل گئی۔ وہ پانی کا بندوبست کرنے جا رہے ہیں۔ نیم مردہ جسموں میں جان پڑ گئی۔ کتنا حسین لفظ ہے "پانی" غش میں ڈوبے بچے چونک کر اٹھ بیٹھے، مردہ جسموں میں صرف پانی کے نام سے ہی جان پڑ گئی۔ بچوں نے کٹورے ہلا دیے، صراحیاں لے کر سب نے عباسؑ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔

"چچا جان، اب تو رلا بھی نہیں جاتا۔ زبان میں اتنے کانٹے پڑ گئے ہیں کہ تالو چھلا جاتا ہے۔" ننھی سکینہ نے ان کے زانو پر سر رکھ دیا۔

عباسؑ کی شریک زندگی نے جوان کے جانے کی خبر سنی تو سر سے پیر تک لرز گئیں۔ فضہ سے کان میں کہا۔

"کیا بغیر ملے ہی چلے جائیں گے؟ اللہ جا کر کہو، آپ کا بیٹا آپ کو یاد کرتا ہے۔ صورت دکھا جائیں۔ ایک بار پیار سے سینے سے تو لگا لیں۔"

ادھر بچے آہ و زاری کر رہے تھے۔

"پیارے عمو جان، اللہ پیاس بجھا دو، اصغر تو پیاس کے مارے ایسے نڈھال ہیں کہ اب رویا بھی نہیں جاتا۔ اب تو پیاس سے کلیجہ پھٹا جاتا ہے۔"

"بس تھوڑی دیر اور صبر کر لو میرے بچو، پھر جی بھر کے پانی پی لینا۔ تمہیں بہلانے کو نہیں کہتے، تمہارے سر کی قسم ہم پانی لے کر ہی لوٹیں گے۔"

ادھر بیوی کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ مارے شرم کے شوہر کی طرف نظر بھر کے دیکھنے کی بھی تاب نہ تھی۔ جانے والے کو روک بھی تو نہ سکتی تھیں۔ عباسؑ آئے اور بولے

"یہ بال کیوں کھولے ہیں۔۔! رو رہی ہو تم؟ ابھی سے ہمارا سوگ منانے لگیں؟ واللہ!

ابھی تو ہم زندہ ہیں۔ تمہیں دیکھ کر ہم بھی ہلکان ہوا جاتا ہے۔ لیکن اس عجوبے کے پیاسے کو زماق ہو تم ایک بہادر سپاہی کی بیوی ہو۔ دل کو سنبھالو، آنسو تو پونچھ ڈالو۔ کیا یہ رونی صورت کا تصور آنکھوں میں بسا کر رخصت کرو گی۔ اوروں کی طرف دیکھو۔ پھول سے عونؑ و محمدؑ کو یاد کرو جوان سال قاسم کی نعلوں سے کچلی ہوئی لاش کا خیال کرو۔ دیکھو تو میری آقا زادی فاطمہ کبریٰ کیسی ہمت والی ہے۔ اس کی تو کسی نے آواز بھی نہیں سنی۔ امام ویسے ہی بے طرح گھبرائے ہوئے ہیں۔ تمہیں روتا دیکھ لیا تو اور بے حال ہو جائیں گے۔ تمہیں تو اپنے نصیب پر ناز ہونا چاہیے۔ تمہارا عاشق شوہر اپنے عظیم مقصد کی خاطر جان کی بازی لگا رہا ہے۔ پیاسوں کے لیے پانی لینے جا رہا ہے۔"

بیوی کی سسکیاں نہ رکیں۔ عابسؓ نے انہیں ہاتھ سے پکڑ کر قریب بٹھا لیا۔

"تم کہو تو چپکے سے پچھلے راستے سے ہم تم اپنے بچوں کو لے کر نکل جاتے ہیں۔ اس ہنگام میں کسی کو خبر نہ ہوگی۔"

"خدا کو بھی کیا خبر نہ ہوگی؟"

"وہاں سے ہم آسانی سے شام پہنچ جائیں گے۔"

"شام"؟

"وہاں شہنشاہ کے دربار میں بڑے بڑے انعامات اور عہدے ملیں گے۔ تم شہزادیوں کی طرح رہو گی۔ عیش کرو گی۔"

"خدا نہ کرے" آپ کے دشمن شام والے کے دربار میں جا کے انعام پائیں۔ خدا ہمارے امام کی عمر دراز کرے وہی خاتونوں کے شاہ ہیں۔ ان کے قدموں میں موت ہی بلند ترین عہدہ ہے۔ یہ آپ کیسی باتیں کرنے لگے۔"

بیوی سسکیوں سے رونے لگیں "دربار شام کی نعمتوں کے مقابلے میں مجھے بیوگی منظور ہے۔"

"عابسؓ نے بیوی کو مع بچے کے بانہوں میں سمیٹ لیا۔

"میں تمہیں آزما رہا تھا جانِ من۔"

"خاک پڑے ایسی آزمائش پر۔ کیا میں آپ کا رتبہ نہیں پہچانتی۔ میرے اوپر اعتماد

نہیں جو آزماتے ہیں۔ کیا کروں، دل عجیب کشمکش میں ہے۔ آپ علم بردار ہیں۔ امامؑ نے خیر فرمائی ہیں تو میں بھی ان کی کنیز ہوں۔ مگر دل ہول کھاتا ہے۔" وہ مجھے ستاتے ہیں۔ ہیوے کھلاتے ہیں میں آپ کو اب نہ روکوں گی۔ جائیے اور پانی لائیے۔ بچے دم توڑے دیتے ہیں۔"

عباسؑ نے نظر بھر کر رفیقۂ حیات کو دیکھا، لوگوں کے اصرار پر بھی انہوں نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ کئی شادیاں کرنے کا عام رواج تھا۔ مگر عباسؑ کو اپنی بیوی سے عشق تھا عورتوں نے خود انہیں پیغام بھیجے مگر انہوں نے کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ اور شاید اس لیے بھی کہ انہیں امام اور ان کے مقاصد سے اتنا عشق تھا کہ زندگی کی تمام ضرورتوں کو پس پشت ڈال چکے تھے۔ کھانا، پینا، سونا جاگنا وہ سب اس زندگی کا تسلسل قائم رکھنے کے لیے برداشت کرتے تھے۔ جو انہوں نے امام کی خدمت کے لیے وقف کر دی تھی۔

یہ وہ زمانہ جب عربوں میں سب رشتے ناطے ٹوٹ رہے تھے۔ دولت اور طاقت کے حصول میں اپنے پرائے کی تفریق ختم کر دی تھی۔ سب غرض کے بندے بن گئے تھے۔ عباسؑ کی یہ والہانہ محبت جو انہیں اپنے بھائی اور پورے خاندان سے تھی۔ عجوبۂ روزگار معلوم ہوتی تھی بچپن ہی سے ہر کس و ناکس کے دکھ درد میں شریک ہونے کے عادی تھے۔ خاص طور پر کمزور بوڑھے اور عورتوں، بچوں پر بے انتہا مہربان تھے۔ انہیں پریشان دیکھ کر بے قرار ہو جاتے تھے۔ محنت اور مشقت کے عادی تھے۔ اپنے والد کے ساتھ کاشت کاری میں بڑی دلچسپی لیا کرتے تھے۔

جب امام حسینؑ ان کی شادی کا پیغام لے کر ان کی سسرال گئے تو بات چیت کے درمیان عباسؑ کی عادت و خصلت کے بارے میں کہا۔

"بڑا لاجواب انسان ہے۔ مگر غصہ کا تیز ہے۔ خدا اس کے طیش سے بچائے۔ ویسے نہایت مسکین اور حلیم الطبع ہے۔ اس کی دوستی خدا کی رحمت ہے۔"

سب وصف ہیں، الفت ہے، مروت ہے، وفا ہے
غصہ مرے عباسؑ کا پر قہرِ خدا ہے!

لوگوں نے کہا۔

"یہ کیا معمہ ہے غصہ کا تیز بھی اور حلیم الطبع بھی، یعنی ایک ساتھ آگ بھی اور برف بھی؟"

"ہاں اور وہ معمہ ہی عباسؑ ہے۔" امام نے ہنس کر کہا۔

جب عباسؑ ابن علیؑ بیوی کے خیمے سے نکلے تو وہ بے ہوش ہو کر بانو کے قدموں پر گر پڑیں۔ عباسؑ نے آستین سے آنسو پونچھے اور بغیر پیچھے دیکھے قدم خیمے سے باہر رکھنا چاہتے تھے کہ ٹھٹھک گئے۔

دیکھا بڑی بہن زینبؑ راستہ روکے خیمے کے پردے سے لگی بیٹھی ہیں۔

"مجھ سے رخصت ہوئے بغیر جا رہا تھا۔؟" شکایت کی۔

"آپ ہی کو تو ڈھونڈ رہا تھا کہ سب سے آخر میں آپ ہی کا منہ دیکھوں گا۔"

زینبؑ قنات کا سہارا لے کر اٹھیں، بھائی کے پاس آئیں۔ عبا کے بند کھولے۔ دونوں شانوں پر بوسے دیئے۔

"جاؤ ابن علیؑ، اللہ تمہارا حافظ و ناصر!"

عباسؑ نے بہن کے دونوں ہاتھوں کو چوما اور پیشانی سے لگایا۔ ان ہاتھوں نے کتنی بار تھپک کر سلایا تھا۔ آج یہ ہاتھ عونؑ اور محمدؑ کے خون سے داغدار ہوئے تھے۔

جب عباسؑ ابن علیؑ کے آنے کی خبر ظالموں کے لشکر میں پہنچی تو خوف و دہشت کی لہر دوڑ گئی۔

"ہوشیار ہو جاؤ، تمہاری موت آ رہی ہے۔ عذاب دوزخ کے لیے سر سے کفن باندھ لو شیر خدا کا فرزند ارجمند آ رہا ہے۔ کیا شان و شوکت ہے! اس کی شاہانہ سطوت اور شباب عالم تاب کے سامنے آفتاب خجل ہے۔ دشت و کوہ لرزاں ہیں۔ کائنات کانپ رہی ہے کہ سرفروشوں کے سردار، دلیروں کے رہنما، جاں بازوں کے سرتاج، علم بردار ابن علیؑ آ رہے ہیں۔"

انھیں دیکھ کر سپاہ شام ایسے لرزنے لگی۔ جیسے شیر کے پنجے کے نیچے بکری۔ ہاتھوں سے ہتھیار چھوٹ پڑے۔ مورچے ٹوٹ گئے۔ صفیں درہم برہم ہو گئیں۔ دشت میں چلتے چیخوں سے چھوٹ گئے۔ جو تلواریں کھینچے ہوئے نادانی میں پلٹے تو اپنوں ہی کو کاٹتے

چلے گئے۔ کسی کو کسی کی سُدھ نہ رہی۔ باپ بیٹے سے اجنبی ہو گیا، یا خدا یہ جنگ تھی کہ قیامت؟ گھبرا کر ابن سعد نے اپنے سپاہیوں کو للکارا۔

"یہ کیا غضب کرتے ہو بہادرو، مورچے چھوڑ کر بھاگ رہے ہو۔ ڈوب مرو چلو بھر پانی میں، تمہیں شرم نہیں آتی، اتنا خوف و ہراس کیوں چھایا ہے۔ یہ علیؑ کا بیٹا ہے، وہی علی ابن ابی طالب جسے ہم نے کتنا کامیاب سمجھ دیا ہے۔ جب ہم نے باپ کو پچھاڑ لیا تو یہ تو صرف بیٹا ہے، بھوکا پیاسا اور نڈھال ہو رہا ہے۔ بچ کے کہاں جائے گا۔ اسے روکنا کون سی بڑی بات ہے؟ یہ اسی کا بیٹا ہے۔ جس نے تمہارے باپ دادا کو پیروں تلے کچلا تھا۔ انھیں شکست فاش دی تھی۔ بس میرے جیالو! بڑھ کر جنگ بدر میں مارے جانے والوں کا بدلہ لے لو۔ خاک میں ملا دو، گھوڑوں کی ٹاپوں سے گرد کر دو۔"

شیطان نے جو راہ دکھائی تو لشکریوں کی شامت آگئی۔ فوج ایک گھٹا کی طرح امنڈ کر نہر کے گھاٹ پر برس پڑی۔ بکھرے ہوئے بدحواس جنگ باز پھر سے مرتب ہوئے۔ رنگین علم اونچے کھڑے ہو گئے۔ نیزے سروں سے اوپر اٹھ گئے۔ برچھیاں تولے سپاہیوں کے دل بڑھنے لگے۔ دیکھا دیکھی اوروں کے بھی دل بڑھ گئے۔ گرز تول تول کر پہلوان آگے آنے لگے۔

ابوالفضل عباسؑ نے نہایت تلی ہوئی آواز میں رجز شروع کیا۔

"آنکھیں کھول کر غور سے دیکھو کہ پھر فرصت نہ ملے گی۔ میں شیر خدا کا فرزند امام حسینؑ کا ایک ادنیٰ غلام تم سے بچوں کے لیے پانی کی درخواست لے کر آیا ہوں۔ انکار کی صورت میں یہ التجا تمہارے حق میں موت کا پیغام بن جائے گی۔ معصوم پیاسے بچوں سے تمہاری جنگ نہیں، نہ وہ تمہارے دشمن ہیں نہ انھیں تمہاری سیاست سے کوئی واسطہ ہے۔"

"یا ابن علیؑ! پانی چاہیے تو خلیفۂ وقت کے ہاتھوں پر بیعت کرو۔ ورنہ تم تو کیا پہلے علی اصغر بھی گھٹنوں چلتے پانی کی آس میں آئیں گے۔ تو جواب میں تلوار، نیزے اور برچھیاں پائیں گے۔ اب بھی وقت ہے، بیعت کر لو اور دریا سے جتنا پانی چاہو لے لو۔" ابن سعد نے بلند آواز سے کہا۔

"او احمقوں کے سردار جانتا بھی ہے کہ بیعت کی شرائط کیا ہیں؟ بیعت برضا و رغبت

کی جاتی ہے۔ روز، زبردستی اور دباؤ ڈال کر لی ہوئی بیعت بے معنی ہے۔ ایسی بیعت کرنے والا گنہگار اور لینے والا احمق ہے" عباسؑ نے جواب دیا

"ہمیں اس بحث سے کوئی سروکار نہیں۔ ہم حکم کے بندے ہیں۔ جان کی خیر چاہتے ہو تو اپنے امام کو سمجھاؤ کہ ہٹ دھرمی چھوڑ دو اور راہِ راست پر آ جائیں"

عباسؑ کا غصہ اپنے پورے جلال سے پھٹ پڑا۔

"او یزید کے بےباک، زبان سنبھال کے بول، ہمارے منہ نہ لگ، ہماری حرب و ضرب کا سکہ ساری دنیا کے دل پر کندہ ہے۔ ہم کہ پہاڑوں کو جنبش سے پرے سرکا دیں۔ اے شقی القلب درندے، کیسی عبرت کا مقام ہے کہ تیرے گدھے، گھوڑے فرات میں کلیلیں کریں اور ساقیٔ کوثر کی اولاد دو بوند پانی کو ترسے، بچوں کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ علی اصغرؑ ساری رات پیاس سے تڑپتے رہے۔ اب رونے کا بھی دم نہیں۔ سکینہ کی جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ حلق میں کانٹے پڑ گئے ہیں۔ اے ظالم تو کس چیز سے بنا ہوا ہے۔ یہ حدت یہ شعلے برساتی لو، خیمے تندور کی طرح دہک رہے ہیں۔ امام کا چمن پتہ پتہ کر کے مرجھا رہا ہے ہاتھ پاؤں سرد، پھول سے رخسار زرد ہیں۔ اور ہونٹ نیلے پڑ چکے ہیں"

ابن سعد کا چہرہ شدتِ خوف سے اودا پڑ گیا۔ آنکھوں کی پتلیاں اپنے محور پر ٹھہرنا بھول گئیں۔ دم گھٹنے لگا۔ سانس باہر جا کر واپس لوٹنے سے انکار کرنے لگی۔

شمر ذی الجوشن نے جو اس کی یہ حالت غیر دیکھی تو گھوڑا اپکاتا ہوا بڑھا۔ ابن سعد کے پاس آ کر گھورنے لگا۔ وہ تو اس تاک میں تھا کہ ابن سعد ذرا بھی ڈھیلا پڑے اور وہ اسے دبوچ لے۔

ابن سعد فوراً چوکس ہو کر سنبھل گیا۔ شمر نے مرقع کی لگام اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اور قہقہہ لگا کر شعلہ فشاں ہوا۔

"یوں پانی نہیں ملے گا۔ اگر امام کو بچوں کی جانیں پیاری ہیں تو بیعت سے کیوں انکاری ہے۔ یہ سامنے دریا موجیں مار رہا ہے۔ ان کے بچے پیاسے ہیں تو اس کے ذمہ دار وہ خود ہیں۔ بیعت کر لیں۔ دریا کھل جائے گا"

"کیا بکتا ہے ناپاک کتے۔" عباسؑ گرجے۔ "غارت ہو کم بخت، تیرے منہ میں خاک۔ تیری اور تیرے امیر شام کی کیا حقیقت ہے۔ کبھی شاہوں نے غلاموں کے آگے سر جھکائے ہیں۔ کعبہ کبھی میخانے کے آگے سرنگوں نہیں ہوتا۔ ایک ظالم شرابی اور بدکار انسان کے ہاتھ پر میرے آقا بیعت کر کے دینِ اسلام کی توہین نہیں کر سکتے۔ اپنی عمر بھر کا سرمایہ وہ یوں خاک میں ہرگز نہیں ملائیں گے۔ تو انہیں مجبور و لاچار سمجھتا ہے۔ اگر وہ چاہیں تو چشمۂ کوثر ان کے قدموں پر قربان ہو جائے۔ تو فاطمہؑ کے لال کا مرتبہ نہیں پہچانتا۔ وہ کتنے سر بلند اور عظیم ہیں۔ ان کا دشمن پیغمبرِ خدا کا دشمن ہے۔ دینِ اسلام کا دشمن ہے۔ پوری انسانیت کا دشمن ہے۔ تو لٹیرا اور غاصب ہے۔ پانی پر ہر جاندار کا حق ہے۔ پانی خریدنے کے لیے امام کا ضمیر نہیں بک سکتا۔"

"ہمت ہے تو لے لو پانی۔" پھر نرمی سے کہنے لگا۔ "اپنی جوانی پر ترس کھاؤ عباسؑ، تم میرے عزیز ہو۔ تم جیسا جانباز سپاہی دنیا کو پیروں پر جھکا سکتا ہے۔ اپنی طاقت سے سارے جہان کو زیر کر سکتا ہے۔ تم نے میرا امان نامہ ٹھکرا کر عقل مندی کا ثبوت نہیں دیا۔ اب بھی موقع ہے۔"

"پھر وہی سودے بازی۔ یہ سپاہی دنیا کو اپنے پیروں تلے روندنے کے لیے بکاؤ نہیں ہے۔ کسی بھی انسان کو طاقت کے زور سے زیر کرنا ہمارا شیوہ نہیں۔ ہم دنیا کے معمار ہیں۔ خواہ اس تعمیر کی بنیادوں میں ہمیں اپنا خون ہی کیوں نہ نچوڑنا پڑے۔"

"تمہیں اپنے معصوم بیوی بچوں کا بھی خیال نہیں۔ جانتے ہو تمہارے بعد ان پر کیا بیتے گی؟"

"وہی جو فاطمہ زہراؑ کی دوسری بہو بیٹیوں پر بیتے گی۔"

ادھر خیمہ میں بالی سکینہ امام کے گلے میں باہیں ڈالے رو رو کر جان دے رہی تھی۔

"ہائے بابا ہماری ضد پر چچا جان پانی لینے گئے ہیں۔ ہماری توبہ بابا۔ اب ہمیں بالکل پیاس نہیں۔ اللہ چچا جان کو واپس بلا لیجیے۔"

"پانی بغیر وہ واپس نہ لوٹیں گے بی بی۔" امامؑ نے بچی کو سمجھایا۔ "روؤ مت جانِ پدر اور پیاس کی شدت بڑھ جائے گی۔"

اُدھر عباس ابن علیؑ شمر سے کہہ رہے تھے۔

"میں جنگ کے ارادے سے نہیں آیا ہوں۔ معصوموں کے لیے پانی لینے آیا ہوں۔ لیکن کوئی مجھے روکنے کی ہمت کرے گا۔ تو منہ کی کھائے گا۔ مجبوراً مدافعت کے لیے تلوار اٹھانی پڑے گی۔"

یہ کہہ کر گھوڑے کا رُخ دریا کی طرف موڑ دیا۔ شمر نے فوج کو للکارا اور تلواریں میانوں سے نکل پڑیں۔ نیزے بلند ہو گئے۔ برچھی بردار آگے بڑھے۔ طبل اور نقاروں پر چوب پڑی اور میدان کربلا کا سینہ دھڑکنے لگا۔

جنگ کے اعلان کی صدا سن کر امامؑ خیمے سے باہر نکل آئے۔ علم بردار کے ہاتھوں میں علم کو سر بلند دیکھ کر جان میں جان آئی۔ ہجوم غفیر نے عباسؑ کو چاروں طرف سے نرغے میں لے لیا تھا۔ مگر علم صاف ان کی نشان دہی کر رہا تھا۔ جس رخ علم بڑھتا کائی سی چھٹ جاتی۔ سپاہی پشتم پشتم بھاگ کھڑے ہوتے۔

فوج میں عجیب بے اطمینانی اور ہراس پھیلا ہوا تھا۔

"یہ سراسر دھوکا ہے۔ یہ ہرگز عباسؑ نہیں علیؑ ابن ابی طالب ہیں۔ وہی لانبا قد نور پیشانی، آنکھ کی ہر جنبش پیغام اجل ہے۔ وہی دو دھاری تلوار کی خیبر شکن کاٹ، وہی گھوڑے کی پھرتی اور عیاری۔ شیر خدا سے مقابلے کی شرط نہیں تھی۔ ہم علیؑ سے نہیں لڑ سکتے۔" فوج کے قدم پیچھے ہٹ گئے۔

"پاگل ہوئے علیؑ ابن ابی طالب کو تو مسجد میں ابن ملجم نے چھرا مار کر ختم کر دیا تھا۔ غور سے دیکھو۔ یہ عباسؑ ہے۔ تین دن کا بھوکا پیاسا ہے۔ اکیلا ہے۔" شمر ذی الجوشن نے بہت سمجھایا مگر سپاہی گومگو میں پڑ گئے۔ سوچنے سمجھنے کی طاقت سلب ہو گئی۔

عباسؑ نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ ایک دم یلغار کرتے ہوئے دریا تک پہنچ گئے۔ اور گھوڑا پانی میں ڈال دیا۔

پانی کو چھوتے ہی سر سے پیر تک برق سی دوڑ گئی جیسے سرخ دہکتے ہوئے لوہے کو پانی میں بجھا دیا۔ حواسوں پر قابو پا کر عباسؑ نے جھک کر مشکیزہ بھر کر منہ تسمے سے باندھ دیا

پھر اپنی پیاس بجھانے کے لیے چلو بھرا۔ ہتھیلی سے پانی کی تری کلیجے تک آ گئی۔ عجیب نشہ سا طاری ہو گیا۔ آنکھیں بند ہونے لگیں۔ پانی ہونٹوں تک لائے۔ پانی کی خوشبو سے دل و دماغ مہک اٹھا

دو سے لمبے پیاسے معصوموں کی شکلیں آنکھوں میں پھر گئیں، دم توڑتے علی اصغر، نیم مردہ

کملائی کلی کی طرح گرتی پڑتی سکینہ، کرتے کا دامن چوستے باقر ابن عباس

اور پیاسے امام!

ہاتھ کانپا اور پانی واپس دریا میں گر گیا۔

"یا پاک پروردگار، اتنی فرصت دے کہ مشک خیموں تک پہنچ جائے۔ پیاسوں نے بڑی امیدیں لگا رکھی ہیں۔ یا خدا میرا بھرم رکھنے" جی ہی جی میں دعائیں مانگتے تیزی سے نکلے۔ کہ شمر چلایا۔

"خبردار شیر کے بچو! گھیر لو کہ شکار بچ کے نہ جانے پائے۔ یاد رکھو اگر پانی خیمے تک پہنچ گیا تو تمہارے لہو سے فرات کو چھلکا دوں گا۔ فرات کے محافظو، جینا چاہتے ہو تو گھیر لو اکیلے کو، بھاگتی فوج کے قدم ڈھیلے پڑ گئے۔ ہر حالت میں موت سے بغل گیر ہونا ہے عباسؑ کے ہاتھوں جان جائے۔ یا اپنی ہی فوج ذبح کر دے۔ ویسے عباسؑ اکیلے بھی ہیں، ایک ہاتھ میں مشکیزہ ہے۔ سپر بھی وار روکنے کے لیے نہیں۔ بس ان کی دودھاری تلوار ہی ان کی ڈھال ہے۔ عباسؑ تلوار گھماتے مشکیزہ تیروں کی باڑھ سے بچاتے، صفوں کو چیرتے گھوڑا بڑھانے لگے۔ جس رخ تیر آتے تو مشکیزہ بچا کر سینہ سپر کر دیتے۔

دور خیمے دکھائی دے رہے تھے۔ ننھے ہاتھوں میں کوزے لیے ننھے ننھے کھلونوں کی طرح خوشی سے اچھل رہے تھے۔ پانی کے شوق میں بار بار لپکتے۔ مائیں دامن پکڑ کر روک لیتی تھیں۔

کئی بار آنکھوں تلے اندھیرا چھایا۔ بینائی گم سی ہو گئی۔ مگر عباسؑ اپنی علیؑ جیسی ہمت لا زمانہ جانتے تھے۔ زخم کھاتے بڑھتے ہی جاتے تھے کہ ناگاہ کسی ظالم نے شانے پر تلوار ماری۔ بازو کٹ کر دور جا گرا۔ ایک پل کو آنکھیں اندھیر ہو گئیں۔ معلوم ہوا گھوڑے ہوا گھوڑے سے گر پڑیں گے۔ بس وہ سامنے ہی تو خیمے دکھائی دے رہے تھے۔ بس چند ثانیے زندگی کے

اور مل جائیں۔ منزل آ پہنچی۔ قوت ارادی تھی۔ معجزہ ایک کٹتے ہی دوسرے ہاتھ سے مشکیزہ تھام لیا۔ گھوڑا اپنے مالک کی بے بسی کو تاڑ گیا تھا۔ ٹاپوں سے گرز اور تلواروں کا کام لے رہا تھا۔ آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے۔ جو بدبخت سامنے آ جاتا تو ٹکڑا بن جاتا۔ اپنے آقا کے گرم گرم خون میں نہا کر خود گھوڑے پر خون سوار ہو گیا تھا۔ سپاہی چاروں طرف سے چلا رہے تھے۔ چیخ رہے تھے اور چیونٹیوں کی طرح چڑھتے چلے آ رہے تھے۔

دوسرا وار پڑا اور دوسرا بازو بھی کٹ گیا۔ عباسؑ اب احساس کھو چکے تھے۔ مگر حواس قائم تھے۔ نہایت پھرتی سے گرتے ہوئے مشکیزے کو دانتوں سے پکڑ لیا۔ علم کو چھاتی کے سہارے ٹکا لیا۔ مگر تیروں سے مشکیزہ چھلنی ہو گیا۔ سارا پانی عباسؑ کے خون میں مل کر بہہ گیا۔ اسی دم کسی ظالم نے سر پر وار کیا۔ سر کھل گیا اور خون بہہ کر آنکھوں میں بھر گیا اور عباسؑ گھوڑے کی پشت پر گر گئے۔

علم کو سرنگوں ہوتے دیکھ کر امام کلیجہ تھام کر لڑکھڑا گئے۔ اگر علی اکبرؑ نہ تھام لیتے تو بے ہوش ہو کر گر جاتے۔

فوج پر ایک عجیب ہیبت طاری ہو گئی۔ بزدل گیدڑوں کی طرح خوف و ہراس سے چلاتے روتے بلبلاتے اِدھر اُدھر دوڑنے لگے۔ دھکا پیل میں نہ جانے کتنے دریا میں گر کر بہہ گئے۔ کتنے ہی دیوانے ہو کر اِدھر اُدھر تلواریں گھماتے دوڑنے لگے۔ ایک دوسرے کے ٹکڑے اڑانے لگے۔ انہیں پاگل کتوں کی طرح خطرناک سمجھ کر خود ان کے اپنے ساتھیوں نے بہ نظرِ احتیاط قتل کر دیا۔

گھوڑے سے گرتے ہی عباسؑ نے پکارا۔

"آقا! مدد فرمائیے۔"

بھائی کی آواز سن کر امامؑ ننگے سر بھاگے۔ کئی بار گرتے گرتے بچے۔ علی اکبرؑ نے سنبھالا۔ ترائی میں پہنچتے پہنچتے جیسے برسوں لگ گئے۔ ہاتھ پیر کا جیسے دم نکلا جا رہا تھا۔ منزل دور تر ہوئی جا رہی تھی۔ انہیں بڑھتے دیکھ کر کتنے ہی سپاہی اپنی آستینوں میں منہ چھپا کر دور بھاگ گئے۔ جیسے نہتے امام کی نظریں نہیں زہر میں بجھی برچھیاں تھیں کسی غصے سے خونخوار

گی ۔ امام نے جھک کر دیکھا تو علی عباسؑ کا بازو تھا۔ اٹھا کر چھاتی سے لگا لیا۔ اور بچوں کی طرح پھوٹ کر رو دیئے۔

عباسؑ نے بے چین ہو کر پکارا۔

"آقا کہاں ہیں آپ مجھے کچھ نہیں دکھائی دیتا۔ سر کے زخم کا خون آنکھوں میں بھر گیا ہے۔ اسقدر نہیں کہ پوچھ سکوں۔ کیا اپنے مالک کا آخری دیدار بھی نصیب نہ ہوگا۔ یہ دم یوں ہی سینے میں اٹکا رہے گا۔"

امامؑ نے دامن سے آنکھوں کو خون سے پاک کیا، پھر سر، پر سر رکھ کر بڑی لجاجت سے کہا۔

"تم نے مجھے ہمیشہ آقا ہی کہا۔ مجھے ارمان ہی رہا کہ مجھے بھائی کہو۔ میری آرزو پوری کردو مجھے بھائی کہ کر پکار لو عباسؑ۔"

"بھائی ---- بھائی ---- میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ آپ میرے بھائی ہیں" عباسؑ نے موت سے آخری جنگ کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے اسی مقام پر دفن کیجیے گا۔

فرات کے کنارے کہ میں نے اپنے خون سے سینچا ہے۔ میری پیاسی روح کے قرب سے سیراب رہے گی۔ مجھے خیمے میں نہ لے جایئے گا۔ یہاں بڑی پیاری نیند آرہی ہے۔ اُف دنیا کتنی خوبصورت ہے۔ کتنا حسین نغمہ ہے۔ بابا آج کتنے خوش ہیں۔" ایک سرد اطمینان بھری آہ منہ سے نکلی اور عباسؑ ابن علیؑ ہمیشہ کے لیے سو گئے۔

امامؑ نے کٹے ہوئے بازو چلو میں رکھ کر عبا کو اچھی طرح لپیٹا اور اپنا کمربند کھول کر باندھ دیا۔ اپنے دامن سے ان کا چہرہ پاک کیا۔ بکھرے بال سنوارے اور گھٹنوں پر ہاتھ ٹکا کر اٹھے۔

علی اکبرؑ لاش اٹھانے کو جھکے تو روک دیا۔

"نہیں نہیں سونے دو، بہت تھکا ہوا ہے۔

"خیمہ میں لاش نہ لے گئے تو سب بے قرار ہو کر نکل پڑیں گے۔ وعدہ کیسے سکینہ کس طرح مچل رہی ہیں۔ پھوپھی جان تو دیوانہ وار ننگے سر آ جائیں گی۔"

"نہیں، بچوں نے یہ کٹے ہوئے بازو دیکھ لیے تو پاگل ہو جائیں گے۔ بس میرے علم بردار کا علم لے چلو۔ یہ نیم جان مشکیزہ بھی ساتھ باندھ لو۔"

علی اکبرؑ نے اپنے پیارے دوست، چچا اور استاد کے خون میں ڈوبا ہوا علم اٹھایا مگر بلند نہ کیا۔ میت کی طرح باپ بیٹے کاندھا دے کر خیمے میں لاتے۔ اور چوب سے ٹکا دیا۔

سب علم سے لپٹ کر ماتم کرنے لگے۔

چھوٹی بھاوج کا غم دیکھ کر زینبؑ کے اپنے آنسو خشک ہو گئے۔ بدنصیب بیوہ علم کے پھریرے میں منہ چھپائے گلے میں ابھرتی ہوئی چیخوں کو گھونٹ رہی تھی۔ ایک دن ایک پیاری سی شرمیلی لڑکی کو اپنے ہاتھوں سے دلہن بنایا تھا۔ مشک و عنبر کی خوشبو میں بسا کر صندل سے مانگ بھری تھی۔ آج زمانے نے اس مانگ میں خاک بھر دی۔ سامانِ غم سر جھکائے کھڑے ہیں۔ انہیں تن بدن کا ہوش نہیں۔ سر سے چادر گر گئی ہے۔ مگر کچھ خبر نہیں۔ انہوں نے چپ چاپ بیٹھ کر اسے چھاتی سے لگا لیا۔

"ہمارے بابا کے علم کو کس نے شہید کر دیا؟" عباسؑ کا بچہ علم پر منہ رکھے بلک رہا تھا۔

"دیکھو تو ہمارے مشکیزے کا بھی سارا لہو بہہ گیا۔" سکینہ حسرت سے آہیں بھر رہی تھیں۔ "کہاں ہیں ہمارے پیارے عمو؟ ہم ان سے ان ظالموں کی شکایت کریں گے۔ اللہ! بے زبان مشکیزہ کو بھی قتل کر دیا؟"

"بس سو جائیے نا۔ کیوں جاگ رہے ہیں۔" بیوی پوچھتی تھیں۔

"تمہیں دیکھ رہا ہوں، جی نہیں بھرتا۔" عباسؑ مسکرا کر جواب دیتے تھے۔

"وہ سب وعدے وعید جلا دیئے۔ کیا مزے سے ترائی میں جا کر سو رہے۔ یا ابو الفضل یہ پہاڑ سی اکیلی زندگی کیسے گزرے گی؟"

اے میرے ماہِ قریش یہ روح کا اندھیرا میرا دم گھونٹے دیتا ہے۔

علی اکبرؑ رسولِ خدا کے ہم شکل تھے۔ اتنی شکل ملتی تھی کہ اصحابِ رسولؐ جب اپنے پیغمبر کی یاد میں بہت بے قرار ہوتے۔ تو علی اکبرؑ کی صورت دیکھ کر دل کی پیاس

بٹھایا کرتے تھے۔ وہی متورّ چہرہ، کشادہ پیشانی، چوڑے اور اونچا قد، گو ابھی اٹھارہ [illegible] کے تھے۔ مگر چہرے پر غور و فکر کے آثار عمر سے زیادہ ظاہر کرتے تھے۔ بات چیت میں بزرگانہ ٹھہراؤ، اور ارادوں میں پختگی۔ کم سخن اور بردبار تھے۔ مگر زبان میں حلاوت اور نرمی تھی۔ جو ایک بار مل لیتا، ان کا گرویدہ ہو جاتا۔ اس کم سنی میں مطالعہ کا عالم کیا تھا کہ بڑے بڑے عالموں سے گھنٹوں تبادلۂ خیال کرتے مباحثوں میں شریک ہوتے۔ تعلی کوئی تکلف نہ محسوس کرتے تھے۔ نیکی اور پارسائی میں ضرب المثل تھے۔

مطالعہ سے جو وقت بچتا وہ سپہ گری، شہسواری اور فوجی تربیت میں صرف کرتے لاتعداد یار دوست تھے۔ قرآن اتنا ازبر یاد تھا کہ بے تکان غلطیاں درست کر دیتے تھے

ایک بار یزید کے دربار میں ذکر ہو رہا تھا کہ عربوں میں سب سے زیادہ مکمل انسان کہلانے کا مستحق کون ہے۔ تو کسی نے کہا: "علی اکبر ابن حسینؑ"۔

"وہ تو ابھی لڑکا ہے۔"

"لڑکپن میں یہ حال ہے کہ اچھے اچھے سیاست دانوں کو طاق میں بٹھا دے۔"

یزید نے انہیں بلایا، بات چیت کی۔ بہت مرعوب ہوا۔ کہا۔

"تم جیسے لائق انسانوں کی ملک کو ضرورت ہے۔ تم دمشق آجاؤ۔ جو بھی عہدہ چاہو، سنبھالو۔ تمہیں کل اختیارات ہوں گے۔"

اس میں یزید کی ایک مصلحت بھی تھی۔ وہ ایسے "خطرناک" انسان کو حسینؑ سے الگ کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ تو یقیناً ان کی صف میں شگاف پڑ جائے گا۔ مگر علی اکبرؑ نے بڑی حکمت سے ٹال دیا۔

"مجھے ابھی اپنے والدین کی سرپرستی کی ضرورت ہے۔ مجھے ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے۔"

امام بھی انہیں خاص طور پر چاہتے تھے۔ بہن بھائی بھی بہت عزیز رکھتے تھے سکینہ اور صغراؑ میں تو بھائی کے اوپر جھگڑا ہو جاتا تھا۔

"واہ جی واہ تم چچا عباسؑ کو لے چکیں، اب ہمارے بھیا پر بھی نظر ہے۔"

فاطمہ صغراؑ بگڑ تیں۔"

"اماں چچا جان بھی ہمارے ہیں اور بھیا بھی۔ سب ہمارے ہیں؟"
سکینہ ضد کرتیں۔

"نہ بھیا ہمارے ہیں نہ تمہارے، وہ تو پھپھی جان کے ہیں۔" فاطمہ کبریٰؑ دونوں کو چڑاتیں۔

اور سچ بھی علی اکبرؑ پھوپھی کے۔ اپنی اولاد سے زیادہ سمجھ کر پالا تھا۔ ذرا ان کے سر میں درد بھی ہو جاتا تو سارا گھر سر پر اٹھا لیتیں۔ علی اکبرؑ بھی انہیں ماں سے کم نہیں سمجھتے تھے۔

جب علی اکبرؑ پیدا ہوئے تو زینب ماں نہیں بنی تھیں مگر ماتا کلیجے میں اتنی بھری تھی کہ بھاوج کی گود میں سے لیا۔ ہر دم اپنے پاس رکھتیں۔ دودھ پلانے بھر کو ان کے پاس لے جاتیں، پھر لے آتیں۔

"میں تو ان کی دودھ پلائی ہوں، اماں تو زینب بی بی ہیں۔" وہ ہمیشہ ہنس کر کہا کرتیں۔ اپنے پاس ہی سلاتیں۔ خود اپنے ہاتھ سے نہلاتیں۔ دھلاتیں نئے نئے کپڑے سی کر پہناتیں۔ بال سنوارتیں، آنکھوں میں سرمہ ڈالتیں۔ پھر ان کے پیارے پیارے ہاتھ چوم کر کہتیں "نہیں بھابھی یہ تو ان کی کھلائی ہیں۔ ماں تو تم ہی ہو۔ پر بڑی دل والی ہو کہ بیٹے دے دیا ہے؟"

علی اکبرؑ ایک کھلونا تھا، زینبؑ کے دل کا بہلاوا۔ پہلی ماتا انہوں نے ان پر ہی نچھاور کی۔ ابتدائی تعلیم بھی انہیں کی زیر نگرانی ہوئی۔ ان کی شادی کا بڑا ارمان تھا ان کی نظر میں ابھی تک کوئی ان کی بہو بننے کے لائق جچی نہیں تھی۔ گھنٹوں شادی کی باتیں کر کے دل بہلایا کرتیں۔

عباس ابن علیؑ کی شہادت کے بعد امام حسینؑ کی موت کے درمیان اب صرف علی اکبرؑ باقی بچے تھے۔ باپ کی حالت دیکھ کر ان کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ ان سے کسی طرح موت کی رخصت لیں۔

امام اپنے خیمے میں سر جھکائے تنہا بیٹھے تھے۔ سب یار دوست اور اپنے پیارے بھتیجے

جا رہے تھے۔ آہستہ آہستہ خیمہ خالی ہو گیا تھا بس جانے والوں کی کچھ بھولی ہوئی نشانیاں رہ گئی تھیں۔

ہر آہٹ پر امام لرز اٹھتے تھے کہ کہیں علی اکبرؑ رن میں جانے کی اجازت لینے نہ آ گئے انجام کی خبر تھی۔ مگر ایک باپ کا دل اپنے پیارے بیٹے کی زندگی کے ایک ایک لمحے کو غنیمت سمجھتا ہے۔ جو پل بھی مل جائے۔ وہ اپنا ہے۔

جانا سب کو ہے، مگر جسے اٹھارہ برس پلکوں کی چھاؤں میں پالا اسے رزندہ کیسے غول میں تیر اور برچھیاں کھانے کو کوئی کیسے دل سے بھیجے۔ جوان بیٹے کے داغ سے تو موت کہیں زیادہ آسان ہو گی۔ ان ظالموں کو ذرہ بھر پرواہ نہیں کہ ایک مجبور باپ کا دل پہ کیا ستم ٹوٹ رہے ہیں۔ کیا وہ سب بے اولاد ہیں کسی نے کبھی اپنے بیٹے کو زانو پر نہیں بٹھایا۔ اس کے جسم میں خود اپنے وجود کو پا کر فخر نہیں محسوس کیا۔ ؟

"نہیں، یہ نہیں ہو گا۔ ہم علی اکبرؑ کو مرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ اب ہم میں اور غم سہنے کی سکت نہیں؟" امامؑ خود سے کہہ رہے تھے کہ غیب سے آواز آئی۔

حسینؑ، تمہیں ابھی بہت کچھ سہنا ہو گا۔ مرنا نسبتاً آسان ہے۔ اپنے بچوں کو ذبح ہوتے دیکھنا اور ہمت نہ ہارنا صرف ان کا حصہ ہے جنہیں خدا نے مشعل راہ بنایا ہے۔ ابھی تو کتنی کے بہت سے مرحلوں سے گزرنا ہو گا۔ تمہیں اپنا کردار ادا کرنا ہو گا۔"

جب علی اکبرؑ کچھ نادم کچھ مجبور سے سر جھکائے۔ خیمے میں داخل ہوئے تو امام کی نظر پہلے ان کے پیروں پر پڑی۔ یہ پیر کبھی کتنے ننھے ننھے تھے: ڈگمگاتے، لرزتے جب پاؤں پاؤں چلنا شروع کیا تھا۔ سانس روکے دم سے بچے کی پہلی اڑان دیکھ رہے تھے ہر قدم پر دل ساتھ چل رہا تھا۔ جیسے ان کا بیٹا نہیں وہ خود اس کے جسم میں سرایت کر کے میدان عمل میں پہلا قدم اٹھا رہے تھے۔ انسان اپنی اولاد کے وجود میں غرق ہو کر خود اپنی ہستی کو بھلا دیتا ہے۔ بانو بھی ہاتھ پھیلائے دھڑکتے دل سے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں کہ جونہی بچہ گرنے لگے جھٹ سے سنبھال لیں۔ کئی بار علی اکبرؑ ڈگمگائے۔ بانو تڑپ کر لپکیں۔ مگر امام نے اشارے سے روک دیا۔ "بچے کو پہلے قدم کی چوٹ کا احساس نہیں پہنچنا چاہیے؟"

اور جب علی اکبرؓ چار قدم چل لیے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ اب فتح اقلیم فتح کر لیا تھا۔ سارا دن پھول کی طرح دل کھلا رہا تھا۔

آج وہ قدم موت کی طرف جانے کے لیے اجازت لینے آ رہے تھے۔ امامؑ نے علی اکبرؓ کے سوال سے پہلے جواب دے دیا تھا۔

"عباسؑ کی موت نے ہمیں زندہ درگور کر دیا ہے۔ ہمارے بعد ان دکھیاروں کا بھی کوئی سہارا باقی رہنا چاہیئے۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اب ہم مقتل میں جائیں گے۔ ہمیں امید ہے کہ وہ ہمارے بعد تمہیں چھوڑ دیں گے۔"

"بابا جان میں یہ حق تلفی برداشت نہیں کر سکوں گا۔ مجھے چچا عباسؑ سے پہلے جانے کا حق تھا۔ مگر چونکہ وہ پانی لانے گئے تھے۔ اس لیے میں خاموش رہا۔ میری زندگی میں آپ کے مقتل میں جانے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ بیٹے کے سامنے باپ شہید ہو گئے۔ خدا اس سے قبل مجھے اندھا کر دے۔"

"علی ــــ ہمارا بڑھا دل بیٹھا جاتا ہے۔ ہم پر ترس کھاؤ ــ ــ ــ"

"بابا، میں دنیا میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گا۔ جعفرؓ، عثمانؓ، محمدؓ، قاسمؑ، عونؓ، میرے سامنے کے نیچے تک شہادت کا مرتبہ پائیں اور میں زندہ رہوں۔ عورتوں اور بچوں کے ساتھ پابجولاں گردن میں رسی باندھ کر شہر در شہر گھسیٹا جائے۔ یزید کے دربار میں مجھے ذلیل و خوار کیا جائے۔ کیا یہ آپ برداشت کریں گے۔ نہ میں بیمار ہوں اور نہ علی اصغرؑ کی طرح گود کا بچہ ہوں۔ میں ایسی توہین کا کسی طرح بھی سزاوار نہیں۔"

تھوڑی دیر امامؑ سر جھکائے، آنکھیں بند کیے خاموش بیٹھے رہے۔

پیار ماں باپ کو کبھی بڑی بے جا بات کہنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ "ٹھیک کہتے ہو۔ یہ شہادت اس زندگی سے بہت آسان ہو گی جو قید و بند میں گزارنا پڑے گی۔ میں تم سے جہاد کا حق نہیں چھین سکتا۔ مگر جاؤ پہلے اپنی ماں سے اجازت لے لو۔ بیٹے پر ماں کا حق باپ سے زیادہ ہوتا ہے۔"

علی اکبرؓ کے جاتے ہی امامؑ مسکرائے۔ آج ان کے بیٹے نے حکم عدولی کی جرأت کی تھی

زندگی میں پہلی بار کوئی ضد کی تو جان بچانے کے لیے نہیں، جان دینے کے لیے۔

"امی جان یہ سراسر ظلم اور زیادتی ہے۔" علی اکبرؑ نے ماں کے قدموں میں جھک کر شکایت کے لہجے میں کہا۔

"کیا بات ہے میرے لال!" بانوؑ گھبرا گئیں۔ بچپنے سے ہی علی اکبرؑ اپنی چھوٹی موٹی شکایتیں لے کر پھوپھی کے پاس بسورتے جایا کرتے تھے۔ آج ماں کو کیسے یاد کیا؟ جی میں ہزار اندیشے سر اٹھانے لگے۔

"بابا فرماتے ہیں ہم کو ظالموں کی قید میں رہنا پڑے گا۔ ہمارے گلے میں طوقِ لعنت ڈال کر گلیوں میں گھسیٹا جائے گا۔"

"خدا نہ کرے۔ تو بیٹے، یہ بھی کوئی مذاق کا موقع محل ہے۔ تمہارے بابا جان نے آج تک کبھی کسی کی حق تلفی نہیں کی۔ وہ اپنے فرزند کے لیے ایسی بات کیسے کہہ سکتے ہیں۔ بیٹا نے آج تک ان کی زبان سے کوئی غیر منصفانہ اور بے جا بات نہیں سنی۔"

"میری بدقسمتی ہے کہ آج مجھے اپنے حق سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ، امی آپ ہماری سفارش کیجیے نا۔"

"سفارش؟" بانوؑ گھبرا گئیں۔ "امام سے اور کسی کی سفارش کی ضرورت پڑے۔"

"ہمیں میدانِ جنگ میں جانے کی اجازت دلا دیجیے۔"

علی اکبرؑ نے ایسے لہجے میں ضد کی جیسے تماشہ میں جانے کی اجازت مانگ رہے ہوں۔ بانوؑ کلیجہ تھام کر رہ گئیں۔ علی اکبرؑ نے کنکھیوں سے انہیں دیکھا۔ پہلو ٹھی کے تھے پھوپھی نے پالا تھا۔ مگر ماں ان پر جان چھڑکتی تھیں۔

"قاسمؑ گئے، عونؑ و محمدؑ گئے اور غضب تو دیکھیے چچا عباسؑ گئے اور ہم منہ تکتے رہ گئے اور اب فرما رہے ہیں کہ ہم نہیں جا سکتے۔ وہ خود تشریف لے جائیں گے۔"

"یا اللہ۔"

بانوؑ بیٹے کا منہ تکنے لگیں۔ ایسا لگا کسی نے شہ رگ پر تلوار کا بھرپور ہاتھ مار دیا۔

خون بوند بوند برس رہا ہے ۔ ایک طرف سہاگ ہے دوسری طرف کوکھ ماں ؟
دونوں میں سے پہلے کسے اُجاڑیں ، کسے آگ لگائیں ۔ یہ اُن سے پوچھا جا رہا ہے ۔
اتنے میں خود امام حسین خیمہ میں تشریف لائے ۔

" تم ہی سمجھاؤ ، ہماری تو سنتے نہیں صاحب زادے ۔ یہ ہمارا فتنہ ہمارے دم سے ہے ۔ ہمارے لہو سے اُن کی پیاس بجھ جائے گی ۔ باقی لوگوں کی جان بچ جائے گی ۔ تمہیں علی اکبرؑ بہت پیارے ہیں ۔ تم انہیں ساتھ لے کر کہیں محفوظ مقام پر چلی جانا ۔ ان کی شادی کا ارمان لیے بیٹھی ہو ۔ جاؤ ہمیں بھی یاد کر لینا ۔ ہماری روح بھی تمہاری خوشی میں شریک رہے گی ۔"

بانو دم بخود کبھی بیٹے کو اور کبھی باپ کو دیکھ رہی تھیں ۔ آج یہ دونوں ہی میں کیا ٹھان کر آئے ہیں ۔ امامؑ سمجھ رہے تھے ۔

" خدا تمہیں علی اکبرؑ کی دلہن لانا نصیب کرے ۔ جب پوتا پوتی کو گود میں کھلاؤ تو ہمیں بھی یاد کر لینا ۔ ہمارے علی اکبرؑ کا بیٹا گھٹنوں چلتا جب ہماری قبر پر آئے گا ۔ تو ہم اسے چومنے کے لیے بے قرار ہو جائیں گے ۔ بس اللہ کا نام لے کر ہمیں رخصت کر دو ۔ اُدھر والے خون کے پیاسے زیادہ انتظار نہیں کر سکتے ۔ فوجی آداب کے مطابق ہر معرکے کے بعد ایک وقفہ ہوا کرتا ہے ۔ جس پر ہر سپاہی پابند ہوتا ہے ۔ مگر سپاہی نہیں قصائی ہیں ۔ ان پر انسانیت کا کوئی اصول لاگو نہیں ۔"

بانو نے زندگی میں بڑے تو کیا کبھی چھوٹے فیصلے بھی نہیں کئے تھے ۔ انہوں نے اپنے دل کے ساتھ جان بھی ان کے قدموں میں سونپ دی تھی ۔ وہ ان کی ہو گئیں تو پھر وہی ان کے برے بھلے کے ذمہ دار ہوئے ۔ مگر اچانک اس وقت قوتِ فیصلہ عود کر آئی ۔ بولیں ۔

" میں نے آپ سے آج تک اپنے کچھ نہیں مانگا ۔ آپ مل گئے ۔ تو پھر رہ بھی کیا گیا مانگنے کو ۔ آج میں اپنے بیٹے کے لیے اس کا حق جہاد مانگتی ہوں ۔"

امامؑ خاموش ان کا منہ دیکھتے رہ گئے ۔

" کیا سوچ رہے ہیں ۔ آقا ۔ اللہ کا نام لے کر اجازت دیجئے ۔ آپ ہنستے تو میری دنیا رہتی میرے ارمان سلامت رہتے اپنے بیٹے کا بیاہ کرتی ۔ پیاری سی دلہن بیاہ کر لاتی خیر سے ۔

دو دن پہلے کا چاند سا مکھڑا دیکھ کر جیتے۔ آپ نہ ہوں گے تو کیا بیاہ کیسی شادی۔ بانو بیزار اپنے آپ کے کیا خاک زندہ رہے گی۔ اور پھر ہر جوان بیٹے کا یہ فرض ہے کہ وہ باپ کی جان پر سے اپنی جان قربان کر دے۔ باپ کے پسینے کی جگہ اپنا خون بہا دے۔ علی اکبرؓ دیر سے میرے ہاتھ پیر جوڑ رہے ہیں۔ اللہ ماں کا دل نہ چھوٹا کیجیے۔ بچپن اور جوانی کے شوق نہ ہماری حیثیت تھی کہ ہم پورے کرتے اور نہ انہوں نے کبھی ضد کی، آج سرخروئی کے ارمان ہیں اپنے امام پر سے قربان ہونا چاہتے ہیں، یہ حق دار ہیں، ان کا حق دیجیے مولا۔"

"ہاں بھئی، ماں ہو۔ تم تو بیٹے کی سی ہی کہو گی۔" مگر دل میں امامؑ اپنی شریک زندگی کی ہمت کے قائل ہو گئے۔ ایک کمزور سی عورت بوقت امتحان کتنی دلیر اور باوقار ثابت ہوتی ہے

"تو بس پھر دیر نہ فرمایئے، بیٹے کا دل رکھ لیجیے۔"

"جاؤ علی اکبرؓ ہماری طرف سے اجازت ہے۔" امامؑ نے آہ سرد بھر کر کہا۔

"واللہ امی آپ جیتی رہیے۔" خوشی سے دیوانے ہو کر علی اکبرؓ ماں کے قدموں کو چومنے لگے بانو کے ہونٹوں پر زہر میں بجھی مسکراہٹ پھیل گئی۔ واہ واہ، صاحب زادے خود قتل میں قتل ہونے کو جاتے ہیں اور بوڑھی ماں کی درازیِ عمر کی منزل کے لیے دعائیں مانگ رہے ہیں؟" پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔

"جاؤ میرے چاند؟ میدان جنگ میں سادات کے خون کی مانگ دکھاؤ۔ جو تمہاری رگوں میں جوش مار رہا ہے۔ جاؤ بیٹا، میں نے تمہیں دودھ بخشا۔ میرے دودھ کی لاج رکھنا میرے چاند۔"

مگر پھر بے قابو ہو گئیں۔ مدبر اور دلیر عورت پر ماتا غالب آگئی۔ روہانسی ہو کر بولیں۔ "خیر سے واپس تو آؤ گے۔۔؟ یہ پیاری سی صورت پلٹ کے پھر تو دکھاؤ گے؟ علی اکبرؓ جاتے تو ہو مگر وعدہ کرو خیریت سے واپس آجاؤ گے۔ میرے چندا نہیں تو میا کا کلیجہ شق ہو جائیگا میں تمہارا لاشہ نہیں دیکھ سکوں گی بیٹے۔ اللہ اس سے پہلے مجھے اندھا کر دیجیو۔"

بانو سسک کر رونے لگیں۔ علی اکبرؓ کو جلدی ہو رہی تھی۔ جانے لگے تو امام نے کہا۔

"ہم دونوں سے تو جیت گئے علی اکبرؑ۔ اب تمہیں سب سے مشکل مہم سر کرنا ہوگی۔ اپنی بدنصیب پھوپھی سے اجازت لینا ہوگی۔ وہی تمہاری سب سے بڑی حق دار ہے۔ مگر ٹھنڈے دل سے بات کرنا۔ زینبؑ کے زخم ابھی تازہ ہیں۔"

"ہاں بابا! ان کی طرف سے بہت دل ڈرتا ہے۔" تیزی سے علی اکبرؑ خیمہ کا پردہ اٹھا کر نکل گئے۔ بانوؑ کے جسم سے جیسے جان نکل گئی۔ امامؑ نے اپنی بدنصیب شریک زندگی کے شانہ پر آہستہ سے ہاتھ رکھ دیا۔

"بہادر بیٹے کی بہادر ماں، تمہاری اٹھارہ برس کی محنت کا ثمر آج ملنے والا ہے علی اکبرؑ ہماری ہی نہیں، ساری انسانیت کے لیے جنگ لڑنے جا رہا ہے۔ آج وہ یہ ثابت کر دے گا کہ سچائی کتنی بھی تنہا ہو، حقیر اور بے حقیقت نہیں۔ علی اکبرؑ دنیا کے نوجوانوں کا علم بردار ہے۔ آنے والی نسلیں اس کا نام لے کر ظلم و ناانصافی کا قلعہ قمع کریں گی۔ خدا حافظ کرے۔ آج غرور سے میرا سینہ پھٹا جاتا ہے کہ میں علی اکبرؑ کا باپ ہوں۔"

مگر بانوؑ امامؑ کے ہاتھوں میں بے ہوش ہو چکی تھیں۔

وہ جو کبھی حرانی میں جی کے بہلانے کا کھلونا تھا۔ آج قسمت کے بھیانک ترین کھیل میں ایک بلند اور شاندار کردار کرنے جا رہا تھا۔ اپنے مظلوم بچوں کی شہادت کے بعد نگاہیں بار بار علی اکبرؑ کی طرف اٹھ جاتیں۔ زینبؑ جانتی تھیں۔ کوئی دم میں ان کا بھی بلاوا آنے والا تھا۔ اپنے خیمے میں سہمی ہوئی اسی جگہ بیٹھی تھیں جہاں تھوڑی دیر پہلے بچوں کے لاشے رکھے گئے تھے۔ علی اکبرؑ خیمے میں داخل ہوئے تو اسجان سی بن گئیں۔ سمجھ گئیں۔ رخصت ہونے آئے ہیں۔ منہ پھیر کے بیٹھ گئیں جیسے ان بہانوں سے وہ موت کو ٹال ہی تو دیں گی۔ ایک ایک لمحہ غنیمت ہے۔ جب تک سانس ہے۔ تب تک آس نہیں ٹوٹتی۔

علی اکبرؑ نے منہ سے کچھ نہ کہا۔ قریب آئے اور پھوپھی کے زانو پہ سر رکھ دیا۔ بچپن میں کھیل کود کر تھکے ہارے آتے تھے۔ تو اسی طرح چپ چاپ ان کی گود میں سر رکھ کر سو جایا کرتے تھے۔ ان کی پیار بھری ڈانٹ کانوں میں میٹھی لوری بن کر گھل جاتی تھی۔

مگر آج وہ زانو پر سونے نہیں آئے تھے۔

جی تو چاہا بھتیجے کو کلیجے سے لگا کر خوب چیخ چیخ کر روئیں کہ جی کی بھڑاس نکل جائے اس سے کہیں۔

"چل میرے لال ہم دونوں کہیں بھاگ چلیں اس جہنم سے دور کسی حسین ہری بھری وادی میں۔ گاتے گنگناتے چشموں کے دیس میں ایک ننھی سی جھونپڑی ہو، وہاں تیری چاند سی دلہن بیاہ کر لاؤں گی پھر ننھے منے پھولوں سے بھر جائے گا۔ بس وہیں اس دکھیاری زینبؑ کی چھوٹی سی جنت بس جائے گی۔"

پھر یاد آیا کہ یہ سب عورتوں کے بہانے خواب ہیں مگر شیرِ خدا کی دلیر بیٹی تو یہ خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی۔ امامؑ نے جو عہد کیا ہے وہ زینبؑ کا ایمان ہے۔ رسولِ خداؐ کے نواسے اور علیؑ ابن ابی طالب کے فرزند نے جس راہ پہ قدم اٹھایا ہے، وہی ماں زینبؑ کی ہے۔ انہیں اس بات پر غرور تھا کہ وہ ایسے بھائی کی بہن ہیں۔ جو ظلم و نا انصافی کے خلاف سینہ سپر ہے۔ انھوں نے معنی خیز رکھائی سے کہا۔

"یہ دکھاوے کا پیار ہے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ اے بھئی میں تمہاری ہوں کون؟ بھلے نو مہینے پیٹ میں تو نہیں رکھا۔ پر پیدا ہوتے ہی کلیجے سے لگایا۔ راتوں کو جاگی ہوں۔ تم میری گود میں سوئے ہو۔ تو اسی خوشی میں میری نیندیں اچاٹ ہو گئی ہیں۔ پہلا دانت نکلا تھا تو تمہارے ہر آنسو پر ہزار آنسو بہائے تھے میں نے۔"

"میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ اللہ نے مجھے دو مائیں بخشیں" علی اکبرؑ نے مسکرا کر آنسو پی لئے۔ "اس مقدس گود میں میں نے دنیا جہان کی نعمتیں پائی ہیں۔ قرآن کی آیات حفظ کی ہیں۔ علم و دانش کی ابتدا اسی آغوش میں ہوئی۔ اب اس پیار بھری گود سے رخصت ہونے آیا ہوں کہ جو کچھ سیکھا ہے۔ اس کا امتحان دے کر کامیابی حاصل کروں یہ میری بد نصیبی ہے کہ اپنی ماں پھوپھی جو کچھ بھی ہیں۔ آپ کی کوئی خدمت بھی نہ کر سکا۔ پھوپھی اماں دنیا میں ہر چیز کا بدلہ ہے۔ مگر ممتا کی قیمت تو جان دے کر بھی نہیں چکائی جا سکتی۔"

"تم جوان ہو گئے؛ ایک مثالی انسان بن گئے۔ بس میری مزدوری مجھے مل گئی

خوش نصیب ہے وہ عورت جسے تم جیسے بیٹے کی پرورش کی سعادت نصیب ہوئی۔ مجھ انہیں پیار کر کے میں نے اپنی زندگی کا مزہ پالیا۔"

آخر جب علی اکبرؓ رخصت ہونے لگے۔ تو بولیں۔

"اے لڑکے یوں میلے کچیلے لباس میں جائے گا۔ تمہاری امی جان کہاں ہیں ذرا بلاؤ تو آ کے بیٹے کو آراستہ کریں۔" بانو آئیں تو علی اکبرؓ کے لیے جو شادی کا جوڑا لائی تھیں۔ نکال کر دیا۔

"لو بانو اللہ کا نام لے کر پہنا دو۔"

"تم خود پہنا دو بہن۔"

"نہیں بانو! مجھے وہم آتا ہے۔ میرے ہاتھوں پر میرے بیٹوں کا خون ہے۔"

"ان جانبازوں کا خون میرے لیے برکت کا باعث ہو گا۔"

"میرا جی ڈرتا ہے، بدشگونی ہو جائے گی۔"

"میں تو آپ ہی کے ہاتھ سے لباس پہنوں گا۔ نہیں تو انہیں میلے کپڑوں میں چلا جاؤں گا۔"

علی اکبرؓ بضد ہو گئے۔

ماں اور پھوپھی نے شاہانہ جوڑا پہنایا۔ جوں ہی ان کے جانے کی خبر دوسرے خیموں میں پہنچی سب بھاگے ہوئے آئے۔ اور چاروں طرف سے گھیر لیا۔ جیسے علی اکبرؓ کو واقعی دولہا بنایا جا رہا تھا۔ امامؓ نے اپنے ہاتھ سے تمام ہتھیار سجائے۔ سر پر خود رکھا۔ امیر المومنین کا چرمی کمر بند کس کر باندھا۔ علی اکبرؓ ایک ایک سے گلے ملے۔ بچوں کو پیار کیا۔ سکینہ اگر پیروں سے لپٹ گئیں۔

"بھائی آپ پانی لینے تو نہیں جا رہے ہیں؟ للہ نہ جائیے گا۔ دریا بڑا بے مروت ہے۔ اس کے پاس جو جاتا ہے۔ واپس نہیں آتا۔ چچا جان گئے۔ بس وہیں کے ہو رہے ہمیں بھول گئے۔"

امامؓ نے عقاب نامی گھوڑے پر بیٹے کو سوار کرانے کے لیے جب اُن کے پیر کو سہارا دیا تو علی اکبرؓ جھجک کر پیچھے ہٹ گئے۔

"آپ کے دستِ مبارک پر پیر رکھوں، یہ گستاخی میں نہیں کر سکتا۔"

"ہم امام نہیں، اس وقت صرف تمہارے بابا ہیں۔ بچپن میں ہم ان پیروں کے بوسے لیا کرتے تھے۔ آنکھوں سے لگاتے تھے۔ تم اپنے ننھے ننھے پیروں سے ہماری چھاتی پر چڑھ کر کودا کرتے تھے۔ تو ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم دنیا کے عظیم ترین انسان ہیں۔ ہم تمہیں حکم دیتا ہوں کہ میرے ہاتھ پر پیر رکھ کر سوار ہو جاؤ۔"

علی اکبرؓ نے جھک کر پہلے امام کے قدموں کو بوسہ دیا۔ پھر امام نے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں جوڑ کر علی اکبرؓ کا پیر تھاما اور سوار کر دیا۔ پھر رکاب پکڑ کر تھوڑی دور ساتھ چلے۔

"تمہاری رکاب داری کی عزت حاصل کر کے ہم فخر محسوس کر رہے ہیں۔ تم کو شہادت میں ہم پر سبقت حاصل ہو گی۔"

علی اکبرؓ میدانِ جنگ کی طرف بڑھے۔ امامؑ نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"اے پروردگار گواہ رہیو تیرے پیغمبرؐ کا ہم شکل تیری راہ میں قربان کرتا ہوں۔ جب مجھے رسول اللہ کی یاد ستاتی تھی تو میں اس بچے کی صورت دیکھ لیا کرتا تھا۔"

دشمن کی فوج میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔

"بھائی بھتیجے سب ہی تو کام آگئے اب کون ہے جو ہمارے مقابلے پر آئے گا؟"

صبح سے کیسے کیسے جانباز ختم کئے تھے۔ ضمیر کند ہو چکے تھے۔ دلوں میں زہر بھرا ہوا تھا۔ احساس مر چکا تھا۔

پھر بھی پیغمبرِ خداؐ کے نام کی دلوں میں دہشت بیٹھی ہوئی تھی اسے یک لخت دل سے نکال دینا ان کے بس کی بات نہ تھی فوج میں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ ہر قتل کے بعد احساسِ شکست بڑھ جاتا تھا۔ کبھی عاقبت کے خیال سے لرزہ طاری ہو جاتا۔ پھر موت کا خوف ہر جذبہ کو کچل کر غالب آ جاتا۔ سوچنے سمجھنے کی طاقت سلب ہوتی جا رہی تھی۔

عربی نسل کا گھوڑا "عقاب" اپنے وجیہ و نوعمر شہسوار کے زانو تلے مستانہ چال سے ٹھمک ٹھمک کر چل رہا تھا۔ ان کے بانکپن پہ نازاں ہلکے ہلکے قدم رکھتا۔ گردن کو ناز

انداز سے ختم کیے۔ تکلف سے عیاں جھجکتا یوں چلا آرہا تھا۔ جیسے وہ انہیں موت کی جانب نہیں کسی محبوبۂ دل نواز کی گلیوں میں لیے جا رہا تھا۔

علی اکبرؑ کی والدہ اُم لیلا ابوسفیان کی نواسی تھیں۔ اور یزید کی پھوپھی زاد بہن۔ ابن شمر ان کے لیے امان نامہ لائے تھے۔ انھوں نے وہ کاغذ چاک کر کے ہوا میں اڑا دیا۔

" یہ امان نامہ میرے لیے نہیں اس رشتہ کے لیے ہے جو تمہارے بادشاہ اور میری والدہ کے درمیان ہے۔ میں اس رشتہ کو اپنی بدنصیبی سمجھتا ہوں اور منقطع کرتا ہوں۔" علی اکبر نے رجز شروع کیا۔

" لوگ کہتے ہیں میں پیغمبر خداؐ کا ہم شکل ہوں۔ میں اس آفتاب عالم تاب کی ایک ادنیٰ سی کرن ہوں۔ جس نے تاریکی اور جہالت کا پردہ چاک کر کے انسانیت کو روشنی اور فلاح کا راستہ دکھایا۔ اے ناعاقبت اندیش دیوانو! مجھے پہچانو کہ میں کون ہوں۔ میں علی ہوں امام حسینؑ ابن علیؑ کا فرزند اور آج یہ ثابت کرنے آیا ہوں کہ میرے امام کے قدموں کی خاک کا ذرہ ذرہ، آخری دم تک ظلم و ستم اور ناانصافی کا مقابلہ کرتا رہے گا۔ کوئی دھمکی ہمیں ڈرا نہیں سکتی۔ دولت و جاہ کی لالچ ہمارے عزم کو ہلا نہیں سکتی۔ تم مجھے جان کی امان دے رہے ہو۔ احمقو! پہلے میری تلوار سے پناہ مانگو۔"

پیغمبر خدا کے ذکر پر فوجی بے ساختہ درود بھیجنے لگے۔ عقیدت۔ عقیدت سے سر جھک گئے۔ آنکھیں نیچی ہو گئیں۔ تھوڑی دیر کے لیے دلوں سے کدورت مٹ گئی غم و غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ علیؑ ابن ابی طالب کے نام پر نعرۂ حیدری سے زمین و آسمان کانپنے لگے۔ علم سرنگوں ہو گئے۔ شمر ذی الجوشن فوجی کی یہ "درگت" دیکھ کر تلخی سے مسکرایا اور ابن سعد سے کہا۔

"سبحان اللہ، کیا تربیت دی ہے۔ تم نے اپنی فوج کو، دشمن کی جان لینے کے بجائے۔ ان پر جان قربان کرنے پر تیار ہے۔"

" معاف کرنا برادر یہ میری فوج نہیں یہ جوگیر کی بھرتی ہے۔ خدا جانے کہاں کہاں سے اُجڈ گنوار لا کر بھرتی کر دیئے ہیں۔ ٹھیک سے نہ احکام ان کی سمجھ میں آتے ہیں نہ ان میں عمل کی اہلیت ہے۔ ان کا قصور بھی نہیں انہیں تو یہ کہہ کر بھیجا گیا ہے کہ دشمنانِ

اسلام کی سرگرمی پر جاتے ہیں۔ چار باتیں سنتے ہیں۔ آگا ہی پیچھا نہیں دیکھتے ضعیف الاعتقاد ہیں
ایمان لے آتے ہیں۔"

"تم ہمارے کمان دار کی حکمت عملی کو نہیں سمجھتے۔ ہر شہر اور صوبے کا سپاہی یہاں بھیجا گیا ہے تاکہ گروہ بندی کا امکان کم ہو جائے۔ دیکھتے نہیں ان میں آپس میں خود کتنے اختلاف ہیں۔ اور پھر انہیں مکہ و مدینہ کے باشندوں سے قلبی کوئی لگاؤ نہیں۔ تمہاری رائے میں یہاں متقی پرہیزگار اور عالم فاضل بھیجے جاتے جو ہمارے دشمنوں کے ہمارا ہی صفایا کر دیتے یہ تو نیم حیوان احمق ہیں۔ جو حرب بے خالفین ان کے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ وہ انہیں جھنجوڑ کر ان کے ضمیر کو جگا دیتے ہیں۔ جیسے پانی میں پتھر گرتا ہے۔ تو لہریں اٹھتی ہیں۔ ان لہروں پر قابو پائے رکھنا ہی سپہ گری ہے۔ یہ جنگ ایرے غیرے کے بس کی نہیں۔ ایک صوبے کی فوج کو سنبھالنا اور بات ہے۔ لعنت تمہارے اس خوگیر کی بھرتی کی لگام میں قابو میں رکھنا ٹیڑھی"

شمر ذی الجوشن ہر موقع پر ابن سعد کی ٹانگیں کھینچنے کی تاک میں رہتا تھا۔ بات بات میں اس کی رگ دبانے میں اسے لطف آتا تھا۔ قدم قدم پر اس کی نااہلی ثابت کرکے بڑی مسرت حاصل ہوتی تھی۔ اس پر نظر رکھنے کے لیے ہی تعینات ہوا تھا۔ اس کا ایک لفظ ابن سعد کے پورے خاندان کو تہس نہس کر سکتا تھا۔ غریب کی جان عذاب میں تھی۔

شمر ذی الجوشن کا اپنا ایک فولادی دستہ تھا۔ جسے وہ بڑی ہوشیاری سے استعمال میں لاتا تھا۔ اس میں چن چن کر ایسے پہلوان بھرتی کیے گئے تھے۔ جنہیں بڑے امتحانوں کے بعد منتخب کیا تھا۔ وہ ان قبیلوں میں سے تھے جنہیں بڑی بے دردی سے کچلا گیا تھا ان کی اقتصادی اور جمہوری طاقتوں میں سے تھے۔ جنہیں بڑی بے دردی سے مسمار کیا گیا تھا وہ غصے اور نفرت میں نیم پاگل ہو چکے تھے۔ صرف توڑ پھوڑ اور خون خرابے میں ان کے ذہنوں کو لذت ملتی تھی انہیں بھر طرح سے نوازا گیا تھا۔ انہیں خاص راتب اور شراب ملتی تھی۔ یہ اس فوج کا سب سے زبردست دستہ تھا۔ جسے عوام کو کچلنے کے لیے بیس برس سے تیار کیا جا رہا تھا۔ ہر معرکہ سر کر لینے کے بعد انہیں نقد اور تحریری مراعات عطا کی جاتی تھیں۔ غرور یا حمق کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے آپ کو عام فوجیوں سے افضل اور برتر خیال کرتے تھے۔ اور انہیں یقین تھا کہ وہ خلافت اور دین اسلام

واحد امین اور محافظ ہیں۔

ان کا کام یہ تھا کہ جسے اپنے فرائض سے غفلت برتتے دیکھیں اسے ایسی سخت سزا دیں کہ دنیا عبرت حاصل کرے۔ حکم عدولی اور نافرمانی کا الزام لگا کر اکثر دوسروں پر دہشت بٹھانے کے لیے چند اشخاص کو اس بے دردی سے قتل کیا جاتا کہ دیکھنے والے اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتے یہ خود حملہ نہیں کرتے تھے۔

یہ جبر حملہ میں حصہ لینے والے قتل کرکے خود روتے پیٹتے دہشت زدہ ہو کر بھاگ کھڑے ہوتے۔ ان پر ان کی سرزنش کرنے کے بجائے شاباشی ملتی اور سستانے کے لیے محفوظ پچھلی صفوں میں پہنچا دیئے جاتے جہاں انہیں نقد اور تحریری انعامات بانٹے جاتے' ایک خاص درجہ عطا کیا جاتا اور وہ اپنی کارکردگی کے غرور میں مست فولادی دستے کے قدم بہ قدم چلنے کے خواب دیکھنے لگتے۔

دنیا کی لذتیں عقبا کے وعدوں سے زیادہ پرکشش اور عام جاہل انسان کا دل لبھانے والی ہوتی ہیں۔ اتنے قتل کرنے کے بعد عام سپاہی پر ایک عجیب بے حسی اور ڈھٹائی سی طاری ہو جاتی ہے۔ انہیں دیکھ کر بجائے مدد کرنے اپنی جان بچانے کی فکر کرتا ہے۔ امام کے جانباز سر سے کفن باندھ کر میدانِ جنگ میں اترتے تھے۔ ذہنی اور جسمانی حیثیت سے بھی اس کرائے کے لشکر سے بہت بلند اور افضل تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کا ایک بچہ بھی قطاروں کی قطاریں صاف کر دیتا۔

"کوئی ہے تم میں سے ماں کا جایا جو میرے سامنے آکر مقابلے کی جرأت رکھتا ہو؟" علی اکبرؓ نے للکارا۔

پہلے دو چار نے بانکی دکھائی۔ گئے اور پانی کے بلبلے کی طرح ختم ہو گئے۔ گرجتے گرجتے آتے اور خالی ڈھول کی طرح پھٹ جاتے۔

"اب جرأت آزمائی کے بغیر کھیل کا موقع نہیں۔ سورج زوال پر آ گیا۔ اگر یوں ایک ایک کا مقابلہ ہوتا رہا۔ تو رات ہو جائے گی۔ میں جانتا ہوں علی اکبرؓ کو۔" شمر نے ابن سعد سے کہا۔

"بڑا سجیلا جوان ہے بدبخت!" ابن سعد کو پسینے آنے لگے۔

"بس اس کے بعد تو ہمیں ٹوٹ جائیں گے۔"

"کیا کاٹ ہے ظالم کی! ہاتھ میں تلوار ہے یا واہمہ، نظر ہی نہیں آتی۔" ابن سعد مسحور ہو گیا۔

"اچھا تعریفیں بعد میں جی بھر کے کر لینا، اب حکم دو۔"

"کیا حکم دوں؟"

"چاروں طرف سے یکبارگی گھیر لیا جائے۔"

"نظر کی گرفت میں تو آنا مشکل ہو گیا۔"

شمر غصے سے انگارہ ہو گیا۔

"کیا حر کی پیروی کرنے کا ارادہ ہے؟"

ابن سعد نے چونک کر شمر کے تیور دیکھے۔ اس کے پیچھے اس کے فولادی دستے کی آن بان دیکھی اور یورش کا حکم صادر کر دیا۔

علی اکبرؑ اس چو طرفہ حملے کے لیے بھی تیار تھے۔ صبح سے کتنے قتل دیکھے تھے فن سپہ گری کی تعلیم بھی اس انداز کی ملی تھی کہ جب بزدل سارے فوجی اصول توڑ کر اکیلے پر حملہ کریں تو انھیں کس طرح چکمہ دے کر اپنا بچاؤ کیا جائے۔ علی اکبرؑ نے اس فن میں مہارت پیدا کرنے کے بعد خود استادی کے فرائض انجام دیے تھے۔ وہ انہیں طرح طرح سے اپنے تعاقب پر راغب کرتے۔ اور جب وہ سرپٹ دوڑتے ہوئے آتے تو یہ نہایت پھرتی سے کاوا کاٹ کے ایک طرف ہو جاتے۔ سپاہی دندناتے ان سے آگے نکل جاتے۔ یہ پیچھے سے ان پر حملہ کر کے ان کا صفایا کر دیتے۔

جب سے ہوش سنبھالا تھا۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرا تھا کہ ہاتھ میں تلوار نہ اٹھائی ہو۔ اس دن کی آمد کی خبر بچپن ہی سے مل گئی تھی۔ بچپن اور نوجوانی کا یہ مختصر عرصہ اسی دن کو خوش آمدید کہنے میں گزرا تھا۔ اور جب بچے گلی کوچوں میں کھیلتے ادھر ادھر چلے جاتے، امامؑ کے خاندان کے بچے سلیقے کے آموختہ میں مصروف رہتے۔ جس عمر میں نوخیز لڑکے صنف نازک کی جستجو میں

تاک جہاں تک کی لشکر میں لگ جاتے۔ بے مروت سے ٹکر لینے کی لشکر میں کھوئے رہتے تھے ان کے مقابلہ میں دشمن بھلا کیا خاک ٹک سکتے۔

ان کا گھوڑا ساتھ پل بڑھ کر جوان ہوا تھا۔ بالکل برادرانہ رشتہ اور دوستی تھی جب سوار ہوتے تھے۔ تو ان کے جسم کا ایک حصہ بن جاتا تھا۔ اگر وہ کچھ سوچتے تو گھوڑا بھانپ لیتا۔ ادھر سپاہیوں تلے ششم گشتم خریدے ہوئے یا لوٹ کے گھوڑے تھے اور اپنے سوار کی طرح بدحواس اور بوکھلائے ہوئے تھے۔ بے کہے سنے جدھر منہ اٹھا دوڑنے لگتے جب جی چاہتا سوار کے گرنے کی پرواہ نہ کرتے ایک دم رک جاتے۔ سوار اوندھے منہ گرتا اسے کچلتے بھاگ جاتے۔ ذرا دم لینے کے لیے علی اکبرؑ نے گھوڑا گھمایا اور تیزی سے امامؑ کے پاس جا کر ان کی تحسین کا شکریہ ادا کرنے لگے۔

"بڑی پیاس ہے بابا۔"

"جانتا ہوں بیٹا، مگر مجبور ہے تیرا بابا۔" امامؑ نے رو کر بیٹے کو چھاتی سے لگا لیا۔ دونوں ہتھیلیوں میں علی اکبرؑ کا چہرہ لے کر بے اختیار بوسے لیے۔ پیشانی، خون بار آنکھیں اور خشک لب۔ جیسے بچپن میں جب بابا کسی کام میں لگے ہوتے اور علی اکبرؑ بھوک سے بیتاب ہو کر رونے لگتے تو انہیں بہلانے کو امامؑ اپنی زبان کی نوک ان کے منہ میں دے دیا کرتے تھے۔ اس وقت بھی نہ جانے کیا خیال آیا زبان کی نوک ان کے منہ میں دے دی۔

"آہ بابا، آپ کی زبان میں تو کانٹے ہیں۔" علی اکبرؑ نے ہنس کر کہا۔

"بس بابا میری پیاس بجھ گئی؟"

امامؑ نے رسول اللہؐ کی مقدس انگوٹھی اتار کر ان کے منہ میں ڈال دی۔

"اس کی برکت سے تمہاری پیاس بجھ جائے گی۔"

سرور سے علی اکبرؑ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ نانا کی انگوٹھی منہ میں رکھتے ہی پیاس کی شدت غائب ہو گئی۔ روح سیراب ہو گئی۔ چہرے پر رونق آ گئی۔ دوبارہ میدان جنگ میں جا کر علی اکبرؑ نے ایسے زبردست حملے کیے کہ دشمنوں کی صفیں سرنگوں ہو گئیں۔

علی اکبرؑ کا گھوڑا اس جنگ کی اہمیت کو سمجھ رہا تھا۔ اس کا بھی دشمن کے گھوڑوں سے

ٹھنی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر گھوڑے بدکنے لگتے، الف ہو جاتے۔ اگلے پیروں پر کھڑے ہو کر دولتیاں جھاڑنے لگتے۔ کوئی اس کی زد میں آ جاتا تو اس بری طرح بپھر کر حملہ کرتا کہ ٹاپوں سے سوار اور سواری دونوں کا کچلا بنا دیتا۔ بزدل سوار کے ساتھ گھوڑے پر بھی بچھوے وار کر رہے تھے۔ وہ بڑھ چڑھ کے انہیں ترکی بہ ترکی جواب دے رہا تھا۔ دونوں ہی ایک دوسرے کے خون میں نہائے ہوئے تھے۔

اب علی اکبرؓ کی طاقت خون بہہ جانے کی وجہ سے جواب دیتی جا رہی تھی۔ بار بار آنکھوں تلے اندھیرا چھا رہا تھا۔ تلوار ہاتھ سے چھوٹی جاتی تھی۔

اب سوائے چکمہ دینے کے کوئی راستہ علی اکبرؓ کو زیر کرنے کا نہیں رہ گیا تھا عرب قوم سخت اصولوں کی پابند ہوتی ہے۔ اوچھے وار مردانگی کے خلاف ہیں۔ مگر اس وقت وہ کوئی قوم یا کسی ملک کے افراد نہیں تھے۔ جنونی درندے ہو چکے تھے۔ ابن سعد نے حکم دیا کہ ایک دستہ فوج سے الگ ہو کر امام کے خیموں پر حملہ کر دے۔

علی اکبرؓ اس چال سے بھی بے خبر نہ تھے۔ وہ خود منتظر تھے کہ کب دشمن آخری گرا ہوا حربہ استعمال کریگا۔ اکیلے امام اور چند غلاموں میں خیموں پر حملہ کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں باقی۔ یہ جنگ امام کی جان کے لیے ہے ان کے جیتے جی امام پر آنچ نہ آنے گی۔

دشمن کی بزدلانہ حکمت عملی کارگر ثابت ہوئی۔ علی اکبرؓ نے پلٹ کر خیموں پر حملہ کرنے والے دستے کا راستہ کاٹا تو آگے اور پیچھے سے گھر گئے۔

ایک گھمسان تلواروں، برچھیوں اور نیزوں کی انی اور شبیہ محمدؐ خاک اور خون میں غلطاں ہو گیا۔

علی اکبرؓ کے گھوڑے کو خالی پشت خیمے کی طرف آتے دیکھ کر امام حسینؓ کے جسم سے جان نکل گئی چکرا کر بیٹھ گئے۔ پھر خیمے سے نکلے اور علی اکبرؓ کو پکارتے ہوئے میدان کی طرف چلے ضعف اور پیاس سے چکرا کر کئی بار گرے۔ اٹھنا دشوار تھا۔ مگر تڑپ کر اٹھے۔

"علی اکبرؓ کہاں ہو بیٹے؟

بچپن میں ایک دن علی اکبرؓ یکایک غائب ہو گئے۔ سارے میں ڈھونڈا۔ گلیوں میں آدمی دوڑائے۔ عباسؓ مسجد میں دیکھ آئے۔ کہیں پتہ نہ چلا۔ ظالم طرح طرح سے ستاتے ہیں اسی لیے ہر دم دل کو دھڑکا لگا رہتا تھا۔ کہیں کوئی بچہ کو تو نہیں لے گیا۔ امام کے خاندان کے سروں کی بڑی بھاری قیمتیں ملتی تھیں۔

غل سن کر امام گھبرائے ہوئے اپنے حجرے سے نکلے۔

"کون کھو گیا؟" روتی ہوئی بانو سے پوچھا۔

"میرا لال' علی اکبرؓ۔"

"کہیں ادھر کھیل رہا ہو گا۔"

"کہیں نہیں' سب جگہ دیکھ مارا' ہائے میرا دل ہول رہا ہے۔"

تب امام خود بیٹے کی تلاش میں اٹھے۔

"علی اکبرؓ کہاں ہو بیٹے؟"

اور علی اکبرؓ اپنی پھوپی کی چادر میں سے نکل کر بھاگتے ہوئے آ کر بابا سے لپٹ گئے تھے۔

بے چاری کو تو پتہ بھی نہیں پڑی غافل سو رہی تھیں۔ مگر آج علی اکبرؓ ان کی چادر میں جا کر نہیں چھپے تھے کیونکہ وہ ننگے سر خیمہ کے دروازے سے لگی کانپ رہی تھیں۔ امامؓ لڑکھڑاتے بڑھتے جا رہے تھے

"ہم سے اب ایک قدم نہیں چلا جاتا۔ نہیں ہمارا دو بیٹے۔ جلدی ہاتھ تھام لو بیٹے اپنے بوڑھے بابا پر رحم کرو۔ اچھا سہارا نہیں دیتے تو ایک بار پکار تو لو کہ جان میں جان آئے' ہماری سانسوں میں ریت بھر گئی ہے۔ سینہ پھٹا جاتا ہے۔ دم نہیں سماتا' اس ضعیفی میں چھوڑنے کا خیال بھی نہ کرنا۔ ہم زندہ درگور ہو جائیں گے۔"

امام کو آتے دیکھ کر بزدل روتے پیٹتے' ایک دوسرے کو کاٹتے بھاگے۔ نہتے امام ٹھوکر کھاتے ہوئے بیٹے تک پہنچے۔ علی اکبرؓ خاک اور خون میں لتھڑے ایڑیاں رگڑ رہے تھے سینے کے گھاؤ سے تازہ تازہ خون ابل رہا تھا۔

علی اکبرؓ نے باپ کی آواز سن کر خون بار آنکھیں کھول لیں۔ جلدی سے برچھی کا زخم چھپانے کے لیے کلیجے پر ہاتھ رکھ لیا کہ بابا نے دیکھ لیا تو بے حال ہو جائیں گے۔

"ہم سے اپنے زخم چھپاتے ہو علی اکبرؑ، تمہارا ہر زخم ہماری روح کی گہرائیوں میں اُتر رہا ہے۔"

امام نے بیٹے کو بانہوں میں سمیٹ کر کلیجے سے لگالیا۔ اور اس کے جوان خون میں خود نہا گئے۔

"بابا اب تو بالکل پیاس نہیں، ریت بھی آگ کی طرح نہیں جلتی، کیا سورج چھپ گیا ہے؟"

علی اکبرؑ نے چاروں طرف نظر گھمائی۔ جیسے کسی کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ کوئی لینے آیا ہے۔ امام نے دیکھا علی اکبرؑ کے ہاتھ پیر یخ ہوتے جا رہے ہیں۔

"صغرا سے کہہ دیجئے گا۔ ہم بڑے شرمندہ ہیں۔ اپنا وعدہ وفا نہ کر سکے۔ اس کا نیگ دینے کی مہلت نہ ملی۔"

بیٹے نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند لیں۔ باپ کی جان نکل گئی۔ تھوڑی دیر سکتے میں بیٹھے ان کا پرسکون مسکراتا ہوا چہرہ تکتے رہے۔ پھر منہ پر منہ رکھ کر کہنے لگے۔

"تم بھی ہمیں چھوڑ گئے علی اکبرؑ۔ ہمیں کون کندھا دے گا۔ کون قبر میں اتارے گا۔ کیا ہماری لاش اٹھانے کوئی نہ آئے گا۔ بیٹے یہ ناانصافی ہے۔

ہمارا وقت تھا ہمیں مرنا تھا۔ تمہیں زندگی کی بہاروں سے کھیلنا تھا۔ دنیا میں بہت کچھ کرنا تھا۔ حیف میں نے تمہیں کیا دیا؟ اپنے دکھ اپنی فکریں، پھر رسوائیاں اور ذلتیں تمہیں ورثہ میں دیں۔ سجاد بیمار ہیں۔ دوا دارو تو درکنار ہم ان کا حلق بھی تر نہیں کر سکتے۔ علی اصغر بھی کوئی دم کے مہمان ہیں۔ ہمارا نام و نشان مٹ جائے گا۔ کوئی نام لیوا بھی نہ رہے گا۔ اب خیمہ میں کس منہ سے جاؤں علی اکبرؑ۔ تمہاری ماں سے کیا کہوں؟"

سب کے لاشے امام اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر خیمہ میں آخری دیدار کے لیے لائے تھے۔ مگر علی اکبرؑ کو اٹھانے کے لیے جھکے تو ایسا معلوم ہوا ہاتھ پیروں کا دم نکل چکا ہے۔ صدیوں کا بڑھاپا ٹوٹ پڑا ہے۔ چہرے پر جھریاں پڑ گئیں۔ بال ایک دم سفید ہو گئے۔ کمر دوہری ہو گئی۔

غلاموں کی مدد سے امام نوجوان بیٹے کا لاشہ خیمے میں لائے تو کسی میں رونے کی طاقت بھی نہ رہی تھی۔ غش پر غش آ رہے تھے۔

۵ تا ۷

پیاسا پھول

بانو کا دودھ پیتا علی اصغرؑ ساتویں تاریخ سے پیاسا ہے۔ بچے کی ٹھوڑی جیسے جھٹکیاں لگا کر ماں بھری جاتی ہیں۔ دودھ خشک ہو چکا ہے۔ پانی کی ایک بوند میسر نہیں۔ کوئی صورت بچے کی جینے کی نظر نہیں آتی۔ گھبرائی گھبرائی ادھر سے ادھر جاتی ہیں۔ پھر بچے پر جھک جاتی ہیں۔ کبھی کلیجہ تھام لیتی ہیں۔ کبھی بے بسی سے ہاتھ ملتی ہیں۔

ابوالفضل عباسؑ نے دو جگہ کنواں کھودنے کی کوشش کی۔ سب بوڑھے بچے جٹ گئے ہاتھ لہولہان ہو گئے۔ مگر آلِ رسولؐ کے نصیب کا پانی نہ نکلا۔ اب تو آنکھوں سے آنسو بھی نکلنے سے پہلے خشک ہو جاتے ہیں۔

بانو ایک ایک کا منہ تک رہی ہیں۔ کسی میں ان سے آنکھ ملانے کی ہمت نہیں۔ بانو بار بار ہاتھ اٹھا کر دعائیں مانگتی ہیں۔

"اے چشمۂ کوثر کے والی میرا ننھا پیاس سے دم توڑ رہا ہے۔ یا اللہ میں کیا کروں کدھر جاؤں؟ اللہ اب زخم پر زخم کھانے کی اس کلیجے میں سکت نہیں۔ ابھی علی اکبرؑ کی جوان موت کا داغ ہرا ہو رہا ہے۔ اب یہ تازہ زخم کھانے کے لیے کلیجہ میں جگہ بھی تو نہیں۔ دل پانی پانی ہو چکا ہے۔ یا میرے پروردگار، رحم کر اس ننھی سی جان پر۔ اے بہن زینبؑ بی بی ذرا دیکھو تو کیسا بے سدھ پڑا ہے۔ نہ روتا ہے نہ ہمکتا ہے۔ بس پچھلے پہر گھڑی بھر کو آنکھ کھولی تھی۔ تب سے بیہوش پڑا ہے۔ ہائے میرے بچے کے کان کی لویں مرجھا گئیں، سانس اوپر نیچے ہونے لگی۔ بس اب کوئی دم میں میری آنکھوں کا نور بجھنے والا ہے؟"

"دل پر قابو رکھو بانو، میری شہزادی۔" زینبؑ بھاوج کو سمجھاتی ہیں۔

"ہائے کیا کروں کلیجے کو جیسے کوئی کچلے ڈالتا ہے۔ اللہ جی میں کیسے کیسے ارمان تھے۔ سوچتی تھی انہیں نجف لے جاؤں گی۔ انہیں شاہِ نجف کے مزار کا مجاور بناؤں گی۔ خیر سے تب تو چلنے لگیں گے۔ انگلی پکڑ کے قبر کے گرد پھرا دوں گی۔ مگر لوگو اب تو ان کی خود کی قبر بننے کا تیا پانچا ہو رہی ہیں۔ اے میرے مولا منت کے طوق بڑھانے کی تمنا پوری ہوئی۔ مزار کی بسم اللہ کر پائی کربلا کا بلاوا آ گیا۔ اتنی جلدی جانے کی تھی۔ تو میری گود کیوں سجائی تھی۔ میرے لال اس بدنصیب

ماں پر رحم کرو، ایک بار آنکھیں تو کھولو۔"

زینبؑ بنت علیؑ نے جب سے علی اکبرؑ کو خون میں ڈوبا ہوا دیکھا تھا۔ نہ جانے غم و اندوہ کی کس دنیا میں کھوئی ہوئی تھیں۔ بھائی کا دوسرا چراغ بھی نظروں کے سامنے موت کی آندھی اور طوفان میں گھرا ہوا تھا۔ دنیا کے گوشے گوشے میں انباروں پانی بھرا ہوا تھا۔ چشمے چھلک رہے تھے۔ آبشار گنگنا رہے تھے۔ جھیلیں امڈ رہی تھیں، مگر چھ مہینے کا بے زبان بچہ تین دن سے پیاس کا عذاب سہہ رہا تھا۔ بچے کی انگلیاں اینٹھ کر سخت ہو گئی تھیں۔ ننھے ننھے ہاتھوں میں مٹھیاں باندھنے کی بھی سکت نہ رہی تھی۔ منہ میں انگوٹھا لیا مگر چوسنے کی طاقت سلب ہو چکی تھی۔

ان کے پاس بھاوج کو سمجھانے کے الفاظ کا سارا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا۔ جس کا صبر و قرار پہلے ہی لٹ چکا ہو وہ کسی کو صبر کی تلقین کرنے کے لیے پتھر کا جگر کہاں سے لائے۔

"یہی ہماری تقدیر ہے بانو۔"

"دیکھو تو میرے بچے کی پتلیاں پھری جاتی ہیں۔" بانو کبھی بچے کے ننھے ننھے ہاتھ پیر چومتیں، کبھی دامن سے ہوا دیتیں، کبھی ایک ایک کا منہ تکتیں۔ سکینہ اپنی پیاس بھول کر بار بار بھیا کے پاس آتیں، تالیاں بجاتیں۔

"میرا بھیا ہنستا بھی نہیں۔ ما، آنکھیں تو کھولو میرے شہزادے۔ بولتے کیوں نہیں۔ کیا ہم سے خفا ہو، دیکھو تو تمہاری وجہ سے امی کیسی پریشان ہو رہی ہیں۔ اللہ تم تو ہماری طرف دیکھتے بھی نہیں۔ پیاس لگی ہے۔ چندا! چچا جان پانی لینے گئے ہیں۔ ابھی ڈھیر سا پانی لائیں گے۔ ہم اپنے بیرن کو خوب پانی پلائیں گے۔ امی بھیا کو کیا ہو رہا ہے؟"

سکینہ کی فریاد سن کر سب بانو کے پاس جمع ہو گئے۔ کوئی تکبیر پڑھ کر دم کرتا، کوئی اکڑے ہوئے پیر سیدھے کرتا۔ سب آیات قرآنی پڑھ پڑھ کر پھونکنے لگے۔

آخر فیصلہ ہوا کہ امام کو بلایا جائے۔ ذرا امام ایک نظر کر تو دیکھیں، ابھی علی اکبرؑ کا لاشہ لے کر مقتل کی طرف گئے ہیں۔ زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔ راستے ہی میں ہوں گے۔

امامؑ نے جو پیچھے سے پکار سنی تو علی اکبرؑ کی لاش اسی مقام پر رکھ دی۔ جہاں انہیں

شہید کیا گیا تھا۔ اور تیز تیز قدم جا کے خیمے میں پہنچے۔ ابھی جوان بیٹے کا خون ہاتھوں پر خشک نہ ہوا تھا کہ دودھ پیتے علی اصغرؑ پر نزع کا عالم طاری ہو گیا۔

زینبؑ نے لپک کر بھائی کو سہارا دیا۔ ہاتھ پکڑ کے بچے کے پالنے تک پاس لائیں اس کے اکڑے ہوئے ہاتھ پاؤں دکھائے۔ امامؑ سمجھ گئے کہ علی اصغر بس کوئی دم کے مہمان ہیں۔ سانس بس کچھ یونہی سی چل رہی ہے۔

تھوڑی دیر اپنے معصوم فرزند کو حسرت سے تکتے رہے۔ پھر نہ جانے کیا خیال آیا جھک کر کان میں کچھ کہا۔

بچے نے موت کی کش مکش پر دم بھر کے لیے فتح پائی۔ بڑی کوشش سے آنکھیں کھولیں۔ اور مسکرا کر گود میں جانے کے لیے امامؑ کی طرف ہاتھ پھیلا دیئے۔ امامؑ نے بچے کو اپنے تھکے ہارے سینے سے لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

سکینہؑ خوشی سے تالیاں بجانے لگیں۔

آہا جی بابا نے بھیا کو ہنسا دیا، امی جان، بھیا نے ہنس کر آنکھیں بھی کھول دیں۔ اور ہمک کے بابا کی گود میں چلے گئے۔ بانوؑ کے دم میں دم آیا۔ ایک دم آنسو پونچھ کر ہنس پڑیں۔

"توبہ، میں بھی کیسی وہمی ہوں، اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر، بی بی دیکھو تو اپنے بابا کو دیکھ کر کیا مزے سے ہنس پڑے۔ جیسے بس وہی تو ان کے سب کچھ ہیں۔ ہم بے چارے کچھ بھی نہیں" اور سب بھی ان کی ہنسی دیکھ کر ہنسنے لگے۔

زینبؑ بھی اپنی مسکراہٹ نہ روک سکیں۔ پھر جھک کر بھتیجے کی پیشانی چومی اور امامؑ سے پوچھا۔

"بھائی اپنے بچے کے کان میں ایسی کیا بات کہہ دی کہ دوبارہ جی اٹھا۔"

"کچھ نہیں زینبؑ ہم نے تو ان سے بس اتنا ہی پوچھا۔ بیٹے علی اکبرؑ کے پاس چلو گے۔ یہ علی اکبرؑ سے بہت ہلے ہوئے تھے۔ شوق ملاقات کی خوشی میں ہنس پڑے۔ اور ہمارے پاس آ گئے کہ ہم انہیں بھی ان کے پاس پہنچا دیں۔"

بانوؑ بولیں۔ "وہ تو بے چارے شاید ظالموں کو ان کی کم عمری دیکھ کر ترس آ جائے اور

انھیں پانی پلادیں۔

"دیکھو ان کے پاس لے کر تو جاتا ہوں۔ چلو ان کی خاطر پانی کی بھیک بھی مانگ لیں گے آگے، ان کی قسمت، پانی دیتے ہیں یا موت؟"

بانو موت کا نام سن کر لرز اٹھیں۔ بولیں۔

"میں باز آئی ایسے پانی سے، لائیے صاحب میرا بچہ مجھے دے دیجیے۔"

"موت سے اتنا بچا رہی ہو انھیں؟ اگر پالنے ہی میں موت آگئی تو تم کیا کرو گی؟"

بانو کے پھیلے ہوئے ہاتھ بے کسی سے نیچے گر گئے۔ اور سر جھکا کر رونے لگیں۔

"بانو علی اصغر کی عمر کو تھوڑی دیر کے لیے بھول جاؤ۔ اور دیکھو، کیا یہ بھی ایک مجاہد نہیں؟ فرق اتنا ہے کہ اوروں کے ہاتھ میں برچھیاں اور بھالے ہیں۔ زہر میں بجھے تیر ہیں۔ وزنی گرزیں ہیں، اور ان کے ننھے ننھے ہاتھ خالی ہیں۔ ان کا واحد ہتھیار ان کی معصومیت ہے ہم سب اپنے اپنے مورچہ پر لڑ رہے ہیں۔ یہ بھی کس شان سے اپنا مورچہ سنبھالے ہوئے ہیں۔ آج جہاد کے لیے عمر کی قید اٹھ گئی ہے۔ اس ننھے سپاہی کو بھی میدان جنگ میں جا کر اپنے اسلحہ کی بانگی دکھانے دو۔ کون جانے جہاں ہمارے ہتھیار مجبور ہو گئے۔ ان کی معصومیت اور کم سنی فتح یاب ہو جائے۔ اس کے علاوہ میں ان ظالموں کو کوئی بہانہ دینا نہیں چاہتا۔ اگر علی اصغر نے پیاس کے مارے اپنے پالنے میں دم توڑ دیا تو دشمن کو یہ کہنے کی آڑ مل جائے گی کہ انھیں پتہ نہ چلا۔ اگر بچے کے لیے پانی چاہیے تھا تو ہم اسے اپنی آنکھوں سے مرتا دیکھتے تو ضرور۔ پانی دے دیتے۔ امام نے اپنی ضد میں ہمیں سنگدلی کا الزام دینے کے لیے بچے کو پیاسا مار ڈالا۔ ہمیں پتہ بھی نہ ہونے دیا۔ اس لیے اور بھی انہیں لے جانا چاہتا ہوں کہ آخر وہ لوگ بھی انسان ہیں۔ میرے نانا رسول خدا کی امت ہیں۔ میں کیونکر یقین کر لوں کہ وہ پیاسے بچے پر رحم کھانے کی صلاحیت کھو چکے ہیں۔ ویسے اب انہیں پانی ملا بھی تو حلق سے اترنے سے پہلے ہی شاید دم توڑ دیں۔ موت تو ہر طرح آنی ہی ہے۔ اس پالنے کے بجائے مقتل میں بھی آئے گی۔ کیا فرق پڑے گا۔ ویسے تمہاری جو مرضی۔ تم اس کی ماں ہو۔"

"نے جائیے سرتاج، لے جائیے میرے ننھے پیاسے کو، مگر ذرا ٹھہریئے میں اسکے

کپڑے بدل دوں۔ سالگرہ کے خیال سے میں نے گلابی کرتا بنایا تھا۔ اب سالگرہ کا کیا بھروسہ سال بھر نا نصیب ہو کہ نہ ہو۔ پہن لیں، یہی بہت ہے۔"

بانو نے علی اصغر کو کرتا پہنایا، نہ جانے دل کی کیا حالت تھی۔ جلدی جلدی ریشمی زلفوں میں کنگھی کی۔ آنکھوں میں سرمہ ڈالا۔ پھر اُن کا سرد مرجھایا ہوا ہاتھ ان کے ماتھے سے لگا کر بولیں۔

"لوگو ہمارا بیٹا سلام کر رہا ہے۔"

سب نے درازیِ عمر کی دعائیں دیں۔ بلائیں لے کر انہیں رخصت کیا۔ امام خیمے کے دروازے تک گئے تھے کہ بانو نے دوڑ کر ایک چادر بچے پر ڈال دی۔

"میرا بچہ دھوپ میں کمھلا جائے گا۔ چار چھ مہینے کا دودھ میں نے بخشا۔ یا اللہ میرا لال پھر زندہ میری گود میں آئے گا کہ نہیں۔ سنبھال کے لیے جائیے میرے آقا میں اپنا بچہ آپ سے لوں گی۔"

امامؑ بیٹے کو ہاتھوں پر لے کر چلے۔ ساتھ ساتھ موت گود پسارے چل رہی تھی۔۔ دل میں سوچ رہے تھے۔

"میں نے تو آج تک جو کچھ بھی مانگا، خدا سے مانگا۔ پانی کے لیے ہاتھ کیسے پھیلاؤں گا۔ پانی کے لیے التجا کی ہمت کہاں سے لاؤں گا۔ میری تو زبان ہی نہ کھلے گی۔ اور زبان کھل بھی گئی تو وہ کب سننے والے ہیں۔ ایک ننھی سی آس کی ڈوری لگی ہے۔ وہ بھی ٹوٹ جائے گی۔ میری بات بھی جائے گی۔ اور بچہ کی جان بھی۔"

جب دشمن کی فوج کی طرف چلے تو خودداری زبان بند کر رہی تھی۔ غیرت سے پیروں میں لرزش تھی۔ سر جھکا ہوا تھا۔

غنیم کی فوج نے امام کو آتے دیکھا تو طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔ کسی نے پوچھا۔

"امام کے ہاتھوں میں کیا ہے؟"

"امام کے ہاتھوں میں قرآن ہے شاید درمیان میں ڈال کر صلح کرنا چاہتے تھے

فوج میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

"آگئے شاید سیدھے راستے پر، علی اکبرؑ کی موت نے کمر توڑ دی۔ سارا غرور ختم ہو گیا جیسے سر کاٹ کر تو لے جائیں گے۔ مگر پا بہ جولاں امام کو لے جانے کی بات ہی اور رہے گی۔ یزید کے دربار میں جب زنجیریں کھڑکاتے جائیں گے۔ تب اصل غرور ٹوٹے گا۔ اور سارے دعووں کی قلعی کھل جائے گی۔"

امام نہتے تھے۔ کمر میں تلوار بھی نہیں تھی۔ عجب حال زار تھا۔ سر سے پیر تک پیاروں کے خون میں تر تھے۔ نہ اتنی مہلت ملی تھی کہ لباس تبدیل کرتے۔ نہ وہ ان داغوں کو اپنے تن سے جدا کرنا چاہتے تھے یہ لہو کے داغ ہی تو کل سرمایہ رہ گیا تھا۔ جانے والوں نے یہ داغ ہی تو انہیں ہدیہ کیے تھے۔

قریب جا کر انہوں نے بچے کے چہرے سے ردا سرکائی۔ نگاہیں نیچی کر کے بڑی مجبور آواز میں کہا۔

"یہ بچہ تمہارے سامنے ایک التجا لے کر آیا ہے۔ رو رو کر بے حال ہوا جاتا ہے اب تو حلق سے آواز بھی نہیں نکلتی۔ سب اسے بہلا کر ہار چکے ہیں۔ پیاس سے بے حال ہو رہا ہے۔ بقول تمہارے میں مجرم ہوں۔ میں غدار ہوں۔ مگر یہ بے زبان اور بے قصور ہے چھ مہینے کی جان ساتویں محرم سے پیاسا ہے۔ ماں کا دودھ بھی کل رات سے خشک ہو چکا ہے۔ ابھی گھٹنوں بھی نہیں چلتا۔ تمہیں اس نے ذرا کوئی نقصان پہنچایا ہے نہ پہنچا سکتا ہے۔ یہ بے زبان خود نہیں بول سکتا۔ اس لیے مجھے پہلی بار زندگی میں تمہارے آگے دست سوال پھیلانا پڑ رہا ہے۔"

"آپ کو شرائط تو معلوم ہیں۔ ان کو پورا کیے بغیر کسی حالت میں بھی پانی نہیں مل سکتا۔" ابن سعد نے کہا۔

"شرائط میرے لیے ہیں۔ میں اپنے لیے پانی نہیں مانگتا۔"

امامؑ نے نرمی سے کہا "اس بچے کا ان شرائط سے کیا واسطہ؟"

"آپ کے کسی بھی دوست، غم خوار یا عزیز کے لیے ہمارے پاس ایک بوند پانی نہیں۔

علی اصغر گھٹنیوں چل کر بھیک مانگتے تب بھی انہیں جواب میں تیر اور تلوار ہی ملتے۔ اور صاحب ہم ایسے بے وقوف نہیں جو ان بہانوں میں آجائیں۔ یا حسینؑ پیاس خود آپ کو لگی ہے۔ بچہ کا بہانہ کرتے ہیں۔" ابن سعد نے کہا۔

"اچھا، تم سمجھتے ہو کہ میں دغا سے تم سے پانی لینا چاہتا ہوں۔ تو تم کہو تو میں بچے کو یہاں ریت پر تمہارے سامنے لٹا دیتا ہوں تم اپنے ہاتھ سے چند بوندیں پانی کی اس کے حلق میں ٹپکا دو تاکہ اس کی جان بچ جائے۔ تمہیں جتنی قیمت پانی چاہیے ہوں لو۔ میں دینے کو تیار ہوں۔ اس وقت ایک ایک قطرے کے لیے موتی بھی مانگو تو مجھے انکار نہ ہو گا۔"

امام نیچی آنکھیں کئے اسی انسانیت اور نرمی سے بول رہے تھے۔

"ارے ہمیں نہیں معلوم تھا آپ کے پاس قارون کا خزانہ ہے کہ ایک بوند پر سچا موتی لٹانے کو تیار ہیں۔ یار لوگوں نے ویسے ہی کہہ دیا ہے کہ آپ کے پاس دولت نہیں۔"

"کہنے والوں نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ میرے پاس دولت نہیں۔"

امام نے جواب دیا۔

"اور کیا آپ کے پاس دولت ہوتی تو آج یہ حالت کیوں ہوتی۔ لبی چوڑی فوج ہوتی۔"

"دولت سے تم جیسے خچر بے شک خریدے جا سکتے ہیں۔ دوست غم خوار اور بیٹے نہیں خریدے جا سکتے ہیں۔ میں تم سے اس وقت جنگ کرنے نہیں آیا ہوں۔ اس بچہ کے لیے پانی لینے آیا ہوں۔"

"اور ہر بوند کے لیے سچا موتی دینے کو تیار ہوں۔ لائیے سودا برا نہیں۔ نکالئے جو زر و جواہر جیب میں ہیں، انہیں دیکھ کر آپ کے سوال پر غور کیا جائے گا۔"

"میرے پاس زر و جواہر تو نہیں، ہاں بچوں کے کانوں میں کچھ منت کے بالے پڑے ہیں۔ تم کہو تو وہی لادوں۔"

"کمال ہے صاحب، وہ تو مال غنیمت ہے۔ بھلا اس پر تو ہمارا حق ہے۔ آپ اپنے تصرف میں نہیں لا سکتے۔"

کیا تم سب کے سب نامرد ہو، کسی کے فرزند نہیں، سب بنجر ہو، بیٹے کو چھاتی سے لگانے کا لطف تم میں سے کسی کو نصیب نہیں ہوا؟ کیا تم نے کبھی اپنے بچے کو ہاتھوں پر نہیں اٹھایا؟"

فوج کے بیشتر سپاہیوں کی گردنیں شرم سے جھک گئیں۔ اتنے ذرا سے بچے کی جان کنی دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

"تھوڑا سا پانی دینے سے دریا نہ گھٹ جائے گا۔ بچہ کسی کا بھی ہو معصوم ہے۔" فوجی بڑبڑانے لگے۔

"معصوم کا صبر پڑے گا۔ ہم لوگ تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ یہ ظلم کی انتہا ہے۔" شمر نے فوج کے تیور دیکھ کر ڈانٹ بتائی۔

"احمقو! پاگل ہوئے ہو۔ سب کے کرائے پر پانی پھیرنا چاہتے ہو۔ یہ بچہ آج معصوم ہے۔ کل جوان ہو کر تمہیں اور تمہارے قبیلے کو تہس نہس کر دے گا۔ اسے پانی دے کر زہر کا پودا سینچنا چاہتے ہو؟ ایک بے حقیقت بچے کی خاطر، تباہی، ذلت اور حقارت کے غار میں گرنا چاہتے ہو۔" ساتھ ہی شمر نے اشارہ کیا۔ اور تیروں کی بارش شروع ہو گئی

امامؑ نے بچے کو سینے سے لگا لیا۔ اور جھک کر تیر اپنے جسم پر روکنے لگے۔

ناگاہ ابن کاہل نے کمان میں تیر جوڑا اور ایسا تاک کر مارا کہ تین پھل کا تیر بچے کی گردن میں ترازو ہو گیا۔

بچے نے بلبلا کر چیخ ماری اور آنکھیں کھول دیں، جیسے باپ سے پوچھ رہا ہے۔

"اے ساقیٔ کوثر کے نواسے کیا بے زبان بچہ کی پیاس ایسے ہی بجھائی جاتی ہے؟"

امام نے لرزتے کانپتے ہاتھوں سے تیر کھینچا۔ بچے نے دودھ کے بجائے جیتا جیتا خون اگل دیا۔۔۔۔ ایک عجیب سی مسکراہٹ پل بھر کے لیے پیاسے ہونٹوں پر آئی اور بچے نے دم توڑ دیا۔ امامؑ نے گردن سے ابلتے ہوئے خون سے چلو بھر لیا۔ چاہا کہ آسمان کی طرف اچھال دیں کہ غیب سے آواز آئی۔

"نہیں نہیں حسینؑ، اگر تم نے یہ خون آسمان کی طرف پھینکا تو پھر کبھی ایک بوند

ارش کی نہ برسے گی۔"

امامؑ نے چاہا بیٹے کا خون زمین پر گرا دیں کہ پھر وہی آواز سنائی دی۔

"خبردار حسینؑ! اس خون کا ایک قطرہ بھی زمین پر گرا۔ تو پھر اس زمین پر اناج کا ایک دانہ بھی نہ اُگے گا۔"

امامؑ نے حسرت سے ہر چہار طرف تھکی ہوئی نگاہ ڈالی اور بولے

"بیٹے اصغر ارض و سما کو تمہارے خون سے انکار ہے۔ تمہارے خون کا کہیں ٹھکانا نہیں۔ میں زمین سے طاقت روئیدگی نہیں چھینوں گا!"

یہ کہہ کر خون اپنے چہرے پر مل لیا۔

امام حسینؑ ابن علیؑ چھ ماہ کے شہید بیٹے کی لاش ہاتھوں میں لیے سوچ رہے تھے

"علی اصغر میری جان، اب تمہاری ماں تمہیں مجھ سے مانگیں گی۔ تو کیا جواب دوں گا؟ تمہاری لاش کس دل سے اس کی اجڑی گود میں ڈالوں گا۔"

اسی وقت میں فضہؓ خیمے سے نکلیں، انہیں پکار کر امامؑ نے کہا۔

"لو فضہ علی اصغرؑ کی پیاس بجھ گئی، ان کی ماں سے جا کے کہہ دو بڑی گہری نیند سوئے ہیں، اب روزِ محشر جاگیں گے۔" یہ کہہ کر بچے کی لاش جوان سال علی اکبرؑ کی آغوش میں لٹا دی۔ ان کا ہاتھ ان کے سینے پر رکھ دیا۔

"لو بیٹے ہم نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ تمہیں بڑے بھائی کے پاس پہنچا دیا۔ علی اکبرؑ ننھے سے بھیا کو سنبھالو، ہم بھی آتے ہیں۔"

تھوڑی دیر خون بار آنکھوں سے اپنی زندگی بھر کی کمائی دیکھتے رہے۔ یکایک جلال سے چہرہ سرخ ہو گیا۔ جھکی ہوئی کمر سیدھی ہو گئی۔ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"اے رب العزت تو دیکھ رہا ہے۔"

اتنے میں بچے کی لاش کو دھوپ میں چھوڑنے پر دل نہ تیار ہوا، علی اکبرؑ کی کمر سے

خنجر نکال کر ننھی سی قبر کھودی، علی اصغرؑ کی میّت دفن کی اور دامن جھاڑ کر کھڑے ہو گئے۔ اب کچھ باقی نہ بچا تھا۔ سب کچھ لٹ دیا۔ اور آخری بار باقی ماندہ رشتہ داروں سے ملاقات کے لیے خیموں کی طرف روانہ ہو گئے۔

جوں ہی امامؑ نے خیمہ میں قدم رکھا ایک کہرام مچ گیا۔

"امامؑ آخری ملاقات کو تشریف لاتے ہیں۔"

سب نے چاروں طرف سے انہیں گھیر لیا۔ اور بے اختیار رونے لگے۔ امامؑ کا چہرہ نقاہت سے زرد تھا۔ ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ اور سر سے پیر تک خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہے تھے۔ انہوں نے تھکی ماندی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا۔ اب خود ان میں کسی کو تسلی دینے کی سکت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ بس سب کو ایک نظر بھر کر دیکھنے کو آئے تھے۔ مگر کسی سے آنکھ ملانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ ام لیلا نے اٹھارہ برس کی کمائی لٹائی تھی۔ ام رباب نے چھ مہینے کا پھول سا بچہ قربان کیا تھا۔ ابوالفضل عباس کی بدنصیب بیوہ، قاسمؑ کے غم میں گم سم کمسن بیٹی فاطمہ کبریٰ، اور عونؑ و محمدؑ کا دہرا غم سہنے والی شیردل بہن، زہرائے ثانی، بھائی کو یوں کھوئی نظروں سے سب کو تکتے دیکھا۔ تو زینبؑ بنت علیؑ کے دل پر چوٹ لگی۔ بڑھ کر مظلوم بھائی کا ہاتھ تھام لیا۔ امامؑ نے نڈھال ہو کر بہن کے شانے پر رکھ دیا۔

"زینبؑ، زینبؑ ہم بڑے سخت جان ہیں، دیکھو تو ہم نے کیسے کیسے وار سہے ہیں پھر بھی زندہ ہیں۔ اور ہمیں کب تک جینا پڑے گا؟"

"تم رہتی دنیا تک جیو بھیا۔" زینبؑ نے بھائی کو ایک بچے کی طرح سینے سے لگا لیا۔

"یہ دیکھو ہماری عبا ہمارے پیاروں کے لہو سے گلزار بن گئی ہے۔ یہ دیکھو یہ قاسمؑ کا خون ہے، یہ عباسؑ کا۔ اور علی اکبرؑ نے جان کنی میں ہماری چھاتی سے لپٹ کر اپنے خون میں نہلا دیا۔ یہ ہمارے سفید بالوں پر علی اصغرؑ کے خون کا خضاب ہے۔ تمہارے دونوں لال عونؑ اور محمدؑ تو ہمیں سر سے پیر تک لہو میں ڈبو گئے۔"

بہن نے ماں بن کر امامؑ کے جھکے ماندے سر کو پیار سے سہارا دیا۔ انھیں اپنے پاس بٹھا دیا۔ پریشان بالوں میں انگلیوں سے شانہ کیا۔ خشک زخمی ہونٹ دیکھ کر کلیجہ پھٹنے لگا۔ بے بسی سے سسک کر ان کے ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لیے۔

"اس خون کے قطرے قطرے کا حساب ہو گا۔"

"بابا، پیارے بابا" ننھی سکینہ لڑکھڑاتی گرتی پڑتی آ کر پیروں سے لپٹ گئیں۔

"بابا ہمیں ذرا سی بھی پیاس نہیں، پانی سے ہماری توبہ، ہم کبھی پانی نہیں مانگیں گے۔ چچا جان پانی لینے گئے۔ پھر نہ لوٹے، اب ہم آپ کو پانی لانے کے لیے نہیں جانے دیں گے۔"

"ہم پانی لینے نہیں جا رہے ہیں بیٹی۔ ہمارے نصیب کا پانی روئے زمین سے اٹھ گیا اب تو ہم اپنی امی کے پاس جا کر ہی آب کوثر سے اپنی پیاس بجھائیں گے۔"

"تو ہمیں بھی دادی جان کے پاس لے چلیے۔ ہم بھی تھوڑا سا پانی پی لیں گے زیادہ نہیں بس ایک گھونٹ۔"

"نہیں بی بی، تمہاری باری ابھی نہیں آئی تمہیں انتظار کرنا ہو گا۔"

"ہم انتظار کرتے کرتے تھک گئے بابا، یہ جگہ اچھی نہیں مدینہ چلیے۔"

"مدینہ نہیں جا سکتے میری جان۔"

"تو پھر نجف چلیے۔"

"نجف کا بھی راستہ بند ہے۔ دشمن نے زبردست ناکہ بندی کی ہے۔"

"بابا ذوالجناح تو ہوا سے بھی زیادہ تیز ہے۔ وہ تو ہمیں لے کر صاف نکل جائے گا۔"

"ذوالجناح سے بھی زیادہ تیز موت ہے۔ جو برسوں سے ہمارا پیچھا کر رہی ہے ہم چاروں طرف سے گھرے ہوئے ہیں۔ کوئی راہ فرار نہیں۔ تم بڑی سمجھدار ہو میری گڑیا، ہمیں ہنسی خوشی الوداع کر دو۔ اور دیکھو تم ہماری بہادر بیٹی ہو۔ ہمیں کچھ ہو جائے تو رونا نہیں کہ تمہیں رلا کر دشمن خوش ہوں گے۔"

"ہم نہیں روئیں گے، دشمن کا جی خوش کرنے کے لیے ہم کبھی نہ روئیں گے۔"

"یہ طوق اور بندے اتار کر پھینک دو، ہوس کے بندے تمہارے کان نوچ لیں گے۔
امامؑ نے بچوں سے کبھی حقیقت کو نہیں چھپایا۔ "بہت برا وقت آنے والا ہے۔"

"ہم تب بھی نہیں روئیں گے۔" سکینہ نے رو کر ننھی ننھی بانہیں باپ کی گردن میں حمائل کر دیں۔

"بانوؑ کہاں ہیں؟" امامؑ نے بچی کو بہن کے سپرد کر کے پوچھا۔

"صبح سے بیٹے سے بچھڑی ہیں۔ سر پیر کا ہوش نہیں۔ جہاں اپنے شہزادے کی لاش لا کر رکھی تھی۔ وہیں خاک دھول میں پڑی ہیں۔ ان کی حالت دیکھ کر صبر و قرار ہاتھ سے جاتا ہے کلیجہ پھٹا جاتا ہے۔" فضہؑ نے کہا۔

امامؑ گھٹنوں پر ہاتھ ٹیک کر اٹھے، جا کے دیکھا۔ بانو خون آلودہ خاک پر منہ رکھے نہ جانے غم و اندوہ کی کن بھیانک وادیوں میں سرگرداں ہیں۔ امامؑ ان کے پاس بیٹھ گئے۔ ان کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا چہرے سے پریشان بال ہٹائے اور بڑی حسرت سے کہا۔

"بانو، کیا ہمیں الوداع بھی نہ کہو گی؟ تمہارا غم میرا غم ہے۔ میری ملکہ، اٹھو کہ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔"

"بانو نے چونک کر آنکھیں کھول لیں۔ انہیں دیکھ کر اٹھیں۔ پھر ان کے پیروں پر سر رکھ دیا۔

"کہاں ہے میرا لال، میں تو اسے آپ ہی سے لوں گی۔ لائیے میرے کلیجے کا ٹکڑا، کہاں گم کر آئے۔ اے فاطمہ کے لال، رحم کیجیے، میرا لال مجھے دے دیجیے۔ میں اس کے بغیر کیسے جیوں گی۔ میرا منتوں مرادوں کا پالا، میری زندگی کا سہارا، میرا چاند کہاں چھپ گیا کس کی نظر اسے کھا گئی۔ آپ کو رسول خدا کا واسطہ، مجھ پر رحم کیجیے۔ ہم شکل محمدؐ کی بس ایک جھلک دکھا دیجیے۔ پھر چاہے ہمیشہ کے لیے میری آنکھوں کی بینائی جاتی رہے۔ بس ایک بار اسے کلیجے سے لگا لوں، اس کا چاند سا مکھڑا چوم لوں، پھر چاہے مجھے موت آ جائے۔"

بانو کی بے قراری نے امامؑ کے دل کا خون کر ڈالا۔

"بانو، میری ملکہ کیسے بلاؤں؟ ایسے روٹھے کو کیوں کر مناؤں؟ وہ تو اپنی دادی کے پاس گئے۔ اٹھارہ برس جو انھیں پیار کرنے کی سعادت ہمیں نصیب ہوئی وہی غنیمت ہے۔ ذرا سوچو میری بانو، تمہارے شیر دل بیٹے نے کس لیے اپنا جوان خون بہایا ہے، انصاف اور حق کی خاطر، ان قدروں کی خاطر جن کی وجہ سے انسان اور حیوان کا فرق واضح ہوتا ہے۔ ہم خوش نصیب ہیں کہ ہمیں رب العزت نے ایسا بے مثال فرزند عطا فرمایا۔ بانو علی اکبرؑ نے اس شان سے موت کو گلے لگایا ہے کہ دشمن تک اس کے حضور میں سجدہ ریز ہو گئے۔ خدانخواستہ ہمارا بیٹا یزید صفت ہوتا اور سو سال کی عمر پاتا تو کیا ہمارا سر فخر سے اونچا ہو جاتا؟"

"نہیں آقا، خدا کسی بدنصیب ماں کی کوکھ سے شیطان پیدا نہ کرے۔ میرا شہید ان زندہ لاشوں سے ہزار درجہ زیادہ زندہ ہے۔"

"بس جانِ من، خدا تمہارا حافظ و ناصر، ہم اپنے بچوں کے پاس جانے کے لیے بے قرار ہیں۔ لاؤ اپنے بیٹے کے لیے کوئی پیغام دینا چاہتی ہو تو دے دو۔"

جانے کا نام سن کر پھر سارے زخموں کا منہ کھل گئے۔ کلیجہ پکڑ کر اٹھ بیٹھیں۔ زندگی کے ساتھی کا دامن ہاتھ سے چھوٹ رہا ہے۔ سہاگ اجڑ رہا ہے۔ مانگ میں انگارے بھرے جائیں گے۔ اب یہ حلیم الطبع ہنس مکھ انسان زندگی ویران کر کے چلا جائے گا۔ ان بامہت ہاتھوں کا ریشمی لمس خون میں غرق ہو جائے گا۔ جینے کا مقصد ختم ہو جائے گا۔ سسک کر دامن پکڑ لیا۔ آنکھوں سے لگا کر بولیں۔

"قربان اے فاطمہؑ کے بے مثال بیٹے، آپ کے ساتھ زندگی کیسی پُر نور گزری، یہ تو بس میرا دل جانتا ہے۔ آپ جا رہے ہیں، اس زندگی کا کیا کروں، مجھ بدبخت کے لیے کیا حکم ہے۔ آپ کی یہ کنیز اگر ظالموں کی قید میں ذلیل و رسوا ہوئی تو لوگ کیا کہیں گے، فاطمہ زہراؑ اور شیرِ خداؑ کی بہو، پیغمبر خداؐ کی نواسہ بہو باندی بنا کر شام کے گلی کوچوں میں گھسیٹی جائے گی؟"

"تم اس خاندان کی بہو بھی ہو اور بیٹی بھی، جو اور بیٹیوں کا حشر ہو گا وہی تمہارا

بھی ہو گا۔ کیا تمہیں کسی خاص مراعات کی امید ہے ۔"

"نہیں میرے سرتاج آلِ رسول کی بہو بیٹیوں کا نصیب میرا نصیب ہے۔ یہ تو میری توہین نہیں توقیر ہو گی ۔ میں شہیدوں کی ماں ہوں۔"

"اور کوئی دم میں شہید کی بیوہ ہو جاؤ گی۔ بس آنسو پونچھ ڈالو۔ جانے والے کو ہنس کر وداع کرو کہ تمہارے ساتھ گزارے ہوئے زندگی کے خوشگوار لمحوں کی یاد تازہ ہو جائے۔ اور دیکھو اتنا خیال رہے ہماری لاش پر اتنا ہی ضبط سے کام لینا۔ چھپ کے بھی رو لینا کہ دشمنوں کے کلیجے ٹھنڈے نہ ہونے پائیں۔ ماں رسولِ خداؐ کے مزار پہ جا کر جی کھول کے رونا جو جی پر بیتی ہے۔ انہیں سنا کر جی ہلکا کر لینا۔ تم چاہو تو جا کر بھی تمہارے قریب رہوں گا۔ یہ جدائی عارضی ہو گی۔ خوابوں میں ملاقات رہے گی۔ موت کی کیا مجال ہے کہ ہمارے تمہارے رشتے کو توڑ سکے۔"

بانو کو سمجھا بجھا کر امامؑ واپس بہن کے پاس آئے۔

"چلو اس بیمار سے بھی رخصت ہو لیں۔ تم ساتھ آؤ، اکیلے جانے کی ہمت نہیں پڑتی ہمارے جانے کے بعد خدا جانے کیا حال ہو، ساتھ جانے کی ضد کرنے لگیں۔ تم ہو گی تو سنبھال لو گی۔

امامؑ بہن کے ساتھ سجادؑ کے کمرے میں آئے۔ وہ بخار میں بھن رہے تھے۔ تپلیاں چڑھی ہوئی تھیں۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ سر اور ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئے تھے۔

"یہ آخری چراغ بھی موت کی آندھی سے نبرد آزما ہے۔ ہمت کا ہو گیا ہے ظالم اجل سو بہر چہار طرف منہ پھاڑے دوڑ رہی ہے۔

پھوپھی نے آنچل کی ہوا دی، ماتھے کا پسینہ پونچھا، شانہ ہلایا۔ پیار سے بار بار پکارا۔ "سجاد، میرے شہزادے آنکھیں کھولو میرے لال، دیکھو تو تمہارے بابا آئے ہیں۔"

"بابا، کہاں ہیں بابا، ہمیں کیوں بھول گئے تھے بابا! ابھی تو ہمارے جسم میں جان باقی ہے۔ ہم کب سے ان کا انتظار کر رہے ہیں۔" ساجدؑ نے باپ کو ڈھونڈنے کے لیے

آنکھیں گھمائیں۔

امامؑ غش پر قابو پانے کے لیے خیمے کے پردے سے لگے تھے۔

"بابا، بابا حضرت یہ خون، آپ زخمی ہو گئے۔" اٹھنے کی کوشش کی مگر کانپ کر رہ گئے۔ امامؑ نے بڑھ کر بیٹے کو سہارا دیا۔

"نہیں بیٹے جسم تو صحیح و سالم ہے۔ ہاں دل و دماغ زخموں سے چور ہے۔ یہ خون جس میں آج نہایا ہوں۔ اس کی بڑی لمبی کہانی ہے، جسے رہتی دنیا تک لوگ سنیں گے سنائیں گے مگر ختم نہ ہو گی۔ یہ سچائی کا خون ہے، دین اسلام کا خون ہے، معصومیت اور بے گناہی کا خون ہے۔ وقت کم ہے بیٹے۔ اور وہ سب کچھ جو آج کی صبح نے مجھے اب تک دکھایا ہے۔ دہرانے کی سکت نہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ سب گئے، اب ہمیں جانا ہے۔"

"سب گئے، کہاں گئے؟ آپ کو اکیلا چھوڑ کر چچا عباسؑ چلے گئے۔ علی اکبرؑ اور قاسمؑ بھی چلے گئے۔ عونؑ و محمدؑ تو آپ پر جان چھڑکتے تھے۔ وہ چلے گئے۔ کہاں گئے۔ سب کے سب؟"

"یہ سب وہاں گئے۔ جہاں ہم سب کو ایک دن جانا ہے۔ تم بیمار ہو تم میں سننے کا دم نہیں۔ مگر جانے سے پہلے تم سے کچھ کہنا ہے۔"

"بابا میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا، آپ کیا فرما رہے ہیں۔ ہمیں چھوڑ کر سب چل دیئے اب آپ بھی جا رہے ہیں۔ اس حالت میں چھوڑے جا رہے ہیں۔ ہماری جان بس اب نکلا چاہتی ہے۔ للہ ہمیں دفن تو کرتے جائیے۔ کیا ہمیں جنگلی جانوروں کے رحم و کرم پر چھوڑ جائیں گے۔ نہیں بابا ایسا ظلم نہ کیجئے گا۔" بیمار پر سرسامی کیفیت طاری تھی۔ دونوں ہاتھوں سے باپ کا دامن تھام لیا۔ نہیں بابا ہمیں اس ویرانے میں ہرگز دفن نہ کیجئے گا۔ ہمیں اس ویرانے میں وحشت ہو رہی ہے۔ یہ تو ابھی سے قبرستان لگتا ہے خدارا ہمیں دادا جان کے قدموں میں دفن کیجئے گا۔"

"ابھی تمہارا وقت نہیں آیا۔ سجاد، تمہیں جینا پڑے گا بیٹے۔ ہمارے بعد تم ہی ان بیواؤں اور یتیموں کے ولی وارث رہ جاؤ گے۔ جان پدران کا ہر طرح خیال رکھنا۔"

"تو کیا آپ دشمن سے جنگ کرتے جا رہے ہیں؟ یہ نہیں ہو سکتا۔ بابا جان، چچا عباسؑ نے اس بے وفائی کی اُمید نہ تھی۔ پھوپھی جان نے اپنے علی اکبرؑ کا اتنا سر چڑھایا حیف ہے وہ بھی چھوڑ کر چل دیے اور قاسمؑ کیا کُرا کو تڑپتا چھوڑ گئے۔ یا وہ بھی گئی۔"

نہیں وہ بدنصیب زندہ ہے۔"

"مجھے اٹھنے دیجیے' میں ابھی زندہ ہوں' میری حیات میں آپ جنگ نہیں کریں گے پہلا حق شہادت میرا ہے۔ اور سب چلے گئے۔ مگر میں تو ابھی موجود ہوں۔"

"تم سمجھ رہے ہو۔ ہمارے پیارے ہمیں چھوڑ کر اپنی جان کی خیر منانے چلے گئے۔ نہیں میرے عزیز وہ سب کے سب تمہارے بدنصیب امام کے لیے ایک ایک کر کے شہید ہو گئے۔ عباسؑ، علی اکبرؑ، جعفرؑ، محمدؑ، عثمانؑ، قاسمؑ، عونؑ اور محمدؑ حتیٰ کہ ننھے علی اصغرؑ بھی میدان جنگ میں خودداراور بہادر سپاہیوں کی طرح شہید ہوگئے۔"

"علی اصغر بھی' ہائے بابا، وہ تو دودھ پیتے بچے تھے۔ ان پر جہاد کیونکر لازم ہوا؟ مگر وہ تو ابھی گھٹنوں چلتے تھے' وہ میدان جنگ میں کیسے گئے؟"

"وہ تین دن کے پیاسے تھے' پانی کی بھیک مانگنے میرے ہاتھوں کے سہارے گئے' پانی کے بجائے حلق میں تیر لگا۔"

"یا خدا' میں کیوں زندہ ہوں۔" سجادؑ سر پٹخنے لگے۔

"کیونکہ تمہیں زندہ رہنا ہے۔ آج مرنا آسان ہو رہا ہے۔ جینا محال ہے۔ اور تمہارا جہاد یہی ہے کہ تم زندہ رہو گے۔ ہزار بار ذہنی موت کا کرب سہو گے۔ مگر جیو گے۔ دھیان سے سنو جان پدر' میری پکار آ چکی ہے۔ کہیں بے صبر ہو کر میرے جیتے جی ہی ظالم بچوں اور عورتوں پر قہر نہ توڑنے لگیں۔ میرے بہادر بیٹے دل کو مضبوط کرو۔ ابھی جنگ ختم نہیں ہوئی یہ تو ابتدا ہے۔ جب تک یہ دنیا قائم رہے گی۔ جنگ جاری رہے گی۔ مجبور و مقہور انسان اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے لڑتا رہے گا۔ لہو بہتا رہے گا۔ یہ قطرہ قطرہ خون جمع ہوتا رہے گا۔ پھر ایک دن یہ طوفان بن جائے گا۔ اور ظلم و ستم کے بانی اس میں

غرق ہو جائیں گے۔ وہ جو آج میدان کربلا جنگ میں شہید ہونے والوں کے بعد زندہ بچ جائیں گے وہ ساری عمر بزبند زہر پیتے رہیں گے۔ اور اس جنگ کو جاری رکھیں گے۔ تم ایک سپاہی کے فرزند ہو سجاد! اب اس جنگ کو جاری رکھنا تمہارا فرض ہے۔ تمہارے ان نحیف کندھوں کو بڑا زبردست بوجھ اٹھانا ہوگا کہ یہی تمہارا جہاد ہے۔ اچھا خدا تمہیں اپنا فرض انجام دینے کی ہمت عطا فرمائے۔ خدا حافظ میرے جانباز۔"

باپ کے الفاظ نے نیم مردہ بیمار میں جان ڈال دی۔

"آپ کا حکم خدا کا حکم ہے میرے آقا، میں جیوں گا۔ اور بڑے فخر سے یہ سم قاتل پیوں گا۔"

"تمہیں اب اپنی مجبوری اور لاچاری پر احساس کمتری تو نہیں۔"

"نہیں بابا بس دعا کیجیے کہ میں اپنے عہدے کی ذمہ داریوں کو خوش اسلوبی سے نبھا سکوں۔"

"انشاء اللہ، ایسا ہی ہوگا۔ امامؑ نے بیٹے کی پیشانی چومی اور جلدی سے جانے کو مڑ گئے۔

"آپ جا رہے ہیں بابا تو اتنی عنایت کیجیے کہ خیمہ کا پردہ اٹھا دیجیے۔ تاکہ جہاں تک نظر کام کرے آپ کو دیکھتا رہوں۔ یا خدا مجھ میں تو اتنا بھی دم نہیں کہ آپ کو ذوالجناح پر سوار کرنے کی سعادت حاصل کر سکوں۔"

امام حسینؑ ابن علیؑ نے پردہ اٹھا دیا اور باہر نکل گئے۔

بھائی کو یوں رخصت ہوتے دیکھ کر زینبؑ کے دل پر گھونسہ سا لگا۔ بھاگ کر راستہ روک کر کھڑی ہو گئیں۔

"میں نے اماں سے وعدہ کیا تھا کہ جب تک اس جسم میں جان ہے بھیا پر آنچ نہ آنے دوں گی۔ آپ مقتل میں جا کر مجھے اماں کے سامنے شرمندہ کراتے ہیں۔ میں ہرگز نہیں جانے دوں گی۔"

"زینبؑ ہوش میں آؤ۔ اپنے دل کو سنبھالو۔ ہمیں جانا ہی ہوگا۔"

دل کو سنبھالوں؟ کہاں ہے میرا دل؟ میرا دل تو ریزہ ریزہ ہو کر کربلا کی ریت میں مل گیا۔!"

بھائی نے بے قرار ہو کر چھوٹی بہن کو سینے سے لگا لیا۔

"بھائی برادر، تیرے پیار کا بدلہ کیسے چکا سکوں گا۔ تو اتنی ذرا سی تھی مگر اماں کے بعد تو نے کبھی اُن کی کمی کو نہ محسوس ہونے دیا۔ کون بہن ایسی ہے جو اپنے بھائی پر سے اپنے جگر گوشے قربان کر سکتی ہے۔ میں اکیلا نہیں پوری عرب قوم تیری اس قربانی کا احسان مانے گی۔ اے میری دلیر اور باہمت بہن، تو عورت ہے پھر بھی تیرے سینے میں ایک بہادر جان باز کا دل ہے۔"

"نہیں بھیا میں بڑی کم ہمت ہوں۔ اماں ابا کے جانے کے بعد سوچتی تھی۔ بس اب یہی غم کا پہاڑ ہے اب اس سے بڑھ کر کون سا غم میرے دل پر ٹوٹے گا۔ پھر جب علی جو اُن میں بڑے بھائی شہید ہوئے۔ تو دل کو ایک ایسا زخم لگا کہ زندگی سے جی اچاٹ ہو گیا۔ آج کا یہ سیاہ دن ایسا میرے نصیب میں آیا ہے کہ میرے حواس مختل ہو گئے۔ اب تازہ زخموں کی اس دل میں جگہ نہیں بھیا۔ مجھ پر رحم کرو۔ جنتر ہو جائے۔ میں مشکل میں اکیلا نہیں جانے دوں گی۔ کل ساری رات اماں کے رونے کی آواز کانوں میں آتی رہی۔ بار بار خواب میں دکھائی دیں۔ حیران و پریشان۔ سر کھولے ننگے پیر ریت کے ذروں میں اپنے کھوئے ہوئے لال ڈھونڈ رہی ہیں۔ میرے بھائی مجھے بھی مقتل میں اپنے ساتھ لے چلو!"

"نہیں۔"

"تم گرو گے تو کون سنبھالے گا۔ خون میں نہاؤ گے تو کون سہارا دے گا۔ برچھیاں کھا کر گرو گے تو کون اٹھائے گا مجھے لے چلو۔ جو تیر اور برچھیاں تمہاری طرف آئیں گی۔ میں انھیں اپنے تن پر روکوں گی۔ تمہارے بازوؤں میں دم توڑنے کا بڑا ارمان ہے۔ بھیا!"

"نہیں زینبؑ نہیں۔"

"اس لیے کہ میں کم بخت ایک عورت ہوں۔"

"تم عورت ہو مگر شیر خدا کی بیٹی ہو، کوئی بزدل ہی تمہیں کمزور سمجھ سکتا ہے۔"

"تو پھر میری یہ التجا رد نہ کرو، پہلی بار تم سے کچھ مانگا ہے۔ میں خالی آنچل لے کر نہ

ہٹوں گی۔ ایسا ہی ہے تو میان سے تلوار نکالو اور مجھے راستے سے ہٹا دو زندہ تو نہ ہٹوں گی۔"

"خودکشی حرام ہے اور تو اور میں جدا جدا نہیں۔ بچوں جیسی باتیں نہ کرو۔ زینبؑ، لاؤ اپنا آنچل پھیلاؤ، میں بھر دوں گا۔ اتنا بھر دوں گا کہ قیامت تک نہ خالی ہوگا۔ میرے بعد ان بیواؤں اور یتیموں کی تم ولی اور وارث ہو۔ سجادؑ اکیلا ہے، بیمار ہے۔ تمہاری مدد کے بغیر اس عظیم بوجھ کو ہرگز نہ اٹھا سکے گا۔ اسے بھی تمہیں سنبھالنا ہوگا۔ بھول جاؤ کہ تم عورت ہو۔ اس وقت تو اس تباہ و برباد قافلہ کی تم ہی سردار ہو۔ میرے بعد کیا ہونے والا ہے۔ یہ بھی تم سے پوشیدہ نہیں۔ یہ وحشی درندے اس بیمار بچے کو بھی جیتا نہ چھوڑیں گے، لوٹ کھسوٹ اور بے حرمتی پر آمادہ ہیں گے۔ تم اسد اللہ کی دلیر بیٹی ہو۔ تم ان ساری بدنصیب عورتوں میں زیادہ ہمت والی ہو۔ غور سے سنو زینبؑ مرنا اتنا مشکل نہیں، جتنا میرے بعد جینا دشوار ہوگا۔ یہ تمہارے امام کا حکم ہے کہ تم زندہ رہو، اور دنیا بھر کے جور و ستم سہنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

"کاش مجھے موت آجاتی۔"

"نہیں زینبؑ، تمہاری موت میری قربانی کی موت ہوگی۔ میرے مقصد کی موت ہوگی۔ ہمارا خون اس مقتل کی ریت میں جذب ہو کر رائیگاں جائے گا۔ لوگ بھول جائیں گے کہ ہم نے کس عظیم مقصد کے لیے یہاں گردنیں کٹائی تھیں۔ زمانے کی ہوائیں ریت پر سے ہر نقش مٹا دیں گی۔ آنے والی نسلیں بے خبر اس قتل گاہ پر سے گزر جائیں گی۔ اس لیے میں چاہتا ہوں۔ تم نے جو دیکھا ہے اور آئندہ دیکھو گی، جو کچھ تم نے سہا ہے، محسوس کیا ہے اور جو اس وقت بھی تمہاری خون فشاں آنکھوں میں دہک رہا۔ بہنا اسے یاد رکھنا، ان شعلوں کو بجھنے نہ دینا۔ دیکھو زینبؑ غور سے دیکھو۔ جی بھر کے دیکھو، ان لاشوں کو جو سامنے خاک اور خون میں ملطاں انگاروں کی طرح سلگتی ریت پر پڑی ہیں۔ مجھے اپنے مظلوم امام کو دیکھو جس کا بند بند زخموں سے چور ہے، یہ خون، اس خون کو دیکھو جس میں نہایا کھڑا ہوں۔ اس میں میرے دل کا خون بھی ہے۔ ہمارے تمہارے بچوں کا لہو بھی شامل ہے۔ اس خون کی سرخی کو دیکھو۔ کیا اس خون کو رائیگاں جانے دو گی؟ زینبؑ یہ رسول خداؐ کے پیغام کا خون ہے۔ دین اسلام کی مقدس قدروں کا خون ہے۔ انصاف رواداری اور انسانی خودداری کا خون ہے۔ غور سے دیکھو۔

یہ وہی خون ہے جو بابا نے سجدے کی حالت میں بہایا تھا۔ بھولنا نہیں جانِ برادر اور دنیا کو بھی نہ بھولنے دینا کہ ان تمنا بھری معصوم آنکھوں نے شیطنت کا کیا بھیانک رقص دیکھا؟

بہن کی پھٹی پھٹی آنکھیں دیکھ کر امامؑ کا جی بھر آیا۔ بڑے پیار سے بولے۔

"کیا کروں زینبؑ کہ یہی دکھ درد تجھے بھائی تحفہ میں دے سکتا ہے۔ ویسے قلاش ہوں۔ مگر غم و اندوہ کا خزانہ قدرت نے تیرے بھائی کو جی کھول کے بخشا ہے۔ خدا ہر انسان کو تم جیسی ماں، بہن اور بیٹی عطا فرماتے۔"

"اور ہاں اتنا خیال رہے جب یہ درندے مجھے ذبح کر چکیں تو بدحواس ہو کر خیموں سے نہ نکل پڑنا۔"

"کیا فرق پڑے گا، کیا یہ ظالم ہمیں یونہی آرام سے چھوڑ دیں گے۔ اور عزت سے خیموں میں بیٹھا رہنے دیں گے؟"

"نہیں وہ تمہارے سروں سے ردائیں نوچ لیں گے؛ تمہیں شہر بہ شہر تماشا بنا کر پھرائیں گے۔ تمہیں خیموں سے گھسیٹ کر بے حرمتی کریں گے۔"

"تو پھر!"

"پھر وہ یہ تو نہ کہہ سکیں گے کہ آلِ رسولؐ تو پہلے ہی بے پردہ ہو گئی تھیں۔ دیوانہ وار منہ کھولے میدانِ جنگ میں بے حیائی سے نکل پڑی تھیں۔ ہم نے نہیں انہوں نے خود اپنے آپ کو رسوا کیا۔ یوں انہیں اپنے مظالم کے لیے ایک آڑ مل جائے گی۔ ایک بہانہ مل جائے گا۔ لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کا ایک ذریعہ ہاتھ آجائے گا۔ جنگ میں سپاہی بدحواس ہو جاتا ہے۔ پردہ دار عورتوں کو دیکھ کر جنون طاری ہو جاتا ہے۔ اس میں ان بے چاروں کا کیا قصور۔ اگر وہ بردباری سے اپنے خیموں میں بیٹھی رہتیں تو خواہ مخواہ کسی کو انہیں پریشان کرنے کا خیال بھی نہ آتا۔ لوگ اس بہانے پر یقین کر لیں گے۔ ان کی حرکتوں کو فوجی ہنگاموں کے سر تھوپ دیں گے۔ میں نہیں چاہتا وہ بے نقاب ہونے سے بچ جائیں۔ اور پھر اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی ایک موہوم سی امید ہے کہ وہ بھی رسولِ خدا کی امت میں۔ مسلمان ہیں۔ اپنے رسولؐ کے خاندان کی بہو بیٹیوں کی بے حرمتی کرتے

ہچکچا جائیں اور شاید اس طرح گناہگار ہونے کے عذاب سے بچ جائیں۔"

"آپ کو اب بھی ان ملعونوں کے بچاؤ کی فکر پڑی ہے؟" زینبؑ نے تلخی سے کہا۔

"ہاں زینبؑ، میں بھی تو انسان ہوں۔ ایک انسان کی ذلت پوری انسانیت کی ذلت ہے۔ ایک گروہ کی درندگی سے پوری نسلِ آدم پر حرف آتا ہے۔ پھر زینبؑ یہ سبھی سب ہی درندے نہیں، کچھ ایسے ہیں جو ورغلائے گئے ہیں۔ کچھ دھوکے سے یہاں لائے گئے ہیں۔ دیکھو نا، مجھے ہنستا دیکھ کر ایسے لرزتا ہیں کانپتے ہیں۔ جیسے میں ایک فلک رفتار کا تنا یا بڑھا نہیں، ملک الموت ہوں۔ ندامت اور خوف عقبیٰ سے ان کے سر جھک جاتے ہیں یہ ادھورے انسان ہیں۔ یہ بخت کھلونے ہیں۔ ان کی لگامیں مٹھی بھر شیطانوں کے ہاتھوں میں ہیں۔ انہیں جدھر چاہتے ہیں، موڑ دیتے ہیں۔ ہاں میں انہیں بچانا چاہتا ہوں ان میں اور مجھ میں یہی تو فرق ہے کہ میں نے ظلم اور زیادتی کے آگے سر نہیں جھکایا اور انہوں نے جھکا دیا ہے۔ اگر اس وقت بھی ان میں سے کوئی اپنا جھکا ہوا سر اٹھا لیتا ہے تو میری صف میں آجاتا ہے۔"

"یا خدا کتنی بدنصیب ہے یہ قوم جو میرے بھائی جیسے مدبّر اور مفکر سے فیض حاصل کرنے کے بجائے اسے ذبح کر رہی ہے۔"

زینبؑ نے سرد آہ بھری۔ امامؑ نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"یہ میری التجا بھی ہے اور حکم بھی خواہ میرا کچھ بھی انجام ہو۔ کوئی عورت خیمہ سے باہر قدم نہ نکالے۔ یہ کام میں تمہارے سپرد کرتا ہوں کہ سجادؑ کو بیماری نے مجبور کر دیا ہے۔ اچھا خدا تمہارا نگہبان تم جاؤ اندر، ذرا سکینہ کو چھاتی سے لگا لو وہ مجھے جاتا دیکھ کر کہیں ساتھ بھاگی نہ چلی آئے۔"

"میں آپ کو ذوالجناح پر سوار تو کرا دوں۔" امامؑ منع کرتے رہے۔ مگر انہوں نے ذوالجناح کی لگام تھام لی۔ بھیگی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ عباسؑ، قاسمؑ، علی اکبرؑ، جعفرؑ، عثمانؓ، حد ہے ان بچوں کی غفلت تو دیکھو اپنے آقا کی رکاب داری کی سعادت حاصل کرنے کوئی نہیں آتا۔ وہ جانتی تھیں، امامؑ بغیر سہارے کے ذوالجناح پر سوار نہ ہو پائیں گے۔

ان کے سب سہارے میدان میں سو رہے تھے۔

امامؑ نے تین دن کی پیاس سے تڑپتے ہوئے خوں چکاں ہونٹ ان کی پیشانی پر رکھ دیئے۔

زینبؑ نے ذوالجناح کی گردن میں بازو حمائل کر کے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ اور اس کے کان میں کہا۔

" ذوالجناح میرے بیرن کا خیال رکھنا" پھر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کے دوہری ہوگئیں۔ اور اندر بھاگیں۔ امامؑ حسرت سے اس لرزتے ہوئے پردہ کو دیکھتے رہے جس کے پیچھے زہرا ثانی نظروں سے اوجھل ہوگئی تھیں۔

خدا تمہارا نگہبان میری عزیزو۔" امامؑ نے زیر لب فرمایا اور گھوڑے کو ایڑ لگادی۔

ذوالجناح اپنی جگہ سے ایک چاول بھی نہ ہٹا۔

امام نے لگام کو سختی سے جنبش دی۔ گھوڑے کے حلق سے ایک گھٹی گھٹی آواز نکلی۔ اور تھوتھنی سے اپنے پچھلے پیروں کی طرف اشارے کرنے لگا۔ امامؑ نے جھک کر دیکھا تو ننھی سکینہ گھوڑے کے سموں کو تھامے سسکیاں بھر رہی تھیں۔

"کیا ہوا جان پدر؟" امامؑ گھوڑے سے اتر پڑے۔

"بابا بس صرف ایک دفعہ اور ہمیں اپنی چھاتی سے لگا لو۔"

باپ بیٹی تھوڑی دیر کے لیے جنگ و جدال کو بھول کر ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

"سکینہ بی بی ہائے لوگو میری جان سکینہ کہاں ہے۔" پھوپھی جان کی آواز آئی۔

"جاؤ میری شہزادی، تمہاری پھوپھی بلاتی ہیں۔"

امامؑ نے بچی کو بہن کی گود میں دیا۔ وہ اسے سینے سے لگائے گرتی پڑتی۔ اندر بھاگیں سجادؑ بیمار اپنے خیمے سے دیکھ کر تڑپ اٹھے۔ مگر طاقت جواب دے گئی غش کھا کر گر پڑے۔

زینبؑ بنت علیؑ نے ہر خیمہ میں جاکر سب کو ہدایات دینا شروع کیں۔ امامؑ کا حکم سنایا۔ کسی کو سینے سے لگایا کسی کو خاک سے اٹھایا۔ کبرا کو بیمار بھائی کے پاس چھوڑا۔ عباسؑ کی دلہن کو کہا کہ جاکے بازو سنبھالو۔ خود لرزتی کانپتی آواز میں آیات قرآنی

پڑھنے لگیں۔ کبریٰ بیمار بھائی کے سرہانے بیٹھی آنچل سے ہوا کر رہی تھیں۔ دوسرے ہاتھ کی سطحی میں ابھی تک سہاگ کی چوڑیوں کے ٹکڑے تھے۔ ننھا سا ہاتھ سینے پر بھینچے ہوئے نہ جانے کن یادوں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ چند قطرے خون کے ہتھیلیوں سے ٹپک کر دامن پر گرے جیسے حنا پگھل رہی ہو۔

ام رباب خیمے کے ایک کونے میں بیٹھی علی اصغر کے کرتے جھٹک کر تہہ کر رہی تھیں انہیں پہننے والا ہے، کفن مٹی تلے جا سو یا۔ کبھی آنکھوں سے لگاتیں۔ چومتیں۔ پھر یکایک ڈوبے حواس ابھر آتے۔ یاد آجاتا۔ علی اصغرؑ چلے گئے۔ ہمیشہ کے لیے گود خالی کر گئے اب اس گود میں کبھی پھول نہ مہکیں گے۔ کبھی ان کا نرم گرم لمس واپس نہ آئے گا۔

"تم چلے گئے۔ میرے لال۔ چھ مہینے میں ہی اماں سے جی بھر گیا۔ جیسے اب میرا چاند موت کے بادلوں میں چھپ گیا۔ کل رات کو تڑپتے سو گئے! سوتے نہیں بے ہوش ہو گئے۔ میری بھی پل بھر کو آنکھ لگ گئی کہ جیسے کسی نے جھنجوڑ کر جگا دیا۔ دیکھتی کیا ہوں فاطمہ زہراؑ سرہانے کھڑی آنسو بہا رہی ہیں۔ کہنے لگیں۔

اللہ کیا بے ہوشی کی نیند ہے۔ بچہ بھوکا ہے۔ دلہن بیگم اور تم سو رہی ہو؟ میں نے کہا۔

امی جان دودھ نام کو نہیں۔ ہونٹوں پہ دم ہے۔ دودھ پینے کی سکت نہیں۔"

میں نے بہت کہا مگر وہ روئے جا رہی تھیں۔۔۔۔ خیر اب تو بیٹے تمہاری پیاس بجھ گئی۔ گھٹنوں چلتے جنت کر تک پہنچ گئے۔ دادی نے پہچان لیا ہوگا۔ میرے لال اپنی دادی سے اس بدنصیب ماں کی شکایت نہ کرنا۔ وہ گودی میں بلائیں تو لپک کے چلے جانا اور ان سے کہنا ہماری اماں کو بھی بلا لیجیے۔ اب ان کا دنیا میں جی نہیں لگتا۔ تمہارا خون میں بھرا کرتا دیکھ کر انہیں بڑا صدمہ پہنچے گا۔ اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں نے تو نیا گلابی کرتا پہنا کر بھیجا تھا۔ مگر وہ تو یہی سمجھیں گی۔ اماں پھوہڑ ہے۔ اور میرے چاند گلے میں لگا تیر کا زخم چھپا لینا۔ کہیں دیکھ لیا تو بے حال ہو جائیں گی۔"

زینبؑ خالی خالی آنکھوں سے بدنصیب سجاد کو تک رہی تھیں۔ ان کا ایک

ایک لفظ تیر بن کر کلیجے کے پار ہوا جاتا تھا۔ جنگ اٹھنے والا شور و غل بھی ام رباب کی آہوں میں ڈوب گیا تھا۔ سینے سے لگی سکینہ بھی بے ہوش ہو گئی۔ ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے۔ سانس کی ڈوری کچھ یوں ہی سی چل رہی تھی۔ دل سن سے ہو گیا۔ اسے جھنجوڑنے لگیں۔

"سکینہ" بی بی، میری طرف دیکھو، آنکھیں تو کھولو۔" سکینہ نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ تب جان میں جان آئی۔

مائیں بڑی مشکل سے تھپک تھپک کر بچوں کو سلاتیں۔ پھر ان کے سوکھے ہونٹ، دھنسی ہوئی آنکھیں اور رکتی ہوئی سانس دیکھ کر طرح طرح کے وہم ستانے لگتے۔ سمجھتیں دم نکل گیا۔ جھنجوڑ کر جگا دیتیں۔ وہ رونے لگتے تو جی ٹھہر جاتا۔ اور پھر ٹہل ٹہل کر سلانے کی کوشش کرنے لگتیں۔ جاگتے تھے تو روتے تھے۔ سو جاتے تو ہول سوار ہونے لگتا۔ کبھی پنڈا ٹٹولتیں۔ کبھی کان لگا کر دل کی دھڑکنیں سنتیں۔ کبھی ڈوبتی نبضیں ٹٹولتیں۔ ایک قیامت تھی جو بدنصیب ماؤں اور بے کس بچوں پر مسلسل ٹوٹ رہی تھی۔

امام حسینؑ ابن علیؑ دشمن کی جانب بڑھ رہے تھے۔ فاطمہ زہراؑ کے نور نظر پر کیسی بلا کیش گھڑی آن پڑی تھی۔ کربلا کی زمین پیاروں کے خون میں نہا گئی تھی۔ یار دوست بھائی، بھتیجے، بھانجے، بیٹے کی گردنیں کٹائے گھوڑوں کی ٹاپوں سے کچلے پڑے تھے۔ امامؑ خون بار آنکھوں سے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ ایک طرف ظالم درندے دیوار آہنی بنے ہوئے تھے۔ ڈٹے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف روندی ہوئی انسانیت خاک و خون میں غلطاں پڑی ہے۔ کربلا کی چھاتی پر کتنے گھاؤ ہیں۔ وہ سامنے عبداللہ بن عمیر کی کچلی ہوئی لاش ہے۔ تھوڑے فاصلے پر حر بمع جوان بیٹے کے ریزہ ریزہ پڑے ہیں۔ ان سے دو قدم پر ان کے بھائی مصعب بن یزید کا لاشہ ہے۔ بزرگوں کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ بریر ہمدانیؓ رسول خدا کے عزیز دوستوں میں سے تھے۔ نہایت ضعیف تھے مگر جوانوں سے بڑھ کر داد شجاعت دی۔ انہوں نے گمراہ قوم کو کتنا سمجھانے کی کوشش کی۔

اے مومنوں کا خون بہانے والو، اے غازیان بدر کی اولاد کے ہو کے چاہنے والو!

تمہیں کس بدنصیب ماں نے جنا ہے۔ تم شیطان کی اولاد ہو۔ مگر یاد رکھو' اولادِ رسول ﷺ کا خون بہانے سے پہلے تمہیں ان کے پرستار غلاموں سے لڑنا ہوگا۔ حملہ کرو، مجھ پر کہ میں تمہیں اس ستم شعاری کا مزہ چکھاؤں۔"

ان کی شجاعت دیکھ کر دشمن کے حواس باختہ ہو گئے۔ ابن سعد نے حکم دیا کہ بڑھے شیر کو گھیر کر مار لو، چاروں طرف سے گیدڑ ٹوٹ پڑے اور شہید کر دیا۔

دریا کے گھاٹ سے چند قدم پر علم بردار ابوالفضل عباسؓ دونوں بازو کٹائے پڑے ہیں۔ وہ ایک شب کا نوشہ قاسمؓ بن حسنؓ کس شان سے سو رہا ہے۔ عونؓ و محمدؓ ایک دوسرے کی آغوش میں محو خواب ہیں۔

"امامؓ نے سینے میں سلگتی ہوئی آگ پر قابو پانے کے لیے دونوں ہاتھوں سے ذوالجناح کی ایال تھام لی۔ اور اس پر جھک گئے۔ اور ہانپنے لگے۔ دل میں ان گنت برچھیاں گھل گئیں جوان بیٹے کی لاش پر نظر پڑی تو دنیا تاریک ہو گئی۔ روح تن سے نکل جانے کو مچلنے لگی۔ ڈرتے ڈرتے ریت کے اس ننھے سے ڈھیر کو دیکھا۔ جہاں چھ ماہ کا پھول دفنایا تھا۔ اور چیخ پڑے۔

"اے رب العزت ہم کیوں زندہ رہ گئے۔ قیامت میں اور کتنی دیر ہے۔؟"

دل سے یہ صدا بلند ہوئی۔

"حسینؓ! یہ وقت امتحان ہے۔ ابھی اور مرحلوں سے گزرنا ہوگا۔"

امامؓ کی کمر غموں کے بوجھ سے جھک گئی تھی۔ ڈگمگاتے پیر بار بار رکابوں سے پھسل جاتے تھے۔ پیاس ذبح کیے دیتی تھی۔ ہر سانس ایک فولادی آرے کی طرح حلق کو چیر رہی تھیں۔ خون میں بھیگے بال رخساروں پر چپک گئے تھے۔ جو تیر کھینچنے پر بھی نہ نکل پائے تھے۔ ان کے زخم چہرے رسنے لگے تھے۔

"دشمنوں کی فوج نے جب پیمبر خدا کے نواسے کو یکہ و تنہا خیمے سے نکل کر مقتل میں آتے دیکھا تو ان پر ایک جنونی کیفیت طاری ہو گئی۔ سورج امامؓ کی پشت پر خون کے ایک ٹھہرے دھبے کی طرح دم توڑ رہا تھا۔ ظالموں کی آنکھوں میں وہ اپنی گردن کے

آخری تیر آ تا رہا انھیں اندھا کر دینے پر تُلا تھا۔ فرات کی موجیں بے بسی سے ساحل پر سر پٹخ رہی تھیں۔ تف ہے اس پانی پر جو پیاسے امام کی قدم بوسی سے محروم کر دیا گیا ہے۔ اس کے لبوں پر آہن پوش فوجوں نے تالا ڈال رکھا ہے۔

گرمی اور ریت کے بگولوں نے پتھر دل قاتلوں کی آنکھوں میں چنگاریاں جھونک دیں۔ ذوالجناح پر سوار امامؑ انھیں قہرِ الٰہی نظر آنے لگے۔ ان کا خون میں تر عمامہ فلک کی بلندیوں کو چھو رہا تھا۔ ایک نکتہ سے پھیل کر ان کا وجود ساری کائنات پر پھیل گیا تھا۔ وہ اکیلے نہیں، ان کے ساتھ ماضی، حال اور مستقبل کے سارے مظلوم ہیں۔ جن کے ہاتھوں میں بے گناہی اور معصومیت کے ہتھیار ہیں۔ جن کے خوں چکاں جسموں پر یقین کی زرہ بکتر ہیں۔ اتنی بڑی فوج سے کون لڑ سکتا ہے۔

ضعیف الاعتقاد قبائلی خوف سے تھر تھر کانپنے لگے۔ ایسا دکھائی دیا۔ جیسے میدانِ کربلا کے چپے چپے پر ملائک کا ہجوم ہے۔ رسولِ خداؐ اپنے کاندھوں پر دو بچوں کو اٹھائے ہلتے چلے آ رہے ہیں۔ ان کے سر پر فاطمہؑ زہراؑ کے مقدس آنچل سایہ ہے۔ شقی القلب پتھر موم کے کھلونوں کی طرح پگھل کر گھوڑوں سے گرنے لگے۔ ڈھالیں اندھی ہو گئیں۔ تلواریں ہاتھوں سے چھوٹ پڑیں۔ کمانیں دوہری ہو گئیں۔ اور جھنڈے خاک پر لوٹنے لگے انھیں تو دشمنانِ اسلام کو سزا دینے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ اگر پیغمبرِ خداؐ اور ان کی اولاد ہی دشمنانِ اسلام ہیں تو پھر دوست کون ہیں؟

فوج ایک دم منہ پھیر کر بھاگنے لگی۔ ابن سعد نے پکارا۔

"کہاں بھاگے جاتے ہو۔ اے امیر المومنین یزید بن معاویہ کے نمک خوارو دیکھتے نہیں یہ ضعیف انسان تین دن کا پیاسا ہے۔ جسم سے خون بہہ چکا ہے۔ اے شام کے سورماؤ، دیکھتے کیا ہو، بس اب بیڑا پار ہے۔ آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں۔ کوئی دم میں فتح کامل ہماری ہے۔"

سپاہیوں کے قدم اکھڑ چکے ہیں۔ بہرے گونگے اندھے ہو کر بھاگ رہے تھے۔ وہ رکنا چاہ رہے تھے مگر ان کے ضمیر بھاگ رہے تھے۔ ابن سعد نے حسرت سے شمر کی طرف

دیکھا - اس نے اپنے خاص دستے کو اشارہ کیا اور بھاگنے والے یا تو وہیں خاک و خون میں لوٹ گئے یا واپس پلٹ پڑے۔

"کفرانِ نعمت ہے، بزدلو، سب کئے دھرے پر پانی پھیرنا چاہتے ہو۔ واہموں میں گرفتار ہو کر زندگی بھر کی لذتوں اور آسائشوں پر ٹھوکر مار رہے ہو۔" شمر گرجنے لگا

ابن سعد شمر سے زیادہ ہوشیار تھا۔ اس نے اسی دم تھیلوں کے منہ کھول دیئے اور اشرفیاں مٹھی بھر بھر کے بھاگتی ہوئی فوج کی طرف مارنی شروع کیں۔ کچھ شمر کے خاص دستے کی مار کچھ سونے کی مار، بھاگتے قدم رک کر پلٹ آئے۔

"یہ تو کچھ بھی نہیں چھوٹا سا نمونہ ہے۔ ہمارے شہنشاہ کی دریادلی کا ہلکا سا خاکہ ہے۔ شاہی خزانہ قارون کے خزانے سے بڑھ چڑھ کے ہے۔ ہمت نہ ہارو میرے جوانو۔ اگر اس وقت چوک گئے تو اس دن کو رو گے جس دن تمہاری ماؤں نے تمہیں جنا تھا۔ دنیا کے کسی کونے میں تمہیں پناہ نہ مل پائے گی۔ تمہارے گھر بار خاک میں ملا دیئے جائیں گے۔ تمہاری بیویاں سر بازار بک جائیں گی۔ تمہاری کنواری بیٹیاں قہوہ خانوں میں ننگی نچائی جائیں گی۔"

سونا چن کر فوجی واپس مڑ گئے۔ مگر تلواروں پر ہاتھ نہ ڈالے۔ دھمکیاں اور ملامتیں روز کا معمول بن گئی تھیں۔ ڈھٹائی سے لاو کر اشرفیاں جیبوں میں بھر لیں اور کہنے لگے۔

"اتنی بڑی فوج کا کون مائی کا لال مقابلہ کر سکتا ہے؟"

"اندھو، خر دماغو، کہاں ہے اتنی بڑی فوج۔ حسینؑ کی مٹھی بھر فوج تو کبھی کی ختم ہو چکی۔ آنکھیں کھول کر دیکھو، سب تمہارا وہم ہے۔ غیب پر ایمان تمہیں فریب دے کر تماشے دکھا رہا ہے۔ یہ شخص جو مریل سے گھوڑے پر سوار چلا آ رہا ہے۔ اکیلا ضعیف اور غم کا مارا سا ہے۔"

سپاہیوں نے آنکھیں مل کر غور سے دیکھا۔ امامؑ اکیلے تھے!

ایک دم طبل گرجنے لگے۔ بجلیاں سی کڑکنے لگیں۔ ہاتھ تلواروں کے دستوں کی طرف بڑھے۔ گرتے ہوئے نشان اٹھائے گئے۔ بھاگتے بدکتے بے لگام گھوڑوں پر

ہنٹر برسنے لگے۔ ڈھالوں کی قطاریں پھر سے سجنے لگیں۔ نیزہ برداروں اور برچھی برداروں کی صفیں جمنے لگیں۔

امامؑ نے مردے میں جان پڑتے دیکھ کر اندازہ لگایا کہ وقتی دہشت کا افسوں ٹوٹ گیا۔ سونے کے بوجھ تلے انسانوں کے ضمیر نے دم توڑ دیا۔ انہوں نے ذوالجناح کو آگے بڑھایا۔ اور آخری بار سمجھانے کی کوشش کی۔

"شامیو! اپنی ہتھیلیوں پر نظر ڈالو، کیا سادات کے خون کی حنا بندی کافی نہیں بخدا مجھے اپنی جان کی مطلق پرواہ نہیں۔ میں اپنے آپ کو زندوں میں شمار نہیں کرتا۔ مگر تم چاہو تو اب بھی میرے خون کے بوجھ سے اپنی گردنیں بچا سکتے ہو۔ جاؤ پلٹ جاؤ۔ اپنے بیوی بچوں کے پاس۔ میں نے تمہیں معاف کیا۔ اپنے نانا کی قبر پر مجاوری کر کے زندگی کے باقی دن بھی گزار دوں گا۔ حاشا مجھے اپنی فکر نہیں۔ میرے پاس اب جینے کو کچھ باقی نہیں بچا ہے۔ مگر تم نے اگر مجھے قتل کر دیا۔ تو تم بھی مر جاؤ گے، تمہارا ضمیر مر جائیگا روح مسخ ہو جائے گی۔ تم اور تمہاری آل اولاد دنیا کے کسی کونے میں سکون قلب نہ حاصل کر سکے گی۔ اس اخلاقی موت سے ڈرو کہ اس کے سامنے جسمانی موت بے حقیقت ہے۔"

ابن سعد خوف زدہ ہو گیا کہ سارے کئے دھرے پر پانی پھرا جاتا ہے۔ امام کے الفاظ پھر بنا بنایا کام بگاڑ دیں گے۔ اس نے گلا پھاڑ کر چلاّیا۔

"مت سنو، اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لو۔ حسین جادوگر ہیں۔ ان کے بیان کا جادو سم قاتل ہے۔ سنو گے تو راستہ بھول جاؤ گے۔" پھر امامؑ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "آپ بھی اتنا گدھا سمجھتے ہیں۔ ہم آپ سے مخاطب شرطیں بانٹنے نہیں آئے۔ حاکم کا حکم ہے کہ آپ سے بیعت لی جائے۔ اور اگر آپ اس پر تیار نہ ہوں تو آپ کا سر کاٹ کر خلیفۂ وقت کے حضور میں پیش کیا جائے۔"

"احمق، کیا اب بھی تجھے یہ گمان ہے کہ میں بیعت کر لوں گا۔ جب اتنے عزیزوں اور پیاروں کے سر خاک میں مل گئے۔ تو ایک میرے سب کر کی میرے دل میں کیا حقیقت ہے؟ اے شامیو! کیا اتنے قتل و غارت کے بعد بھی تمہارا جی نہیں بھرا۔؟ کیا اب بھی تمہاری

پیاس نہیں بجھی! تم اگر چاہو تو اب بھی میرے ہوسے بار سے اپنی گردنیں بچا سکتے ہو۔ مجھے اپنی نہیں اپنے نانا کی امت کی فکر ہے۔ انہوں نے جو کچھ میرے ساتھ کیا۔ اس کے باوجود میری ذمہ داری میرا ورثہ یہی تلقین کرتا ہے کہ میں تمہاری گمراہی کا باعث نہ بنوں۔ اے سادہ لوح انسانو! مجھے قتل کر کے تم بھی مر جاؤ گے۔ پھر تم اور تمہاری آل اولاد کبھی دنیا کے سامنے نہ سر اٹھا سکے گی۔ اس اخلاقی موت سے ڈرو کہ وہ جسمانی موت سے بدرجہا بھیانک ہے۔ اب تک وقت ہے تم اپنے دامن میرے ہو سے بچا سکتے ہو۔"

امامؑ کے الفاظ سن کر پھر فوج کے ارادے ڈگمگانے لگے۔ ابن سعد بری طرح بوکھلا کر چیخنے لگا۔

"کان بند کر لو میرے دلیرو! حسین ابن علیؑ کی باتوں کا جادو تمہیں لے ڈوبے گا۔ اگر یہ زہر تمہارے کانوں کے راستے دل میں اتر گیا۔ تو تم پھر کہیں کے نہ رہو گے۔ امامؑ کی موت ہی تمہاری زندگی ہے۔ امامؑ کا سر لیے بغیر تم خالی ہاتھ گئے تو تمہارا کیا حشر ہوگا۔ ہمارا حاکم وہ قاہر و جابر ہے جس کے ہاتھ مبت لیے ہیں۔ تم بچ کر دنیا کے کسی کونے میں منہ نہ چھپا سکو گے۔ اس وقت اگر ہمت ہار گئے۔ تو اگلی پچھلی پشتہا پشت کی بہادری کو کالک لگ جائیگی۔ اور اگر حسین کا سر جیت لیا تو بس پھر وارے نیارے ہیں۔ ملک عرب کی نعمتیں تمہارے قدموں پر نثار ہوں گی۔" فوج میں تذبذب اور ہراس پھیل گیا۔ سپاہی قیدیوں کی طرح تلملانے لگے۔ بیوی بچوں کی صورتیں آنکھوں میں پھر گئیں۔ دیوانوں کی طرح اپنے ہی ہتھیاروں سے اپنے تن پیٹنے لگے۔ ابن سعد نے امام حسینؑ کو مخاطب کر کے کہا۔

"آپ ہمیں الو بناتے ہیں۔ اس ایک سر کے لیے تو سارا ہنگامہ ہے۔ حضور یہی ایک سر تو ہمارے لیے جلیل القدر بادشاہ کو چاہیئے۔ آپ نے بیکار اپنے پیاروں کی قربانی دی۔ بغیر آپ کے سر کے یہ تمام سر بیکار ہوں گے۔"

پھر شامیوں کو للکارا۔

"دیکھتے کیا ہو میرے دلیرو! منزل پر پہنچ کر ہمت نہ ہارو، بڑھ کر اٹھا لو گے۔"

"میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ تمہیں عذاب دوزخ اور زمین و آسمان کی سزا سے بچانے کی

ہر ممکن کوشش کر لی۔ اگر تمہیں میرا سر ہی چاہیئے تو یوں آسانی سے نہ پا سکو گے۔ تمہیں یہی منظور ہے تو یہی سہی۔ تم میں سے کون آتا ہے میرے مقابلے میں؟" امامؑ نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا اور جھک کر ذوالجناح کو تھپتھپایا۔

"دوست وقت سر پہ آ گیا۔"

شمر اور ابن سعد سمجھ رہے تھے۔ خیر تھک چکا ہے۔ دو چار تازہ پہلوانوں سے زیادہ کیا جھیل سکے گا۔ مگر جب شمر سوار پر شہ سوار کٹنے لگے تو ہوش گم ہو گئے۔ حسین ابن علیؑ نے فن سپہ گری کا وہ اچھوتا نمونہ پیش کیا کہ دشمن مسحور ہو گئے۔ جوان سے پہلے شہید ہوئے تھے۔ وہ تو اس آفتاب عالم کے سامنے تارے تھے۔ حسینؑ کی تلوار تھی کہ قہر بے اماں کھلی! سر پہ نرت کی صورت گرتی۔ پیروں تک اتر جاتی۔ قہر و غضب کا ایک سندی تھی جس کا کرتا اور تھانہ چھوڑ، تلوار تھی کہ قہر خدا' ایسا تلاطم تو کبھی دریائے نیل کی موجوں نے بھی نہ برپا کیا ہوگا تند خو بیت طناز کی طرح سر پہ کاٹتی' جھلاتی۔ جھکا چوند پیدا کرتی۔ کبھی ناز سے بل کھاتی۔ لاشوں سے رن کی زمین کو پاٹتی صاف نکل جاتی۔ دشمن کا خون چاٹ کے اور بھی دلیر ہو گئی۔ دھار کند پڑنے کے بجائے اور بھی اس پہ سان دھر گئی۔ اس کی چمک دمک سے سورج کی آنکھ چکا چوند ہونے لگی۔ جتنا خون پیتی اور پیاس بڑھتی جاتی۔ ایک برق تھی جو ایک ہی وقت میں ہم چہار سو برس رہی تھی۔

شامیوں کی پتھرائی ہوئی آنکھیں معجزے دکھا رہی تھیں۔

"یہ حسینؑ نہیں۔ یہ تو فاتح خیبر ہیں۔ شیر خدا بذات خود ذوالجناح پہ سوار ہیں بھاگو اپنے دین و دنیا کو پیار ہے بھاگو۔"

فوج میں ایک بھگدڑ مچ گئی۔ شمر نے اپنے خاص دستے کو روک دیا کہ جائیں تو کہاں جائیں گے بھاگ کر۔"

"بھاگتے گیدڑوں پر وار کرنا فن سپہ گری کی توہین ہے۔" امامؑ نے ذوالجناح کی لگام کھینچ لی۔ اور ذرا سستانے کے لیے رک گئے۔ فوج ہٹتی رہی۔ اور دور چلی گئی۔ امامؑ ذوالجناح کی پشت پر سر جھکائے ہانپتے رہے۔

اچانک اس وقت ایک درویش صورت مسافر اس طرف سے گزرا۔ اس نے یزیدیوں کی فوج کو ایک تن تنہا سوار کی دہشت سے گھبرا کر بھاگتے دیکھا۔ اور پھر اس سوار کی خون لگی ہوئی تلوار کو دیکھ کر بڑا غصہ آیا۔

"یہ کوئی جادوگر ہے کہ اس کے سامنے تمام انسانی طاقتیں معطل اور سرنگوں ہیں۔ اپنی غیبی طاقت سے بے گناہوں کی لاشوں کے ڈھیر لگا دیئے گئے ہیں۔" اور دلیری سے آگے بڑھا اور بولا۔

"اے شخص تو کس اقلیم کا جادوگر ہے۔ ان معصوموں نے تیرا کیا بگاڑا تھا۔ جو تو نے انہیں گاجر مولی کی طرح کاٹ ڈالا ہے۔ حیف صد حیف تو نے بچوں پر بھی رحم نہ کھایا۔ حسن و جوانی کے نوخیز پودوں پر بھی ترس نہ آیا۔ تو مسلمان نہیں معلوم پڑتا ورنہ لاش کے لاش کاٹ کر ڈھیر نہ کرتا۔ اسلام سختی سے اس حیوانیت کو منع کرتا ہے۔ چاہے تو مجھے اپنے سحر کے زور سے خاک میں ملا دے۔ مگر میں اتنا ضرور کہوں گا کہ تجھ جیسا شقی القلب اور ظالم انسان میری نظر سے نہیں گزرا۔"

امام حسینؑ نے انجان درویش کو خون بار آنکھوں سے دیکھا۔ ایک تلخ مسکراہٹ ہونٹوں پر کانپی اور سر جھک گیا۔ وہ شخص سمجھا شاید اس کے پرجوش الزامات نے پتھر کو پگھلا دیا۔ بولا۔

اللہ کا شکر ہے کہ تجھے اپنے گناہوں پر ندامت ہے۔ شاید خدا تیرے گناہوں کو معاف کر دے۔ چاہے تو مجھے بھی موت کے گھاٹ اتار دے مگر اتنا بتا دے ان بے گناہوں کے خون سے اس ریگستان کو سیراب کر کے تجھے کیا ملا۔ للہ بتا دے تو کس مذہب کا پیرو ہے۔ جو بچوں کے قتل عام کا حکم دیتا ہے۔

امام حسینؑ پھر مسکرائے۔

"اے اجنبی تو بڑے سخت مغالطے میں ہے۔ یہ بچے، یہ کمسن میرے عزیز اور پیارے ہیں۔ جو تین دن کی بھوک اور پیاس کی حالت میں قتل ہوئے۔ میں مسلمان ہوں۔ اور وہ جنہوں نے ان معصوموں کو ذبح کیا ہے۔ اہل اسلام ہی ہیں۔ اے نادان! اگر میں جادوگر ہوتا تو میرے ہاتھوں میں میرا چھ ماہ کا بچہ حلق میں تیر کھا کر دم نہ توڑتا۔ اپنی جادوگری کا اظہار ضرور کرتا کم از کم تڑپتے بچے کے حلق میں دو بوند پانی ٹپکا دیتا۔ اگر یہ سمجھتے جگر و جگر داروں کی فوج، یہ نہر کے پانی پر پہرہ بٹھانے والے

سپاہی مظلوم ہیں۔ اور میں تین دن کا پیاسا ظالم ہوں تو یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔"

"یا خدا! یہ میں کیا سن رہا ہوں، معاف کرنا بھائی، میں یہاں اجنبی ہوں۔ اللہ جانے کیا ماجرا ہے، سامنے دریا موجیں مار رہا ہے اور تم پیاسے ہو؟ تم کون ہو؟"

"میرے پاس کافی پانی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے چھاگل سے ٹھنڈا ٹھنڈا پانی کٹورے میں بھرا۔ "لو پیو۔ میں دریا سے پھر چھاگل بھر لوں گا۔"

امامؑ نے لرزتے ہاتھوں سے پانی کا چھلکتا ہوا کٹورا تھاما، پانی کی مہک سے تن بدن میں برق سی کوند گئی۔ کانٹوں دار خشک زبان ہونٹوں پر آ گئی۔ دم کھینچ کر آنکھوں میں آ گیا۔ امامؑ نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کٹورا لبوں تک اٹھایا۔ پینے سے پہلے نظر چاروں طرف گھوم گئی کربلا کی ریت کی ریت میں پیاسے شہیدوں کا خون شعلوں کی طرح بھڑک اٹھا۔ علی اصغرؑ کی ننھی سی نامراد قبر پر ریت کے بگولے لگے۔ امامؑ نے آنکھیں بند کر لیں۔ پانی کربلا کی جلتی جلتی ریت کے سینے پر انڈیل دیا۔

"حیف صد حیف، میرے معصوم پیاسے، ذبح ہوئے۔ یہ پانی میرے حلق میں جنگل ہوتا آگ ہے؟" اجنبی درویش تھر تھر کانپنے لگا۔

"اللہ مجھ پر رحم فرمائے۔ بتائیے آپ کون ہیں بیگانے تو نہیں کہ آپ کا چہرہ اکثر سجدوں میں نظر آیا۔ دل جان رہا ہے۔ مگر دماغ پہچاننے سے قطعی معذور ہے۔"

امامؑ اس سے یہ تو نہ کہہ سکے کہ میں رسول خدا کا پیارا نواسہ، شیر خداؑ کا فرزند اور فاطمہ زہراؑ کا لال ہوں۔ بڑی انکساری سے سر جھکا کر بولے۔

"میں حسینؑ ہوں۔"

"حسینؑ" "کون حسینؑ"؟

"حسینؑ ابن علیؑ ابن ابی طالب۔"

"حسینؑ ابن علیؑ۔ یا امامؑ اللہ مجھ پر رحم کرے۔" درویش پر ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی۔ قدموں سے لپٹ کر رونے لگا۔ "اے میرے آقا! غلام کی خطا معاف۔ میں نے کیسے کفر کے کلمے اس منحوس زبان سے نکالے۔ میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے۔ رحم کیجیے مولا۔"

"تمہارا قصور نہیں میرے بھائی۔ آج حسین ابن علیؑ کو کوئی نہیں پہچان رہا ہے۔ سب نے آنکھیں پھیر لی ہیں۔ ایک آہنی پردہ ہے جو مسلمان کی عقل پر پڑ گیا ہے۔ تمہارا سفر تھوڑا ہوتا ہے اپنی راہ پکڑو۔ ہمارے دشمن بھی بہت سستا لیے۔ بس اب کوئی دم میں پھر حملہ ہو گا۔ وہ دیکھو سپاہی کھا پی کر منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہو گئے۔ صفیں دوبارہ مرتب ہو رہی ہیں۔"

"آقا! مجھے جان نثاری کا مرتبہ عطا فرمایئے۔"

"نہیں میرے عزیز تو دوست بھی حسینؑ کے بچ رہے ہیں۔ وہی غنیمت ہے۔ میں تمہاری قربانی کے احسان کا بار نہ اٹھا سکوں گا! جاؤ بھائی کیوں اپنی جان کھوتے ہو۔"

مگر وہ درویش قدموں پر لوٹنے لگا۔

"میں ایسی دنیا میں کیسے رہوں گا۔ جہاں حسینؑ جیسے انسان قتل ہوتے ہیں۔ ان کے بچے ذبح ہوتے ہیں۔ خود اہل اسلام کے ہاتھوں بانیِ اسلام کا خاندان تہ تیغ ہوتا ہے۔ نہیں میرے آقا میں جی کر کیا کروں گا۔ اگر آپ نے اجازت نہ دی تو میں آپ کے قدموں پر سر پٹخ کر جان دے دوں گا۔"

بمشکل امام نے اسے اٹھا کر سینے سے لگایا، پیشانی پر بوسہ دیا۔

"جاؤ بھائی تمہیں روکنے کا بھی مجھے حق نہیں۔ یہ جنگ حق پرستوں کی جنگ ہے۔ اور تم بھی اپنے یقین کے لیے جہاد کا حق رکھتے ہو۔"

درویش دشمن کی فوج پر یکایک قیامت بن کر ٹوٹ پڑا۔ سر کٹ کٹ کر گرنے لگے۔ لوگ آپس میں بات چیت ہنسی مذاق میں لگے تھے۔ جلدی کیا ہے اطمینان سے امام کو قتل کر دیں گے۔ یہ بلائے ناگہانی جو نازل ہوئی تو ان کے حواس گم ہونے لگے۔ صفیں ریزہ ریزہ ہو گئیں اور بھگدڑ مچ گئی۔

مگر کہاں تک آخر کار دشمن کے حواس بجا ہوئے۔ اکیلے کو گھیر لیا۔ امامؑ اس کی مدد کو تیزی سے صفیں پامال کرتے بڑھے۔ ذوالجناح کو بھی جلال آ گیا۔ وہ اپنے مالک کا حصۂ جسم بن گیا تھا۔ امامؑ کے ہر خیال کے ساتھ جنبش کر رہا تھا۔ اسے جیسے وقت کی نزاکت کا اندازہ ہو گیا تھا۔

امامؑ کے اس اچانک حملے سے فوجوں میں بھگدڑ سی پھیل گئی۔ شمر مع اپنے خاص دستے کے

موذی جاگ کر تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس نے بڑی شفقت اور نرمی سے اپنے جلادوں کے کان بھرنا شروع کیے۔

"دوستو! اس سے ہی ایک موقع ہے۔ اگر حسینؑ پر پشت سے حملہ کر دیا جائے تو بیڑا پار ہے۔ چاروں طرف سے گھر جائیں گے۔ تڑپ بس ہو جائیں گے۔ پھر میرے جیالو! ہفت اقلیم کی بادشاہت تمہارے ہاتھ ہے۔ پشت ہا پشت کے لیے زر و جواہر کے خزانے تم پر کھل جائیں گے۔ حاکم تمہارے ممنونِ احسان ہوں گے۔ امام کا سر لے لو، عاقبت سنور جائے گی۔ اگر تمہارے بجائے کسی اور دستے نے سبقت حاصل کر لی تو منہ دیکھتے رہ جاؤ گے۔ بس میرے سورماؤ، انشاء اللہ حسینؑ کا سر کاٹ کر نمازِ عصر ادا کریں گے۔"

ایک دم غول بیابانی پر شیطنت غالب ہو گئی۔ چاروں طرف سے گیدڑوں نے زخموں سے چور چور شیر کو نرغے میں لے لیا۔

سیاہ ریت کے بگولے چکر کھانے لگے۔ میدانِ کربلا حشر کا میدان بن گیا۔ تیروں کی بارش ہونے لگی۔ کسی بے رحم نے ایسا تلوار کا ہاتھ مارا کہ حسینؑ کے عمامے کے پیچ کٹ گئے۔ انہوں نے جھک کر ذوالجناح کی گردن پر سر ٹکا دیا۔ پیروں سے رکابیں پھسل گئیں۔ ذوالجناح جس کر سدھائے مالک کو خاک و خون سے نکالنے کے لیے بے تاب تھا۔ اپنی ٹاپوں سے گرز کا کام لے رہا تھا۔ ابوالمزن نے ایسا تاک کر تیر مارا جو ٹھیک اس مقام پر پیوست ہو گیا جہاں رسولِ خداؐ گردنِ حسینؑ کے بوسے لیا کرتے تھے۔ کربلا کی زمین لرز گئی۔ سورج کا چہرہ سیاہ ہو گیا۔ فرات کی موجیں لال انگارہ ہو کر سر پٹخنے لگیں۔ امام حسین ابنِ علیؑ زمین پر گر پڑے۔

امامؑ کے گرتے ہی بجائے فوج کا دل بڑھنے کے اس پر پھر انتہائی ہیبت طاری ہو گئی۔ سپاہی اندھوں کی طرح ایک دوسرے کو کاٹتے کچلتے عفریتوں کی طرح بھاگے۔ اُن کے منہ سے غیر انسانی چیخیں نکل رہی تھیں۔ چہرے پھٹکار زدہ اور نیلے ہو گئے تھے۔ شیطانی قہقہے ان کے منصب میں لپک رہے۔ ریت ان کے حلق، آنکھوں اور نتھنوں میں بھوبل بن کر سلگ رہی تھی۔ کسی کو تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔ بس بھاگ رہے تھے کہاں، کدھر یہ کسی کو پتہ نہ تھا۔ ابن سعد چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ اس کا عمامہ گلے میں جھول رہا تھا۔ سر کے بال کھڑے

ہو گئے تھے۔ گھڑی بھر میں میدان خالی ہو گیا۔ امامؑ گرم ریت پر گر کے بے ہوش پڑے تھے۔ ذوالجناح ان کے خون پر اپنی پیشانی رگڑ رہا تھا۔ انسان کے ظلم کے آگے حیوان کتنا مجبور اور بے بس ہو جاتا ہے۔

"ذوالجناح اپنے بھیا کو تمہارے سپرد کرتی ہوں، انھیں تم سے زندہ، سلامت واپس لوں گی۔" بدنصیب بہن نے کہا تھا۔

امامؑ نے غش سے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ حیرت بھی تھی اور جھنجھلاہٹ بھی۔ اب کیوں زندہ ہیں؟ اب کیا کچھ اور سہنا باقی ہے۔ تقدیر کے ترکش میں کیا ابھی کچھ اور تیر باقی ہیں۔ شاید قید و سلاسل، کوفہ اور شام کی دشت پیمائی۔ ان ظالموں سے قطعی رحم اور مروت کی امید نہیں۔ کیا یہ پارہ پارہ جسم ابھی اور گھسیٹا جائے گا۔ بڑی مشکل سے کہنی کے سہارے اٹھے گھسٹ گھسٹ کر ایک پیڑ کے تنے سے ٹیک لگا کر ہانپنے لگے۔

کہاں گئے بہادر سورما، کیا انھیں اس جاں کنی کی حالت میں چھوڑ دیں گے۔ موت خود بخود نہ آئی تو اور کتنی دیر سسکنا ہوگا۔ نیک بخت گلا کیوں نہیں کاٹتے۔ کیا یہ خون کی بوند بوند ریت میں رستی رہے گی۔ اور کوئی بھی از راہ کرم اس جاں کنی کی اذیت سے خلاصی نہ دلائے گا۔ گھسٹ کر خیمے کے پاس تو نہیں جا سکتے۔ معرکے کے ہنگامے میں دور نکل آئے اور راہ میں ریت کے ٹیلے حائل ہیں۔ مگر دور خیمہ کا در دھندلا دھندلا نظر آ رہا ہے۔ عورتیں اور سہمے ہوئے ڈری نگاہوں سے امام کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ کیا قید کر لیے گئے۔ لاشوں کے انبار میں تو نظر نہیں آتے۔ ذوالجناح سر جھکائے کیوں کھڑا ہے۔

امامؑ نیچے جھک گئے۔ اگر بچوں اور عورتوں نے دیکھ لیا تو بھاگتے چلے آئیں گے۔ دل پر قابو نہ رہے گا۔ اور امام کے حکم کی سرتابی کر بیٹھیں گے۔

فخر اور غرور سے امام کے خون آلود خشک ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ کتنی پیاری اور فرماں بردار ہے ان کی یہ ننھے بچوں اور بیوہ عورتوں کی فوج، ایک زخموں سے چور زمین بوس سپہ سالار کا حکم آج ان کے لیے خدا کے حکم سے کم نہیں۔

دشمن کی فوج کے ابھی تک حواس بحال نہ تھے۔ انھیں اپنے جرم کا احساس بدحال کیے ہوئے

تھا۔ شمر نے کہا۔

"جلدی کیا ہے۔ تم لوگ بہت تھک گئے ہو۔ منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہو جاؤ۔ اطمینان سے سر کاٹ لیں گے۔ اب حسینؑ میں اتنا تو دم ہے نہیں کہ فرار ہو جائیں۔"

اتفاق سے اس وقت اُدھر سے ایک مسافر کا گزر ہوا۔ دریا پر پانی پینے کے لیے جھکا تو پانی کی سرخی دیکھ کر خوف سے پیچھے ہٹ گیا۔ چاروں طرف نظر دوڑائی تو کشت و خون کا میدان نظر آیا۔ لاشوں کے ڈھیر تھے۔ اور فوج کافی فاصلے پر آرام کر رہی تھی سامنے ایک لاش میں کچھ جان نظر آئی۔ غور سے دیکھا تو اس لاش نے آنکھیں کھول دیں۔ پیڑ کے تنے سے ٹیک لگا کر ایک ضعیف انسان بیٹھا موت کا انتظار کر رہا ہے مسافر جلدی سے لپک کر قریب آیا۔

اے برادر یہ کیا قصہ ہے۔ یہ کیسی جنگ ہے۔ کون کس کے خلاف لڑ رہا ہے۔ ایک فوج تو ادھر پڑی ہے۔ دوسری فوج کدھر بھاگ گئی! عجیب چکر ہے۔ عقل کام نہیں کرتی"

"دوسری فوج میں ہوں" امامؑ نے تلخی سے کہا۔

"وہاں میں اکیلا ہی رہ گیا ہوں۔ میرے بہتّر سو رہے ہیں۔ اب میں اکیلا ہوں"

"یہ کیسی جنگ تھی۔ اُدھر اتنے اور ادھر صرف بہتّر۔"

"بس کچھ ایسی ہی جنگ تھی۔ تم نئے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ کچھ آگے پیچھے کی خبر نہیں۔"

"میں بہت عرصے سے ملک کے باہر تھا۔ تھوڑے دن ہوئے مدینے سے لوٹا ہوں" ہے

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ہر طرف خاموشی ہے۔ اور خوف و دہشت سے کوئی نہ کچھ بتاتا اور سنتا ہے"

"ادھر کیسے آنا ہوا؟"

"مجبوراً آیا ہوں۔ عجیب دل سوز قصہ ہے۔ ادھر آنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ مگر ایک معصوم بچی کی خاطر آیا ہوں"

"بچی؟" امامؑ نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"عجیب حیران نصیب بچی ہے۔ دیکھ کر میرا کلیجہ کٹ گیا۔ میرا جب بھی ادھر سے گزر ہوا میں نے ایک زرد رو بیمار بچی کو دروازے پر کھڑا پایا۔ وہ ہر آنے جانے والے مسافر سے پوچھتی

"اے مسافر اگر تم کوفہ کی طرف جا رہے ہو۔ تو میرا ایک خط میرے بابا کے پاس پہنچا دو بڑا ثواب پاؤ گے۔ جب سے میرے بابا گئے ہیں منتظر ہوں۔ لکھا ہے ذرا کوئی میری خبر لے۔ میں نے کہا بچی کوفہ میری منزل تو نہیں پھر بھی میں کاروبار کے سلسلے میں جا رہا ہوں تمہارا خط پہنچا دونگا۔ اس نے اسی دم آنچل سے ایک خط کھول کے مجھے تھما دیا۔ آپ کو یہ سن کر بڑی حیرت ہوگی کہ وہ ہمارے پیغمبر کے نواسے حضرت امام حسینؑ ابن علیؓ ابن ابی طالب کی بیمار بچی صغرا ہے۔"

"صغرا!" امامؑ کے زخموں کے منہ کھل گئے۔ معصوم بچوں کی طرح پھوٹ کر رونے لگے

"یہ معلوم ہوتے ہی میں بے قرار ہو گیا۔ میں نے کہا میں تمام کام چھوڑ کر اسی وقت جاؤں گا۔ بس دل میں دو ہی تو ارمان ہیں۔ ایک تو یہ کہ مزار پیغمبر پر سجدہ ریز ہونے کی سعادت نصیب ہو دوسرے اُن کی آخری نشانی ان کے نواسے حسینؑ کی قدم بوسی حاصل کروں۔"

"صغرا، میری بیمار بچی۔ اے مسافر اگر تم اس خط کو لائے ہو تو جلدی کرو میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ دوست میں ہی اس بدنصیب بچی کا باپ ہوں۔ جلدی کرو دشمن کی فوج میں صف بندی شروع ہو رہی ہے۔ اب میرا سر کاٹنے کے سامان ہوں گے۔"

"آپ، آپ حسینؑ ابن علیؓ ہیں؟ یا میرے آقا، یہ میں کیا سن رہا ہوں، یہ کیا دیکھ رہا ہوں یہ آپ کا خط حاضر ہے۔ آپ مجھے اجازت دیجئے کہ میں جا کر ان ملعونوں کو کیفر کردار کو پہنچا دوں۔"

"نہیں برادر تمہاری جان کی قربانی سے اب کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"آقا خدا کے واسطے مجھے اس سعادت سے محروم نہ کیجئے۔ آپ پر یہ ستم ٹوٹے اور میں دیکھتا رہوں۔ مولا۔"

"یہ جو میرے قتل کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ جنہوں نے میرے جوان بھائی، بھتیجے، بیٹے میری آنکھوں کے سامنے ذبح کئے۔ میرے شیرخوار چھ ماہ کے بیٹے کو پیاسا شہید کیا یہ بھی خدا کے فضل سے مسلمان ہیں۔"

"خدا انہیں غارت کرے ان کا بیج دنیا سے فنا ہو جائے۔ یہ اسلام کے نام کو ملامت میں گھسیٹنے والے آپ کے نانا کی اُمت نہیں، یہ شیطان کی اولاد ہیں۔ آپ کو رسول اللہ کا واسطہ

میرا المومنین شیر خدا کا صدقہ مجھے اجازت دیجئے کہ اب یہ سر میرے کندھوں پر بار ہو رہا ہے۔ مسافر تلوار کھینچ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر امامؑ نے اس کا دامن تھام لیا۔

"تم نے مجھے اپنا امام مانا ہے تو میرا حکم بجا لاؤ جس طرح بھی ہو سکے یہاں سے جان بچا کر نکل جاؤ۔ تمہارا بھی کوئی انتظار کر رہا ہے اس کا دل نہ توڑو۔"

"یا امامؑ آپ نے کیسے جان لیا کہ میری بن ماں کی اکلوتی بچی میری واپسی کی گھڑیاں گن رہی ہے" دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ میں نے بھی اپنی بچی کی جدائی کا غم جھیلا ہے۔ ٹھیرو ذرا مجھے اپنی بچی کا خط پڑھ لینے دو۔"

صغرا کے آنسوؤں سے تر خط میں لکھا تھا۔

میرے پیارے بابا۔ آپ کی صغرا کے تن میں سانس آتی جاتی ہے۔ آپ اسے بھول گئے مگر وہ آپ کی یاد میں پہروں روتی ہے۔ آپ کے نام تسبیح پڑھتی ہے کہ کربلا کے بہادروں نے ایک لب گور بچی کی یاد اپنے دلوں سے محو کر دی۔ مگر وہ صبح سے شام تک دروازے پر کھڑی ہر آنے جانے والے سے بچھڑ جانے والوں کا پتہ پوچھتی ہے۔ میں نے کون سا قصور کیا تھا بابا جو اپنی خیریت کے دو لفظ نہ لکھے۔ نہ مجھے وہاں بلایا۔ آپ سمجھ رہے ہوں گے صغرا مر گئی ہوگی۔ بابا میں ابھی زندہ ہوں۔ للہ مجھے اپنے پاس بلاؤ نہیں تو رو رو کر میں اندھی ہو جاؤں گی۔ سب سمجھاتے ہیں۔ مگر میں ہر دم آنسو بہاتی ہوں۔ عباسؑ چچا تو اپنی لاڈلی سکینہ کے سوا کسی کو گردانتے بھی نہیں ان کی بلا سے صغرا مرے یا جئے۔ مگر حیف ہے اکبر بھائی کو بھی نصیبوں جلی بہن کی یاد نہ آئی ان کی شادی بھی ہو گئی ہو تو للہ مجھے بلا بھیجئے نہیں تو میں جان دے دوں گی۔ اصغر تو اب ماشاء اللہ گھٹنوں چلتے ہوں گے۔ ہمیں دیکھیں گے تو پہچانیں گے بھی نہیں۔ قاسم بھائی اپنی دلہن کی خاطروں میں لگے ہوں گے۔ انھیں ہم کیوں یاد آنے لگے۔ بابا! اپنی صغرا پر رحم کیجئے۔ بلا لیجئے!

خط پڑھ کر امامؑ کی ہچکی بندھ گئی۔ مسافر نے کہا۔

"سنو میرے بھائی۔ مجھے تمہاری زندگی بڑی پیاری ہے تاکہ تم میرا پیغام میری بچی تک پہنچا دو۔ میرا اتنا کام کر دو، بڑا ثواب ہوگا۔ جا کر اس بچی کو تسلی دینا اور کہنا، جان پدر

جو کچھ تیرے بدنصیب باپ نے دیکھا خدا دشمن کو نہ دکھائے۔ تو دیکھتی تو تیرا ننھا سا کلیجہ پھٹ جاتا دل پارہ پارہ ہو جاتا۔ تیرے بھائی علی اکبر ہم سے روٹھ گئے۔ وہ سامنے ان کی جوان لاش پڑی ہے سینے سے گھاؤ چھپانے کے لیے ہاتھ رکھ لیا ہے۔ علی اصغر کی قبر دو قدم پر ہے۔ ہم نے ان خون آلودہ ہاتھوں سے انہیں سپرد خاک لیا ہے۔ علی اصغر کی قبر دو قدم پر ہے۔ ہم نے ان خون آلودہ ہاتھوں سے انہیں سپرد خاک کیا ہے۔ تین دن کی پیاس میں حلق میں تین پھل کا تیر لگا تھا دیکھو ہماری داڑھی انہیں کے لہو سے تو گلزار ہو رہی ہے۔ عباسؑ نے دو بوند پانی کی خاطر دونوں بازو کٹائے۔ میری بچی تو دیکھتی تو غم سے پاگل ہو جاتی۔ اگر تو قاسم کی گھوڑے سے کچلی ہوئی لاش دیکھتی تو تیرا کیا حال ہوتا۔ انہوں نے سہرا باندھا اور موت نے ان کو اپنی گرفت میں باندھ لیا۔ تیری معصوم بہن کی قسمت پھوٹ گئی۔ صبر کر میری جان، شیر خدا کی بہادر پوتی بیٹی کا کلیجہ کرے کہ یہی ہماری قسمت میں تھا۔ اب آگے اور کیا ہونے والا ہے۔ وہ بھی نہیں معلوم ہوتا ہے۔ موت میرے سامنے کھڑی ہے۔ کوئی دم میں تیرے بابا کا سر تن سے جدا ہونے والا ہے۔ پھر یہ سر نیزے پر چڑھایا جائے گا۔ اور لاش کی ہر ممکن طریقے سے بے حرمتی کی جائے گی۔ اس کے بعد جو ظلم و ستم میری حرم اور معصوم بچوں پر ٹوٹیں گے۔ وہ بھی پوشیدہ نہیں۔ تو خوش قسمت ہے۔ صغرا کہ تو نے یہ سب کچھ نہیں دیکھا ورنہ تیرا معصوم دل ٹوٹ جاتا۔"

امامؑ نے تھک کر آنکھیں بند کر لیں۔ پھر مسافر سے کہا۔

"جاؤ میرے مہربان دوست خدا تمہیں اپنی امان رکھے"

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر میرے مظلوم امام، آج جو ان آنکھوں نے دیکھا ہے وہ کبھی فراموش نہ ہو سکے گا۔ الوداع میرے آقا" مسافر قدم چوم کر تیزی سے روانہ ہو گیا۔

امامؑ نے اپنی تمام قوت ارادی صرف کر کے امنڈتی ہوئی نقاہت اور غشی کو دور جھٹکا اور ٹپکتی ہوئی خون چکاں آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھا اور موت کا انتظار کرنے لگے۔

شام کی فوج میں ذہنی ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ کوئی مظلوم امامؑ کا سر تن سے جدا کرنے پر راضی نہ تھا۔ عاقبت کی فکر ڈس رہی تھی۔ خوف سے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں ہتھیار جسم پر بوجھ بنے جھول رہے تھے۔ انسان ہتھیار ہوتا ہے نہیں دل و دماغ

سے لڑتا ہے۔ انکار کی موت صورت ہیں کتنے ہی موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے، گھران کی حرکت کی طاقت ہی سلب ہو چکی تھی۔ ابن سعد نے انھیں تازہ دم ہونے کے لیے دریا کی طرف ہنکایا مگر وہ یوں سہم کر پلٹے جیسے پانی نہیں پگھلا ہوا۔ لاوا ہے۔ جس نے حلق سے بمشکل اتارا وہ وہیں مرغ بسمل کی طرح تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ خدا کا قہر نازل ہونا شروع ہو گیا تھا۔ جنون کا زہر آہستہ آہستہ سرایت کرتا جا رہا تھا۔ ریگستان کی حدت، عرب قوم کے جذباتی لوگ، اتنا عظیم سانحہ، ہوش و حواس کا تہ و بالا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ تب لوگوں نے شمر ذی الجوشن کی طرف دیکھا۔ اور خوف سے اوندھے منہ گر گئے اس کے کاندھوں پر انسان کا سر نہیں تھا۔

عصر کی نماز کا وقت ہو گیا تھا۔ امام حسینؓ جھلستی ریت پر سجدہ ریز ہو گئے۔

"اے خدا تیرا لاکھ لاکھ شکر کہ میں ظالموں کی صفوں کی بجائے مظلوموں کی قطار میں کھڑا ہوں۔ قاتل نہیں مقتول ہوں کہ قاتل ہزار بار مرتے ہیں۔"

شمر کا گھوڑا اچانک الف ہو گیا۔ اس نے چابکوں سے اس کی کھال ادھیڑ دی۔ زینبؓ نے شمر کی نیت دیکھ کر کلیجہ تھام لیا۔ شمر کے گھوڑے کی ٹاپیں جیسے ان کی چھاتی پر آ گئیں۔ امام حسنؓ کا سب سے چھوٹا بچہ عبداللہ بن حسنؓ ایک دم تڑپ کر خیمہ سے نکلا ماں نے پکڑنا چاہا، پھوپھی نے دامن تھاما مگر وہ مچل کر ان کے ہاتھوں سے چھوٹ نکلا۔ اور ٹھوکر کھاتا امامؑ کی طرف تیر کی طرح بھاگا۔ ان کے سامنے دونوں ہاتھ پھیلا کر سپر بن کر کھڑا ہو گیا۔

"خبردار کمینے، تو نے میرے عمو کو ہاتھ بھی لگایا تو فنا ہو جائے گا۔"

ننھے سے بچے کو دیکھ کر شمر دم بخود رہ گیا۔ جلال جمال کا یہ ننھا سا نمونہ دیکھ کر اس کی شقاوت کا دم سوکھ گیا۔ دبلا پتلا جسم غصے سے کانپ رہا تھا۔ گال تمتائے ہوئے تھے، کانوں میں منت کے آویزے لرز رہے تھے۔ دل میں انسانیت کی ننھی سی کونپل پھوٹتے محسوس کر کے وہ جھنجلا گیا۔

"ختم کر دو۔" اس نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔

امامؑ نے اپنے سامنے سے بچے کو ہٹانا چاہا مگر بچہ ان کے قابو سے باہر ہو گیا۔ ایک بہادر پہلوان نے تلوار کا ہاتھ مارا۔ ایک ننھا سا ہاتھ کٹ کر دور جا گرا۔ بچہ چیخ مار کر امام کی آغوش میں لت پت ہو کر گرا اور تڑپنے لگا۔ مسلسل وار ہونے لگے۔ اور بچے کا جسم ٹھنڈا ہو گیا۔ امامؑ نے بچے کی لاش چھاتی سے لگالی۔

شمر نے گھوڑے کو چھوڑ دیا۔ جب امامؑ کے قریب آیا۔ تو جست لگائی اور سوار ہو گیا۔ خون میں ڈوبے سفید بال پکڑ کر جھٹکے سے چت کیا۔ زخموں سے چھلنی سینے پر زانو رکھا۔

امامؑ نے گلے پر خنجر کی دھار محسوس کر کے آنکھیں کھول دیں۔

"ٹھہر جا لمحے ایک نظر اپنے قاتل کو دیکھ لینے دے۔" امام مسکرائے۔

زینبؑ کا کلیجہ پھٹ گیا۔ ننگے پیر ننگے سر خیمے سے نکل آئیں۔ امامؑ نے بہن کی چیخ سن کر بے دیکھے ہاتھ سے واپس جانے کا اشارہ کیا۔ زینبؑ پلٹ کر جلتی ریت پر گر گئیں۔

شمر نے گردن پر احتیاط سے اس مقام کو دیکھا جہاں رسول خداؐ بوسہ دیا کرتے تھے اور خنجر چلا دیا۔

سر کاٹ کر وہ شیطانی قہقہے لگا کر رقص کرنے لگا۔ ایک دم نفسیاتی عمل کا اثر فوج پر ہوا۔ اور مردہ فوج میں جان پڑ گئی۔ سب عفریتوں کی طرح ناچنے لگے۔ وہ رقص جو اسلام کی مقدس تعلیم نے بھلا دیئے تھے۔ پھر زندہ ہو گئے۔

کربلا کی زمین اللہ اکبر کے نعروں سے لرز اٹھی۔ فتح کے نقارے گرجنے لگے۔ جھانجھ چھنکنے لگے۔ سورج یک لخت منہ چھپا کر بھاگا اور جہنم کی کھولتی ہوئی تاریکی چھا گئی۔ حسینؑ کا سر نیزے پر چڑھا کر بلند کیا گیا۔

زین العابدینؑ تڑپ کر اٹھے اور گرتے پڑتے باہر نکل آئے۔ پھوپھی نے فوراً کمان سنبھالی فضہ کی مدد سے بیمار کو اٹھایا۔ خیمے میں لائیں، دامن کی ہوا دی۔ تو انھیں ہوش آیا۔

"میں کیوں زندہ رہ گیا پھوپھی اماں؟"

"اس لیے کہ اب تم ہمارے امام ہو، اس لٹے ہوئے قافلے کے سربراہ ہو۔ اپنے بابا کی وصیت یاد کرو۔ ایسی کوئی بات نہیں ہونا چاہیئے کہ یہ ظالم تمہیں بھی شہید کر دیں۔ ہم لوگ کیسے

تمہاری جان بڑی غنیمت ہے۔ اگر تم زندہ رہے تو میرے بھائی کا کوئی نام لیوا ابھی زندہ رہے گا۔ رسولِ خدا کا نام مٹ جائے گا۔ اپنے لیے نہیں ان یتیموں، ہم بدنصیب اور ان مجبوروں کے لیے تمہیں زندہ رہنا پڑے گا۔"

زینبؑ بنتِ علی کی باتوں سے ابن حسینؑ میں کچھ سکت آئی۔

میدانِ جنگ سے مسلسل وحشیانہ نعروں کی صدائیں آ رہی تھیں۔ فوج پر جنونی کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ فاتح سپاہ نے لوٹ شروع کر دی۔ اور خیموں میں گھس آئے اور سامان اٹھا اٹھا کر بھاگنے لگے۔ بچے سہم کر ماؤں کی گودوں میں چھپ گئے۔ ظالم درندوں کے ڈراؤنے چہرے دیکھ کر ان کی جان سوکھی جا رہی تھی۔

مال اسباب تھا ہی کتنا! امامؑ خزانے لے کر نہیں چلے تھے۔ اور نہ ہی ان کے پاس مال و دولت تھا۔ لوٹنے والوں کو سخت ناامیدی ہوئی۔ عورتوں کے سروں سے چادریں کھینچ لیں۔ ماؤں نے جلدی جلدی اپنے اور بچوں کے گلے کان میں جو طوق، کڑے، کنگن تھے اتار اتار کر بیچ خیمے میں پھینکنے شروع کر دیے۔ مگر سکینہ کو اپنے کانوں کے آویزے بہت عزیز تھے۔ یہ بابا نے عیدی میں دیے تھے۔ انھوں نے دونوں ہاتھوں سے کان چھپا لیے اور بھاگ کر بیمار بھائی کے پہلو میں چھپ گئیں کہ شاید انھیں کوئی نہ چھیڑے گا۔ اور وہ چھپی رہیں گی۔ مگر یہ لوٹ مار ایک نفسیاتی کھیل تھا۔ تاکہ فوج کے دل میں جو آلِ رسولؐ کی دہشت بیٹھی ہے۔ اسے زائل کیا جا سکے۔ اس لیے یہ ضروری سمجھا گیا کہ کوئی رعایت مروت نہ برتی جائے۔ تاکہ سپاہیوں کے ضمیر ملامت نہ کریں۔

خولی ہنستا ہوا سکینہ کی طرف لپکا مگر شمر نے اسے پیچھے دھکیل دیا اور آگے بڑھا اور للکار کر دبوچ لیا۔ ہاتھ مروڑ کر کڑے اتار لیے اور کانوں سے آویزے اتارنے لگا تو سکینہ چیخیں۔ ظالم نے کس کے بچی کے پھول سے گالوں پر دو طمانچے لگائے۔ اور جھٹکا مار کر آویزے نوچ لیے۔ لہولہان بچی بھائی کے ہاتھوں میں بے ہوش ہو گئی۔ ابن حسینؑ نے چاہا ظالم پر حملہ کر کے اس کا گلا دبوچ لیں۔ مگر پھوپھی نے دامن تھام لیا۔

"نہیں بیٹے، ان کمینوں کو شہ ملے گی۔ سہہ جاؤ میرے لال اور جو بھی ذلتیں سہنی پڑیں سہہ جاؤ۔ دیکھنا ہے کہ ان کی درندگی انہیں کہاں تک بڑھ جانے پر اکساتی ہے؟"

لوٹنے کے بعد حسب دستور خیموں میں آگ لگائی گئی۔ کوئی بھی ایسی رعایت نہ برتنی چاہیے کہ فوجیوں کو یاد آجائے کہ یہ بدنصیب ان کے پیغمبر کی اولاد ہیں۔ ڈرامہ پوری آن بان سے کھیلا جانا چاہیے۔

آگ لگتے دیکھ کر زینبؑ بنت علیؑ کو بھائی کے الفاظ یاد آ گئے۔

"علیؑ کی دلیر بیٹی، ہمت کو ہاتھ سے نہ دینا۔ تم اس لٹی فوج کے سپہ سالار ہو۔"

اور خیبر شکن کی بہادر بیٹی نے اپنا کردار نبھایا۔ بکھرتے خاندان کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹ لیا۔ جلدی جلدی سب کو جلتے ہوئے خیموں سے ہٹا کر دوسرے خیموں میں پہنچایا جو اسی طرح قطار میں نصب کیے گئے تھے کہ ایک کا دوسرے کے رسے سے الجھا ہوا تھا۔ بچوں اور عورتوں کا برا حال تھا۔ پیاس اور نقاہت سے چکر آ رہے تھے۔ روتی تھیں مگر آواز نہ نکلتی۔ سروں پر چادریں نہ تھیں، شرم اور ذلت کی ماری دہری ہوئی جا رہی تھیں۔ زینبؑ ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتیں۔ کسی کو پچکارتیں۔ کسی کو سختی سے ڈپٹتیں۔ جب دوسرے خیمے نے آگ پکڑی تو تیسرے میں پناہ لی۔ مگر آگ بڑھتی آئی۔ آخری خیمہ میں پہنچ کر زینبؑ نے ابن حسینؑ سے پوچھا۔

"اے امام اب کیا حکم ہے؟"

"اب پردہ کا موقع نہیں۔ باہر نکل کر اس عذاب دوزخ سے چھٹکارا پانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔"

اپنے بیمار امام کا حکم پا کر سب عورتیں اور بچے میدان میں نکل آئے اور جلتے خیموں سے تھوڑی دور ریت پر بیٹھ گئے۔

سکینہ کو ہوش آ چکا تھا۔ دونوں کانوں پر ہاتھ رکھے۔ گم سم بیٹھی تھیں۔ کہنیوں تک خون بہہ آیا تھا۔ سب بچے اس وقت بچپن کو بھول کر بوڑھوں کی طرح صبر کیے خاموش بیٹھے تھے۔

عجیب وحشت ناک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بڑی ڈراؤنی اندھیاری رات ایک دم مظلوموں کی پردہ پوشی کے لیے میدان کربلا پر اتر آئی۔

دفعتاً دشمن کے خیموں میں شمعیں جل اٹھیں۔ ساز جاگ گئے اور جشن کی تیاریاں ہونے لگیں شراب و کباب کا دور چلنے لگا۔ فتح کے جوش میں آج کسی کو تن بدن کا ہوش نہ تھا۔

مگر سپاہیوں کا ایک گروہ سب سے الگ تھلگ سر جوڑے مشورہ کر رہا تھا۔ ان میں سے ایک دو نے کہا۔

"یہ آج ہمیں کیا ہو گیا تھا؟ انسانیت کہاں موت کی نیند سو رہی تھی۔ عرب قوم کا تو یہ شیوہ نہیں کہ عورتوں اور بچوں پر ہاتھ اٹھائیں۔ بیمار اور مجبور کو ستائیں۔ کیا ہم واقعی مسلمان ہیں یا صرف نام کے اہلِ ایمان ہیں۔ دلوں میں وہی زمانۂ جہالت کی تاریکیاں بھری ہیں۔ کیا ہم رسول کریمؐ کی اُمت ہیں؟ اپنے آج کے بعد کیا ہم خدا کو منہ دکھانے کے قابل رہ گئے ہیں۔ کیا پیغمبرِ اسلامؐ ہمیں بخشوائیں گے کہ ہم نے ان کے پیاروں کو اس بے دردی سے ذبح کیا۔ اُن کی بہوؤں، پوتیوں، نواسیوں کی بے حرمتی کی۔"

ہم خیال سپاہیوں کا مجمع بڑھتا گیا۔ انہیں شمر اور سعد سے نفرت ہونے لگی۔ رات گہری ہوتی گئی، خوف و نفرت بڑھتی گئی۔ چند سردار جمع ہو کر مشورے کے بعد ابن سعد کے پاس پہنچے اور اسے ملامت کرنے لگے۔

"کم بخت! تیرے کہنے میں آ کر ہم نے یہ ظلم کر ڈالا۔ جی چاہتا ہے اب تیرا نام و نشان بھی اس دنیا سے مٹا دیں۔"

"خدا تجھے غارت کرے۔ تجھے حسینؓ ابنِ علیؓ سے عناد تھا۔ مگر ان سپاہیوں اور ننھے بچوں نے تیرا کیا بگاڑا تھا۔ تو یہاں بیٹھا تر مال نگل رہا ہے۔ اور وہاں بچے بھوک پیاس سے بے دم گرم جلتی ریت پر پڑے تڑپ رہے ہیں۔ رونے کی آواز بھی تو نہیں آتی کہ اتنی سکت بھی ان میں نہیں رہی۔"

"اے ناہنجار! جب کسی کے ہاں موت ہو جاتی ہے تو عرب قوم کا یہ دستور ہے کہ

جب تک میت نہ اٹھ جائے۔ مائیں بچوں کو دودھ تک نہیں دے پاتیں۔ اس کے بعد پہلے مرنے والے کے خاندان کو سمجھا بجھا کر حاضری کھلاتے ہیں۔ پھر خود نوالہ توڑتے سامنے لشکر کو کھانا بانٹا مگر ان بدنصیبوں کی طرف تیرا خیال بھی نہ گیا۔"

"بخدا ہمارے حلق میں نوالہ اٹک رہا ہے۔ اور ہم پر بھی کھانا حرام ہے۔ جب تک وہ لوگ فاقہ نہیں توڑیں گے۔ کوئی کھانے کو ہاتھ نہ لگا پائے گا۔"

یہ کہہ کر انہوں نے ابن سعد کے سامنے رکھے ہوئے مرغن کھانوں کے خوان الٹ دیئے، جام اوندھے کر دیئے اور تلواریں کھینچ کر کھڑے ہو گئے۔

ابن سعد اُن کے تیور دیکھ کر چوکنا ہو گیا۔ اس سے قبل کہ یہ باغیانہ خیالات ساری فوج میں زہر بن کر پھیلیں انہیں ختم کرنا پڑے گا۔ وہ بڑے ڈرامائی انداز میں سر جھکا کر رونے لگا پھر بولا۔

"خدا تمہارا بھلا کرے تم نے نیک مشورہ دیا۔ میں خود نادم اور پریشان تھا۔"

نوکروں کو بلا کر حکم دیا۔

ابھی چالیس خوان کھانوں کے اور مشروبات لے کر جاؤ اور پیش کرو۔"

لوگ بولے۔

"ہم کس منہ سے جائیں، ہمیں تو شرم آتی ہے۔ ہم نے اُن کی آنکھوں کے سامنے اُن کے عزیزوں کے گلے کاٹے ہیں۔ وہ ہمارے ہاتھ کا چھوا نہیں کھائیں گے۔ ان غلیظ خون بھرے ہاتھوں سے ہمیں خود منہ میں نوالہ رکھتے ابکائی آرہی ہے۔"

ابن سعد نے شمر سے کہا۔

"بھائی اس وقت تو ہی جا سکتا ہے۔ تو خود کو عباسؑ ابن علیؑ کا رشتہ دار بتاتا ہے۔"

"نہیں نہیں، یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا۔ زینبؑ نے اپنی آنکھوں سے مجھے حسینؑ کی چھاتی پر چڑھ کر انہیں ذبح کرتے دیکھا۔"

"اور کم بخت تم نے اس بچی کے طمانچہ مار کر کانوں سے بندے ناحق کھینچے، ٹھیک کہتے ہو تمہارا جانا ٹھیک نہیں۔ تمہیں دیکھ لیا تو خوف سے اس کا دم ہی نکل جائے گا۔" ابن سعد فکر مند ہو گیا۔

جب کوئی کھانا لے جانے پر تیار نہ ہوا تو حُرؔ کی بیوی کا خیال آیا جو شام کی فوج کے ساتھ ہی تھی۔ سو وہ بدنصیب اپنے شوہر کے سوگ میں سر اوندھائے آنسو بہا رہی تھی۔ یہ سوچ کر دل کو ڈھارس بندھ رہی تھی کہ عین وقت پر حرؔ کو خدا نے قوتِ بینائی بخشی، اس کا بہادر شوہر حق پر قربان ہوا۔ گناہوں کی کچھ تو تلافی ہو گئی۔

ابنِ سعد نے اُسے بلایا۔ بے چاری کبھی اسے حرؔ کی غداری کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ لرزتی سامنے آئی۔ مگر جب معلوم ہوا کھانا لے جانے کا سوال ہے تو ذرا جی ٹھیرا، وہ پہلے ہی ان مظلوموں کے خیال سے پریشان تھی۔ ان کی خدمت کے موقع کو غنیمت جانا۔ جب حرؔ کی بیوی خوان لے کر پہنچی تو دور ہی سے ان کی گت دیکھ کر جی سل گیا۔ ریت پہ بے سروسامانی کی حالت میں بچے اور عورتیں پڑی تھیں۔ الٹے پیروں واپس آئی اور کہا۔

”خدا سمجھے تجھے ابنِ سعد۔ سیدانیاں ننگے سر کھلے آسمان کے نیچے پڑی ہیں۔ پہلے ان کیلئے خیمے نصب کراؤ تب میں ان کے لیے کھانا لے کر جاؤں گی۔ ناپاک ریت پر جہاں تھوڑی ہی دور پر لاشیں پڑی ہیں۔ ان کے حلق سے نوالے کیسے اترے گا۔

ابنِ سعد یوں کھلایا ہوا تھا۔ ڈپٹ کر حکم دیا کہ ایک بڑا اور کشادہ خیمہ ان لوگوں کو دے دیا جائے۔

جب قدموں کی چاپ اور مشعل کی روشنی نظر آئی تو زینبؑ چونک کر اٹھ بیٹھیں، سمجھیں ظالم یہاں بھی چین نہ لینے دیں گے۔ اور ستم ڈھانے آ رہے ہیں۔ فوراً کھڑی ہو گئیں اور بڑھ کر بولیں۔

”کیا ہم لوگ بھاگے جا رہے ہیں۔ خدارا اس وقت پیچھا چھوڑ دو۔ ذرا بچوں کی آنکھ لگ گئی ہے۔ جاگ گئے تو پھر بھوک پیاس سے رونے لگیں گے۔ بہت ہلکان ہو کر سوئے ہیں۔“

یہ سن کر حرؔ کی بیوہ زار و قطار رونے لگی۔ آگے بڑھ کر کہا۔

”آپ کے پاس ایک عرض لے کر حاضر ہوئی ہوں۔“

”عرض؟ ہم تو حکم سننے کے لیے بیٹھے ہیں۔ کہو کیا کہنا ہے؟“

”چلئے اس خیمے میں آرام کیجئے!“

"آرام! کیا ہمارے حصے کا آرام تمہارے پاس باقی ہے؟"

"بی بی! میں آپ کی کنیز محرّ کی بیوہ ہوں۔"

"خدا بخشے حرؒ کو! بہن تم نے پہلے کیوں نہ بتایا۔ تمہارے شوہر نے کس شان سے امامؑ کی محبت نباہی۔ خدا جانتا ہے ہمارا بال بال ان کا احسان مند ہے۔"

"احسان تو میرے اوپر ہوا! امامؑ نے انھیں راہ راست دکھائی۔ ان کا انجام بخیر ہوا۔ شہادت نصیب ہوئی۔ بی بی آپ کو کس منہ سے امامؑ کا پرسہ دوں۔ آپ کی لونڈی ہوں۔"

سب کو سہارا دے کر خیمے میں پہنچایا۔ سامنے سے خوان آنے لگے۔ انھیں دیکھ کر سب ڈر گئے۔ شاید امامؑ اور دوسرے شہیدوں کے سر انھیں ایذا رسانی کے لیے لائے گئے ہیں۔ مگر جب خوان کھولے گئے۔ تو جان میں جان آئی۔

"کیا ہے؟" زینبؑ نے رکھائی سے پوچھا۔

"مرنے والوں کی حاضری!"

"یا اللہ، حاضری! میرے پیارے تین دن کے بھوکے پیاسے ذبح کیے گئے۔ اور اب ستم ظریفی دیکھیے کہ ہمیں ان کی حاضری دی جا رہی ہے۔ یہ سب ہمارا دل دکھانے کی ترکیبیں ہیں۔ بہن حاضری کیسی؟ ابھی تو لاشیں بے گور و کفن پڑی ہیں۔ حاضری تو دفن کے بعد ہوتی ہے۔ کیا عرب قوم نے اب رسولؐ اور خدا کے احکامات کو بھی بدلنا شروع کر دیا ہے۔ یہ جاؤ یہ خوان ہم انھیں ہاتھ نہ لگائیں گے۔"

اس وقت ابن حسینؑ نے اپنا فرض ادا کرنا ضروری سمجھا۔

"آپ نے مجھے امام کہا ہے۔"

"ہاں بیٹے حق تو یہ ہے کہ بھائی کے بعد تم ہی ہمارے امام ہو۔"

"تو بہ حیثیت امام کے بعد میں حکم دیتا ہوں کہ میدان جنگ میں تمام رسم و رواج اور آداب کی قید ختم ہو جاتی ہے۔"

زینبؑ نے بیمار اور لاغر امام کو نظر بھر کے دیکھا۔ ہمت بندھ گئی۔ جی ٹھہر گیا۔ بولیں۔

"تو پھر اس خوان پر فاتحہ پڑھ دو بیٹے۔"

امامؑ نے فاتحہ پڑھی۔ بچوں کو جگا جگا کر ان کے حلق میں بوند بوند پانی ٹپکایا کہیں اچھو لگ کر دم نہ نکل جائے۔ حلق بند ہو گئے تھے۔ بڑی مشکل سے گلے تر ہوئے پھر گھونٹ اترنے کے قابل ہوئے۔ سکینہ کو پانی دیا تو وہ خوشی سے تالیاں بجانے لگیں۔

"چچا جان پانی لے آئے نا، ہم نے کیا کہا تھا۔ فوج کی مجال نہیں جو میرے چچا جان کو روک سکے۔"

زینبؑ چپ کٹورا تھامے رہیں۔

"مگر ہم تو چچا جان کے ہاتھ سے پانی پئیں گے۔"

زینبؑ کا ہاتھ کانپا اور کٹورہ چھلک گیا۔

"پیاری بیٹیا، ہمارے ہاتھ سے نہیں پیو گی۔" امام حسینؑ نے بہن پر جھک کر کہا۔

"پی لوں گی، مگر پہلے یہ بتائیے ہمارے چچا جان اور بابا کہاں ہیں۔ ہم ان سے اس آقا کی شکایت کریں گے، جس نے ہمارے کان نوچے اور طمانچے بھی مارے۔"

بڑی مشکلوں سے سب نے دو دو لقمے کھا کر پانی کا گھونٹ حلق سے اتارا، ایسا معلوم ہوتا تھا۔ حلق نگلنا بھول گیا ہے۔

"پھپھا! سکینہ تھوڑی دیر بعد بولیں۔

"ہاں بی بی؟"

"ہمارے طمانچوں اور کان کھینچنے کا حال چچا جان کو نہ بتائیں تو اچھا ہے۔ انھیں غصہ بڑی جلدی آتا ہے۔ غصہ آ گیا تو غضب ہو جائے گا۔ پھر لڑائی شروع ہو جائے گی۔"

ان چند دنوں کی بھوک پیاس میں سب کی ہڈیاں نکل آئی تھیں۔ جلد جل گئی تھی۔ اعصاب بچا چور ہو گئے تھے۔ بچے تو سو گئے، مائیں سسکیاں بھرتی رہیں، کروٹیں بدلتی رہیں زینبؑ کی آنکھیں انگاروں کی طرح سلگ رہی تھیں۔ بھائی کے قتل پر ایک آنسو بھی بہایا تھا۔ خیمے سے تھوڑے فاصلے پر پیاروں کی بے گور و کفن پڑی تھیں۔ امامؑ نے سب کپڑے قتل کئے جاتے وقت چاک کر دیئے تھے کہ پھٹے ہوئے کپڑے کون اتارے گا۔ اس طرح شاید لاشیں برہنہ ہونے سے بچ جائیں گی۔ مگر درندگی کی آنکھیں نہیں ہوتیں

"نہیں" ابھی رونے کی مہلت نہیں، جنگ ختم نہیں ہوئی ہے۔ صرف حالات نے کروٹ بدل ہے" ابھی تو اور مرحلے سر کرنا ہیں" ابھی تو بہت کچھ سر سے گزرنا ہے۔"

پچھلے پہر سب ہی غافل ہو گئے۔

ام رباب نے جھک کر دیکھا۔ سکینہ پہلو میں نہیں، شاید پھوپھی کے پاس چلی گئی ہے۔ ادھر بھی نظر نہ آئی تو اٹھ کر چاروں طرف ڈھونڈا۔ پکارنے کی ہمت نہ ہوئی کہ سب کی نیند حرام ہو گی۔

پر جیسے رہی تھی، انہیں دم توڑ بچی تھیں، دل پہ پتھر رکھ کر واپس لیٹ گئیں۔ مگر قرار نہ آیا۔

ہے ہے بچی کہاں گئی۔ پھر تڑپ کر اٹھ بیٹھیں۔

کہیں باہر تو نہیں نکل گئی۔ ہولے سے زینبؑ کو جگایا۔

"بی بی سکینہ نہیں ملتی۔"

"یہیں کہیں ہو گی۔"

"کہیں نہیں شاید باہر نیند میں نکل گئی۔"

دونوں دبے پیر باہر نکلیں۔ خیمے کے آس پاس دیکھا۔ کچھ پتہ نہیں چلا کہاں گئی۔

یا خدا کوئی جانور تو نہیں اٹھا لے گیا۔

دھندلی روشنی میں ریت پر ننھے ننھے پیروں کے تازہ نشان دیکھ کر جی کو ڈھارس بندھی۔ ادھر ہی چل پڑیں۔ مقتل تھوڑے فاصلے پر تھا۔ ابھی ٹھیک سے اجالا نہیں ہوا تھا کوئی پہرے دار بھی گھومتا دکھائی نہ دیا۔ جس سے پوچھتیں۔ سب ہی تھکے ہارے گھوڑے بیچ کر سوئے تھے۔

دور دھندلکے میں کوئی چیز ہلتی نظر آئی۔ یہ ادھر ہی لپکیں۔ دیکھا سکینہ بابا کی سر کٹی کچلی ہوئی لاش کے سینے پر سر رکھے سو رہی ہیں۔ شاید کوئی خواب دیکھا تھا۔ جو کروٹ بدلی۔

امام رباب نے بمشکل اپنی چیخوں کو روکا اور جھک کر بچی کو اٹھانے لگیں۔

"نہیں ہم بابا کے پاس سوئیں گے۔" بابا کی لاڈلی بیٹی مچل گئی۔

"وہ ناصری کی شہزادی ہے" زینبؑ نے بچی کو اٹھا لیا۔ دیکھا بچی بخار میں جھلس رہی تھی۔

"بابا بہت گہری نیند سوئے ہیں۔ ہم نے انہیں جگایا نہیں، چپکے سے لیٹے رہے۔

بچی ہذیان میں بڑبڑا رہی تھی: "پھوپھی جان بابا کو سردی لگ رہی ہو گی۔ برف کی طرح ٹھنڈے ہو رہے۔ انھیں کچھ اڑھا دیجیے نا۔"

زینبؑ نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی ام رباب کو سہارا دیے چلتی رہیں۔ ام رباب کے پیر قابو میں نہ تھے۔ قدم قدم پر ٹھوکریں کھا رہی تھیں۔

"بابا نے ہمیں پیار نہیں کیا۔ کیا ہم سے خفا ہیں؟"

ام رباب سے صبر کا دامن چھوٹ گیا۔ دبی ہوئی چیخ نکل گئی۔ فوراً چار سپاہی لپکے اور سینے پر برچھیاں رکھ دیں۔ ایک نے مشعل بڑھائی۔

"چکمہ دے کر بھاگنے کا ارادہ ہے۔" زینبؑ نے سنگینیں ہاتھ سے پرے کر دیں۔

"بچی نیند میں ادھر آ نکلی تھی۔ اپنے بابا کی چھاتی پر سونے کی عادی ہے۔ گھبراؤ نہیں کوئی تمہارے چنگل سے نکل کر نہیں جا رہا ہے۔" سپاہی جھجک کر پیچھے ہٹ گئے۔

جب خیمے میں پہنچیں تو بخار شروع ہو گیا۔ بچوں نے پھر سسکنا شروع کر دیا۔

کبرا اپنی ہتھیلی کے زخم سے بے قرار تھیں۔ سہاگ کی چوڑیاں چبھ جانے سے جو گھاؤ ہو گیا تھا۔ وہ خشک ہو چلا تھا۔ مگر دل کا زخم درد دے رہا تھا۔ بچوں کو بہلانا آسان نہیں۔ امام حسینؑ نے کبھی اپنے بچوں سے کوئی بات نہ چھپائی، نہ بہانے سے ٹالا۔ اب زینبؑ نے بھی بچوں کے ہر سوال کا جواب نہایت بے رحمی سے دے دیا تھا کہ جانے والے ہمیشہ کے لیے گئے۔ اب نہیں آئیں گے۔ بچے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے رہتے جیسے واقعی سب کچھ سمجھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد پھر ضد کرنے لگتے۔

"بابا کے پاس چلو۔" "عباس چچا کو بلاؤ۔" "اکبر بھائی کہاں گئے؟"

"عون و محمد کب تک کھیلتے رہیں گے۔ ہم بھی ان کے پاس جائیں گے"

"قاسم بھیا کب آئیں گے، کبرا باجی روتی ہیں۔"

بچوں کی باتیں سن کر اور جی کو وحشت ہونے لگتی۔

گیارہویں محرم کی صبح آئی تو اپنے جلو میں نئی قیامتیں لائی۔

ابن سعد نے ایک مجلس مشاورت مرتب کی کہ چند سرداروں اور سپاہیوں کا وہ

گزشتہ شب نازیبا حد تک باغیانہ تھا۔ یہ جراثیم اگر فوراً ہی ختم کر دیے گئے تو وبا بن سکتے ہیں۔ ایسے خیالات رکھنے والوں پر سرکاری نگرانی کی ضرورت ہے۔ مگر فی ہیچ کر ان کا پکا انتظام کرنا از حد لازمی ہو جائے گا۔ ان کی بدزبانی ہمدردیاں ہنگامہ بھی بن سکتی ہیں۔

تھوڑا بہت انتظام تو اسی رات ہو گیا تھا۔ وہ جو بڑھ چڑھ کر بول رہے تھے ان میں سے زیادہ جوشیلے تو اسی رات غائب کر دیے گئے تھے۔ سیکڑوں لاشوں میں چند اور لاشیں کوئی شبہ نہیں پیدا ہو سکتا۔ باقی مشتبہ لوگوں پر مخبر تعینات کر دیے گئے۔

شامیوں کی لاشیں بڑی مستعدی سے دفن کی جا رہی تھیں۔ لیکن آلِ رسولؐ کی لاشیں اسی طرح چلچلاتی دھوپ میں پڑی تھیں۔ منادی کرا دی گئی کہ انہیں دفن نہ کرنے دیا جائے۔ عدول حکمی کی سزا موت سے بدتر ہو گی۔ کسی صورت میں نرمی نہ برتی جائے گی۔ ورنہ لوگوں کو مغالطہ ہو جائے گا۔ پچھتاوے اور توبہ کا مرض وبائی ہوتا ہے۔

ہر ممکن اور ناممکن طریقے سے یہ ثابت کرنا نہایت اہم تھا کہ حسینؓ ابن علیؓ غدار تھے۔ انھوں نے خدا کے مقرر کیے ہوئے پیغمبر اسلامؐ کے جائز جانشین یزید کی بیعت کرنے سے انکار کیا۔ ملک گیری کی ہوس میں فوج جمع کر کے غرق خرابے پھیلے ہوئے تھے۔ جنگ ہوئی اور شکست کھائی۔

"پیغمبر خداؐ کے عزیزوں میں صرف امام حسینؓ ابن علیؓ ہی نہیں تھے۔ یزید سے بھی ..." کا رشتہ تھا۔ جو نہایت دلیر، پاکباز، متقی اور پرہیزگار ہے۔ کیونکہ خدا کی نعمتیں انھی پہ ہوئی ہیں۔ عرب قوم کی اکثریت یزید کے ساتھ ہے۔" شمر نے کہا۔

اس موقع پر یہ بھی ثابت کرنا از حد ضروری تھا کہ پیغمبر اسلامؐ کے نواسے غلطیاں بھی کر سکتے ہیں اور اسلام کی حفاظت کے لیے انہیں سزا بھی دی جا سکتی ہے۔ وہ اللہ کے کوئی خاص بندے نہیں ہیں۔ ورنہ خدا الحمد انہیں بچا لیتا۔ مسلمانوں کا حقیقی خلیفۃ اللہ کا پیارا بندہ یزید ہے جس پر دو جہان کی برکتیں نازل ہوئی ہیں۔

لیکن اگرچہ چند مفسدوں کے دل میں یہ خیال جاگزیں ہو جائے کہ حسینؓ بے گناہ تھے فوج نہیں جمع کی تھی صرف بہتر رشتہ دار اور دوست تھے۔ انہیں بیعت کے معاملے میں اختیار حاصل تھا کہ بیعت یقین اور ایمان کے بل بوتے پر ہوتی ہے۔ انہیں اسلام کے تمام اصول نظرانداز

کرکے ان پر پانی بند کرکے ہزاروں سے زغے میں گھیر کر شہید کر دیا گیا۔

ایسے خیالات کی بیخ کنی کی جائے۔ ان کے ساتھ بالکل وہی برتاؤ کیا جائے جو دشمنان اسلام کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ چند لوگوں نے صلاح دی کہ ان قیدیوں کا جھنجھٹ کیوں پالا جائے۔ انہیں شام تک لے جانا قیامت ہو جائے گا۔ سب کو یہیں ختم کرکے قصہ پاک کر دیا جائے۔ کوفہ لے جانے کی ضرورت نہیں۔

مگر پھر مجلس مشاورت نے بڑے غور و خوض کے بعد فیصلہ کیا کہ اگر سب کو یہیں ختم کر دیا گیا تو رعایا کو تماشا دکھانے اور ان پر دہشت طاری کرنے کا ایک اچھا موقع ہاتھ سے چلا جائے گا۔ فتح خالی ہاتھ لوٹ آئے تو رعب نہیں پڑتا۔ دکھانے کو مال غنیمت نہیں تو قیدی تو ہونا لازمی ہیں۔ ان کی بے حرمتی اور درگت دیکھ کر اور بھی لوگوں کے دل میں ان کی وقعت ختم ہو جائے گی۔ یہ گمان بھی مٹ جائے گا کہ یہ رسول خداؐ کے نواسے ہونے کی وجہ سے کوئی خاص رتبہ یا طاقت رکھتے ہیں ان کی طاقت کم ہونے کا مطلب ہے لوگوں کے دل میں یزید کے لیے زیادہ سے زیادہ جگہ ہو جائے گی۔ اس لیے جتنا بھی شاندار جلوس تیار کیا جا سکے مفید ثابت ہوگا۔

ابن حسینؑ کے گلے میں طوق اور پیروں میں بیڑیاں ڈالی گئیں۔ شمر بہت بددل ہو رہا تھا۔ کیا نیم مردہ بیمار قیدی کا ہے۔ سینک سلائی سی ٹانگیں۔ پتلی گردن، ان پر بیڑیاں کیا سجیں گی۔ طوق کیا بھلا معلوم ہوگا۔ چوڑے چکلے پہلوانوں کو زنجیروں میں جکڑا جاتا تو فاتح کی شان میں چار چاند لگ جاتے۔ یہ بیمار لاغر قیدی، نیم مردہ بچے اور سوکھی جلی عورتیں ترجمان معلوم ہوں گی۔

بے عماری کے اونٹوں پر عورتوں کو ننگے سر بٹھایا گیا۔ ان کے گلے میں رسیاں باندھی گئیں۔ ایک لمبی سی رسی میں بچوں کے گلے تسبیح کے دانوں کی طرح پرو دیے گئے۔ ساتھ فاتح کے لیے خون میں لتھڑا ہوا علم جلتے ہوئے خیمے، علی اصغرؑ کا جلا ہوا پالنا تھا۔ سب سے آگے نیزوں پر شہیدوں کے سر تھے۔ ایک ایک ترتیب تھی۔ عین لڑائی کے وقت علی اصغرؑ کی کی ڈھنڈیا پڑی تو ایک جگہ نرم مٹی نظر آئی۔ کھود کر ذرا سا سر کاٹ کر نیزے پر آویزاں کر دیا گیا۔

روانگی کے وقت زینبؑ بے قرار ہو کر اپنے پیاروں کی لاشوں کی طرف بھاگنے لگیں

جو قدم بڑھنے پر گلے چھلنے لگے۔ ساربانوں نے رسیوں کے جھٹکے دیئے تو بے دم ہو کر زمین پر گر پڑیں۔ اس کے بعد جب بھی عزیزوں کی بے گور و کفن لاشیں راستے میں ملیں کسی نے سر اٹھانے کی کوشش بھی نہ کی خاموش خونبار آنکھوں سے دیکھا اور سر جھکا لیا۔

"تم مر گئیں زینبؑ تو میری قربانی بھی فنا ہو جائے گی۔ دنیا کی یادداشت بڑی کمزور ہے دو چار سال بعد سب بھول جائیں گے۔ میرا خون کربلا کی ریت میں کھو جائے گا۔" امامؑ نے مجھ سے کہا تھا۔

"یہ ہرگز نہیں ہوگا! میری زندگی کی ہر سانس حسینؑ حسینؑ پکارے گی۔ اس لہو کی ایک ایک بوند کا حساب ہوگا۔" زینبؑ نے تہیہ کر لیا تھا۔

ابن حسینؑ نے بھی پھوپھی کی بات کو دل میں رکھ لیا تھا۔ کل تک جو بیمار کروٹ تک لینے کی سکت نہ رکھتا تھا۔ طوق و سلاسل کا بوجھ اٹھائے مردانہ وار قدم اٹھا رہا تھا۔ ہاتھوں میں ان اونٹوں کی مہار تھی۔ جن پر بے پردہ ماں بہنیں سوار تھیں۔ تن کا بخار جن میں بھڑکتی ہوئی آگ کے سامنے ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ قدم قدم پر ٹھوکر لگ رہی تھی۔ سر چکرا رہا تھا۔ آنکھوں تلے بار بار اندھیرا چھا رہا تھا۔ مگر ہمت جوان تھی۔ زندہ رہنے کی ضد ارادے کو مضبوط بنا رہی تھی۔ ہر حال میں زندہ رہنا ہے۔ قسمت جو کچھ دکھائے دیکھنا ہے۔

کوفہ میں خبروں پر تالہ بندی تھی۔ واقعہ کربلا کی بھنک بھی کسی کے کان میں نہیں پڑنے دی گئی تھی۔ تمام پیش بندیاں ہو چکی تھیں۔ قاصدوں نے پہلے سے حاکم کوفہ کو فاتحین کے جلوس کی آمد کی خوشخبری پہنچا دی تھی۔ شہر میں بس یہ خبر عام تھی کہ کچھ باغیوں نے خلیفۂ وقت کے خلاف سر اٹھایا تھا۔ انھیں کچل دیا گیا تھا۔ اب مجرم بند و سلاسل میں گرفتار لائے جا رہے ہیں اور ہر خاص و عام کی خوشنودی کے لیے کیفر کردار کو پہنچائے جا رہے ہیں۔

کوفہ کے حاکم ابن زیاد نے فتح یاب فوج کی آمد کی خبر سن کر شہر کی آئینہ بندی کا حکم دیا۔ شہر کو چراغاں سے جگمگا دیا گیا۔ گلی گلی، کوچہ کوچہ میں مغنیوں اور رقاصوں کے انبوہ جمع کیے گئے۔ فضا نغموں، ہنسی، گھنگروؤں۔۔

کوفہ والے پہلے ہی سے ابن زیاد کے عتاب سے خائف تھے، اپنی نیک نیتی کا

اظہار کرنے کے لیے بڑے غرور و شور سے جشنِ شاہی میں حصہ لینے لگے۔ ابن زیاد کو ڈر تھا کہ شاید حقیقت عیاں ہونے پر لوگ آپے سے باہر ہو کر ہنگامے کھڑے کریں۔ اسلیے اس نے پیش بندی کے طور پر اعلان کروا دیا کہ کوئی ہتھیار بند ہو کر نہ آئے۔

دوسرے دن سعد بڑے کروفر سے لاؤ لشکر کے ساتھ شہر میں شادیانے بجاتا داخل ہوا۔ لوگ تماشا دیکھنے ٹوٹ پڑے۔ قیدیوں کی ایسی بری گت تھی کہ اپنے عزیز بھی مشکل سے پہچان پاتے۔ نیزوں میں آویزاں سر خاک و خون میں لتھڑے ہوئے تھے۔ دوسرے کسی کے شائبۂ گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ یہ قتل حسینؑ کا جشن ہے۔ یہ قیدی رسول خدا کے عزیز اور پیارے ہیں سمجھے کہ کوئی وحشی قبیلے کے باغی ہوں گے۔ سب کی رنگتیں جھلس کر سیاہ ہو گئی تھیں۔ ہڈیوں کے ڈھانچے قید و بند کی صعوبتیں سر جھکائے جھیل رہے تھے۔ عام تماشے کے مطابق تماشائی بھی قیدیوں پر اینٹ پتھر، کوڑا کرکٹ پھینک رہے تھے۔ اور مغلظات بک رہے تھے۔

ایک شخص نے لڑکھڑاتے ہوئے "ابن حسینؑ" کو دیکھ کر قہقہہ لگایا۔

"اے دشمن اسلام تجھ پر خدا کی لعنت۔"

"اے نیک بخت تو جانتا ہے کہ میں کون ہوں؟"

"ہاں جانتا ہوں تم دینِ اسلام کے دشمن ہو۔"

"تمہیں دھوکا دیا گیا ہے۔ میں اپنے جد امجد کے عقائد کا دشمن کیسے ہو سکتا ہوں۔ میں ابن حسینؑ ہوں۔ وہ سامنے نیزے پر میرے بابا کا سر ہے۔ پہچانتے ہو حسینؑ ابن علیؑ کو؟"

ایک معمر آدمی کی آنکھیں چندھیا کر دیکھا اور اس پر جیسے بجلی گر پڑی۔

"یا محمد حسینؑ ابن علیؑ قتل کر دیئے گئے۔" وہ شخص چیخنے لگا۔

آگ کی طرح یہ خبر مجمع میں پھیل گئی۔ لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نیزوں پر چڑھے سر دیکھنے لگے، پہچان کر پاگلوں کی طرح بال نوچ کر سر پیٹنے لگے۔

ایک کہرام مچ گیا۔ لوگوں نے حملہ کر کے سروں تک پہنچنے کی کوشش کی۔ ابن زیاد کی فوج پہلے سے اس گڑبڑ کا مقابلہ کرنے کو تیار تھی۔ گھوڑ سوار نیزے کر کے آگے بڑھے اور نیزوں کا حلقہ بنا لیا۔ جلدی جلدی سب قیدیوں کو قلعے میں پہنچا دیا گیا۔ جشن ماتم حسینؑ میں تبدیل

ہوگیا۔ ہر گھر سے رونے پیٹنے کی آوازیں اٹھنے لگیں۔ "یا خدا حسین ابن علیؑ قتل کر دیئے گئے۔"

یہ خبر آگ کی طرح ہر چہار طرف پھیل گئی۔ یہ سن کر پہلے تو کوفہ والوں پر سکتہ طاری ہوگیا۔ پھر لاکھوں سینوں سے ایسی دل دوز آہ بلند ہوئی کہ سارا شہر تھرّا گیا۔ لوگ پاگلوں کی طرح رونے پیٹنے لگے۔ سر کے بال نوچ کر کپڑے پھاڑنے لگے۔

اُس وقت زینبؑ بنتِ علیؑ نے اپنے چہرے سے الجھے ہوئے بالوں کی نقاب اٹھائی اور کوفہ والوں کو پکار کر مخاطب کیا۔

"اے کوفیو تم مکار اور جھوٹے ہو۔ تم وعدہ شکن اور کمینے ہو۔ تم نے لمبے چوڑے وعدے کئے۔ اور توڑ دیئے۔ تم نے میرے بھائی امام حسینؑ ابن علی کے ساتھ فریب کیا۔ انھیں وطن سے بے وطن بنایا۔ اور جب وہ یہاں آئے تو تم بزدل گیدڑوں کی طرح اپنی جانیں بچا کر دبک گئے۔ اور انھیں وحشی درندوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا۔ انھیں بھوکا پیاسا ذبح کیا گیا۔ ہم تباہ و برباد ہوگئے۔ اب تم ہم پر مگرمچھ کے آنسو بہانے آئے ہو؟ خدا کرے یہ آنسو تمہاری آنکھوں سے ہمیشہ بہتے رہیں۔ بے غیرت انسانو! تم نے اپنے دامن پر جو گھناؤنا داغ لگایا ہے یہ قیامت تک نہ چھوٹے گا۔ تم نے ایک ایسے انسان کے ساتھ دغا کیا جو تمہارا دینی اور دنیاوی راہنما تھا۔ خدا تمہارا یہ گناہ کبھی معاف نہ کرے گا۔ دنیا تمہاری مکاریوں کو کبھی معاف نہ کرے گی۔ بے رحمو! تم نے رسول خداؐ کے معصوم نواسے کو ذبح کیا۔ اُن کے ننھے ننھے بچوں کو پیاسا مارا، اُن کی بہو بیٹیوں کے سر سے چادریں اتار کر ان کی بے حرمتی کی، اور اب تم روتے ہو؟"

زینب بنت علیؑ کی آواز سن کر کوفہ والوں کی جان نکل گئی۔ خوف سے آنکھیں نکل پڑیں۔ در و دیوار سے سر پھوڑنے لگے۔ کپڑے پھاڑ ڈالے اور بال نوچنے لگے۔

عمر سعد نے ایک دم حالات بگڑتے دیکھ کر قافلے کو تیزی سے آگے بڑھایا۔ لوگوں کو تلواروں برچھیوں سے پرے ڈھکیل کر راستہ بنانا چاہا۔ مگر مجمع بے قابو ہو چکا تھا۔ بڑے خون خرابے کے بعد جلوس کو فوج نے حلقے میں لیا۔ اور تیزی سے قلعے کی طرف روانہ ہوگئے۔ ہر طرف سے لوگ جمع ہو کر قافلے کے ساتھ روتے پیٹتے چلنے لگے۔

وہ شہر جو دم بھر پہلے دلھن کی طرح سجا ہوا تھا۔ ماتم کدہ بن گیا۔ ہر گھر سے ماتم کی صدا بلند ہونے لگی۔ ایسا بھیانک واقعہ کبھی سننے میں بھی نہ آیا تھا۔ قتل اور وہ بھی آلِ

سول ' کا۔ قتل اور اس بے دردی سے۔

بڑی مشکلوں سے جلوس بھاگم بھاگ ابن زیاد کے دربار میں پہنچا۔

خولی اور بشیر بن مالک فخر سے سلینہ تانے مظلوم امامؑ کا سر لے کر ابن زیاد کے دربار میں پہنچے۔ اور جھوم جھوم کر شعر پڑھنے لگے۔ "اے امیر! ہم پر سونے چاندی کی بارش کر۔ اور جواہرات سے ہمارے دامن پر کر دے۔ کہ ہم ایسے بلند مرتبہ شہنشاہ کا سر لائے ہیں۔ جو پیغمبر خدا کا پیارا نواسہ تھا۔ اور ہر انسان سے ایک بلند مرتبہ انسان تھا۔

"کم بختو! اگر تم حسینؑ کو عظیم انسان سمجھتے ہو تو پھر انہیں قتل کیوں کیا؟" ابن زیاد نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا۔ "اسی بات پر جی چاہتا ہے تیری گردن اڑا دوں۔"

بشیر بن مالک سہم گیا۔ سمجھا ضرور ابن زیاد کی نیت خراب ہو رہی ہے۔ یزید کے دربار سے ملنے والے انعام و اکرام میں بھاگی مارنے کا ارادہ ہے۔ وہ چپکے سے سرک گیا۔ مگر اسی رات اسے کسی گم نام آدمی نے ختم کر دیا۔

ابن زیاد نے قیدیوں کو اس جیل خانے میں بھجوا دیا جو مسجد کے قریب واقع تھا۔

یہ وہی کوفہ تھا، جہاں بیس سال قبل علیؑ ابن ابی طالب کی حکومت تھی۔ انہوں نے بڑی جاں فشانی سے کوفہ کی تعمیر کی تھی۔ انہیں کوفیوں پر بڑا بھروسہ تھا۔ ایک دن وہ تھا جب زینبؑ اور ام کلثومؑ یہاں شہزادیوں کی طرح رہا کرتی تھیں۔ بڑے بڑے امیروں اور رئیسوں کی بہو بیٹیاں ان کی خدمت میں حاضر ہونا اپنے لیے بڑے فخر کی بات سمجھتی تھیں۔ آج کوفہ کی نیچ عورتیں بھی ان کے پاس آتے ہوئے تکلف محسوس کر رہی تھیں کہ کسی نے دیکھ لیا تو حاکم سے سارا سلوک ختم کر دے گا۔

کوفہ کے حالات بگڑ رہے تھے۔ کچھ منچلے انسانوں نے نیزوں پر چڑھے ہوئے سر چھیننے کی کوششیں کیں۔ جگہ جگہ چھپ چھپ کر لوگ واقعہ کربلا کی چھان بین کرتے۔ واقعات کی تفصیل سن کر سر پیٹتے۔ ابن زیاد کے خلاف نفرت اور غصہ کا طوفان اٹھا جو نہایت بے دردی سے دبا دیا گیا۔ آخر نہتے انسان کیسے ہتھیار بند فوج کا مقابلہ کرتے! چپ ہو رہے۔ مگر اندر اندر خون کے گھونٹ پیتے رہے۔ چھپ کر چلتے ہوتے کبھی ایک دوسرے کو مجرم ٹھہراتے کبھی خود اپنی غلطی پر سر دھنتے۔ غرض خون حسینؑ رنگ لانے لگا۔

ابن زیاد نے ہنگاموں سے جان چھڑانے کے لیے فیصلہ کیا کہ سب کو ختم کرکے ایک بار چھٹی کی جائے۔ مگر اس دن دمشق میں سے حکم شاہی پہنچا کہ تمام سر اور قیدی جوں کے توں دارالخلافہ روانہ کر دیے جائیں۔ شمر ذی الجوشن مع دوسرے معتبر سرداروں کے قافلے کے ساتھ روانہ ہوا۔ طے پایا کہ اس شکست خوردہ قافلے کو خوب گنجان بستیوں میں گھمایا جائے تاکہ دیکھنے والوں کو عبرت ہو کہ یزید کی مخالفت کرنے والوں کا کیا حشر ہوتا ہے۔ کوفیوں نے بس شروع میں ہنگامے کئے تھے۔ پھر حسب عادت دبک کر بیٹھ گئے۔ شمر سمجھا ترکیب ٹھیک کارگر ثابت ہوئی اور لوگ واقعی ہمیشہ کے لیے سہم گئے۔ یہی پالیسی دوسرے شہروں میں بھی کارگر ثابت ہو گی۔ اور پھر کبھی کسی کو یزید کے خلاف سر اٹھانے کی جرأت نہ ہو گی۔ جب رسول خدا کے نواسے ہی یزید کی نافرمانی کر کے فنا اور برباد ہو سکتے ہیں۔ تو پھر اب کس کی مجال ہے کہ اس کی برتری میں شبہ کرے۔

تمام شہروں میں جہاں سے قافلہ گزرنے والا تھا پہلے سے قاصد کو بھیج کر یہ انتظام کروا دیا گیا۔ خوب شہر کو آراستہ کیا جائے۔ باقاعدہ ناچ رنگ کا انتظام ہو۔ کسی بات کی کسر نہ اٹھا رکھی جائے۔ بہت ہی دھوم دھام سے ہر مقام پر جشن فتح مناتا قافلہ باقاعدہ گزرے۔

مگر شمر کی یہ دوراندیشی اس کی سب سے بڑی حماقت ثابت ہوئی۔ جہاں جہاں سے یہ قافلہ گزرا سوتے انسانوں کو جھنجھوڑتا چلا گیا۔ جس راستے سے قافلہ گزرا۔ ایک آگ سی لگتی چلی گئی۔ بجائے یزید کا رعب بیٹھنے کے حسین ابن علیؓ کی پامردی اور ہمت کے لوگ قائل ہو گئے انہوں نے سر کٹا دیا، قدموں پہ جھکایا نہیں۔ جان دے دی لیکن ضمیر فروشی نہیں کی۔ اپنے معتقدین کو دھوکا نہیں دیا۔ کسی دھمکی کسی لالچ کی پرواہ نہ کی۔ کیسے کیسے ظلم ہوئے مگر قدم ایک پل کو نہ ڈگمگائے۔

حسینؓ کی عظمت دلوں میں گھر کرتی گئی۔ جہاں سے قافلہ گزرتا لوگ جوق در جوق جمع ہو جاتے۔ سرکاری خبروں کے علاوہ لوگوں کو پہلے ہی خفیہ خبریں پہنچنے لگیں۔ اور ہر مقام پر زینب بنت علیؓ نے جو فصاحت و بلاغت ورثے میں اپنے بابا سے پائی تھی۔ اس کا سکہ بیٹھتا جاتا۔ جب لوگ جمع ہو جاتے وہ کسی ایک بیٹے، بھتیجے، بھانجے کی شہادت کی تفصیل اس درد انگیز انداز میں بیان کرتیں کہ پتھر بھی پگھل جاتے۔

سپاہی مجمع کو مار پیٹ کر منتشر کر دیتے۔ قیدیوں پر پہرہ کڑا کر دیتے۔ زینبؑ کو سوچ نہ تھا۔ مگر کسی ذرا سی بات پر وہ کچھ ایسا جملہ کہہ دیتیں جو سننے والوں کے کلیجے مسل دیتا۔ ایک بار نہ جانے کیسے علی اصغر کا پالنا کھل کر اونٹ پر سے گر پڑا۔ ام رباب کی چیخیں نہ رک سکیں۔

"ہائے میرا بچہ۔ ہائے میرا لال گر جائے گا لوگو! میرے علی اصغر کا پالنا سنبھالو۔"

زینب نے بھاوج کا سر چھاتی سے لگا کر کہا۔

"نہ رو میری بہنا، پالنا خالی ہے۔ تیرا لال تو اپنی دادی فاطمہ زہراؑ کی آغوش میں سو رہا ہوگا۔ وہ تو کبھی کا روٹھ گیا۔ ظالم کا ترچھا تیر اس کی ننھی سی گردن میں پیوست ہو گیا تب تب امامؑ نے اس کا جیتا جاگتا خون اپنے چہرے پر مل لیا تھا۔ نہ رو میری شہزادی پالنا خالی ہے۔ تیری گود بھی خالی ہے۔ پھر مجمع کی طرف متوجہ ہو کر بولیں۔ "اے خوش نصیب ماؤ! جن کی گود میں جیتے جاگتے بچے شیر خوار ہیں۔ اللہ کا شکر کرو کہ تمہاری کوکھ سرسبز ہے۔ ام رباب کی گود اس پالنے کی طرح ہمیشہ کے لیے خالی ہو گئی۔"

فوج نے بہت مارا پیٹا مگر بچوں والیاں گرے ہوئے پالنے پر اپنی آنکھیں ملنے لگیں اس کی ڈوریوں کو چومنے لگیں۔ ہر شہر میں لوگ بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ رقص و سرود کی محفلوں میں آگ لگا دی۔ اور گلی کوچوں میں ماتم حسینؑ سے کہرام مچ گیا۔ کئی شہروں میں تو ایسی ابتر حالت ہو گئی کہ جلوس نے اسی میں خیریت سمجھی کہ باہر سے ہی آگے بڑھ جائے۔ جب سے لوگوں نے شہیدوں کے سر چھیننے کی کوشش کی تھی سروں کو احتیاط سے صندوقوں میں بند کر کے لے جا رہے تھے اگر سب نے سب سر صحیح و سلامت نہ پہنچے تو شامت آ جائے گی۔ امامؑ مظلوم کی روداد پر بلاس کر لوگوں کے سہمے ہوئے دلوں میں جوش پیدا ہونے لگا۔ وہ بھی ان زیادتیوں کا مقابلہ کرنے پر تل گئے جو ان سے عام ان کے ساتھ روا رکھتے تھے۔ چپ چاپ ظلم سہنے والوں کی زبانیں بھی کھلنے لگیں۔ امامؑ نے مر کر انہیں جینے کا سلیقہ سکھایا۔ سر کٹا کے سر اٹھانے کی ہمت پیدا کر دی۔ آگ ایک شہر سے دوسرے شہر میں پھیلی۔ لوگوں نے گروہ بندیاں شروع کر دیں۔ جتنا انہیں مار کر دبانے کی کوشش کی۔ اور زور سے ابھرے۔

شمر ذی الجوشن ہلکان ہلکان ہو گیا۔ شہر در شہر آگے بجائے نعرۂ تحسین و آفرین کے باتو

خاموشی عوام سے مقابلہ کرنا پڑتا یا عتیں ملتیں۔

جس حکومت میں مسلمانوں کی یہ گت بنی وہاں عیسائی اور یہودیوں تو جانوروں سے بدتر سمجھا جاتا تھا۔ ان کے تمام حقوق آہستہ آہستہ سلب ہوتے جا رہے تھے۔ انہوں نے بھی اس موقع پر سرگار حسینؑ کا ساتھ دیا۔ انہیں بڑی بے دردی سے قتل و غارت کیا گیا۔ مگر خونِ حسینؑ کی سرخی عوام کی آنکھوں میں اتر آئی تھی۔ جتنی اُن پر سختی ہوئی اتنی ہی نفرت بھی شدت بڑھا اور اس میں کوئی شک نہ رہا کہ حکومت وحشی، جابر اور بے دین انسانوں کے ہاتھوں میں ہے۔ امامؑ کو شہید کر کے یزید نے اپنی اور اپنی شہنشاہیت کی قبر کھود ڈالی۔ قافلہ جب دمشق پہنچا تو یزید کے ہزاروں لاکھوں پرستار اس سے منحرف ہو چکے تھے۔

قافلہ افتاں و خیزاں آگے بڑھتا رہا۔ جب کہیں پڑاؤ پڑتا۔ سپاہی عیش و عشرت میں گم ہو جاتے۔ قیدی کسی کوٹھے میں ڈال دیئے جاتے۔ لوگ چھپ کر ان تک پہنچ جاتے۔ زینبؑ، اُم کلثومؑ اور ابنِ حسینؑ سے کربلا کے حالات سنتے۔ خاموشی سے آنسو بہاتے۔

"ہم سخت جان زندہ رہ گئے۔ ہمارے عزیزوں کی لاشیں میدان کربلا میں بے گور و کفن جنگلی جانوروں کے رحم و کرم پر پڑی ہیں۔"

زینبؑ خشک جلتی آنکھوں سے نیزوں پر آویزاں سر دیکھتیں۔

"دیکھو دیکھو لوگو میرے بھائی کے آنسو بہہ رہے ہیں۔ ظالموں نے ہمیں سر برہنہ کر کے گھمایا ہے۔ میرے بھائی کی روح بے قرار ہے۔"

لوگ ان سے حالات سن کر جاتے۔ اپنے عزیزوں، دوستوں کو جمع کر کے انہیں بتاتے، روتے، ماتم کرتے۔ اور اپنی بے بسی پر جھنجلا کر رہ جاتے۔

قصرِ شیریں

حسینؓ ابن علیؓ کی جب ایران کی شہزادی شہربانو سے شادی ہوئی تو ان کے ساتھ لونڈیاں میں ان کی ایک بڑی چہیتی باندی شیریں بھی تھی۔ کہنے کو وہ باندی تھی۔ شہربانو کے ساتھ بالکل چھوٹی بہنوں کی طرح رہتی تھی۔ دونوں میں غضب کا پیار تھا۔

شیریں بہت حسینؓ اور باسلیقہ تھی اور بانو اس پر جان چھڑکتی تھیں۔ جب بیاہ کر کے آئیں تو تمام لونڈیوں کو آزاد کر کے اُن سے نکاح کر دیئے گئے۔ مگر انھوں نے شیریں کو اپنے سے جدا نہ کیا۔ ایک دن حسینؓ اپنی چہیتی بیوی سے بیٹھے میٹھی میٹھی باتیں کر رہے تھے۔ بانو کھلی جاتی تھیں۔ دونوں میں بے پناہ عشق تھا۔ ایک بچہ کی خیر سے ماں تھیں مگر شوہر کی محبت میں رتی برابر فرق نہ آیا تھا۔ اتنے میں شیریں کچھ پھل اور مشروبات لے کر آئی۔ تو امام کی نظر اس پر پڑی۔ بڑے غور سے تکتے رہے۔ جب وہ چلی گئی تو بانو سے بولے۔

"اس کی آنکھیں بہت حسین ہیں۔ واللہ ایسی آنکھیں ہم نے آج تک نہیں دیکھیں۔"

بانو کا دل دھک سے ہو گیا۔ سمجھ گئیں کہ آنکھوں کی تعریف سے ان کے دل کا حال معلوم ہو گیا۔ عورت مرد کی کمزوری ہے۔ اور عورت بھی کیسی شیریں جیسی پریزاد۔!

بانو خاموش سر جھکائے سکتے میں بیٹھی سوچ رہی تھیں۔

"تو اپنے آقا کو چاہتی ہے، تو جو ان کی خوشی وہ تیری خوشی۔ شیریں بھی ضرور حسینؓ کو چاہتی ہے۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔"

"کیا سوچنے لگیں؟" حسینؓ نے پیار سے ان کی ٹھوڑی چھو کر پوچھا۔

"آپ ہی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اور کیا سوچ سکتی ہوں۔" بانو نے بمشکل دل کڑا کر مسکراتے ہوئے کہا۔ حسینؓ کی آنکھوں سے چھلکتی محبت کو انھوں نے شیریں کا

حضور تصور کیا، بولیں۔

"آپ ذرا بیٹھیے، باہر نہ چلے جائیے گا۔ میں ابھی آتی ہوں!" یہ کہہ کر گئیں۔ شیریں کو پاس بلایا۔ جلدی سے ریشمی زرنگار جوڑا پہنایا۔ بال سنوارے۔ مشک اور عنبر سے جسم بسایا اور آنکھوں میں سرمہ ڈالا۔

شیریں حیرت زدہ سب کچھ دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔

"بانو! یہ کیا تعقہ ہے۔ مجھے کس کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔"

"حسینؓ کے لیے۔"

"اللہ میری توبہ، یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں!؟"

"تجھے منظور ہے نا؟"

"منظور، حسین ابن علیؓ کی پاپوش برادری کا مجھے فخر حاصل ہے۔ اس سے بڑا رتبہ اور مجھے کیا مل سکتا ہے۔ بانو مجھے گنہگار نہ کرو۔ میری جان آپ پر سے قربان، یہ آپ کیا تماشہ کر رہی ہیں؟"

"شیریں تو جانتی ہے کہ تو مجھے کتنی عزیز ہے۔ میں نے سب لونڈیوں کو آزاد کر دیا۔ مگر تیری جدائی مجھ سے برداشت نہ ہوئی۔ مگر تو جانتی ہے تو لونڈی نہیں۔ میری بہن کے برابر بلکہ اس سے بھی زیادہ۔"

جی ہاں جانتی ہوں۔ میں نے کبھی شکایت کی کہ مجھے آزاد کیوں نہ کیا۔ بانو آپ کی محبت کی غلامی کی زنجیروں میں جو بندھ جائے۔ وہ چھوٹنا کب چاہے گا۔"

"تو میری بچپن کی سہیلی ہے۔ میرا کوئی راز تجھ سے چھپا نہیں۔ آج یہ راز بھی تجھے بتا دوں کہ میرے حسینؓ کا دل تجھ پر آگیا ہے۔ تیری قسمت جاگ گئی۔ آج تک میں ملکہ تھی مگر آج سے تو شہزادیوں کا رتبہ پائے گی۔ میرے آقا کے دل کی ملکہ میری ملکہ ہو جائے گی۔"

یا خدا یہ کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں آپ کی کنیز ہوں۔ اور کنیز ہی مرنا چاہتی ہوں۔ یہ آپ کے دل میں آج کیا سمائی۔ آقا تو آپ پر جان چھڑکتے ہیں۔ آپ ان پر فریفتہ ہیں۔ حاشا اللہ دو دلوں کے درمیان آنے والا گنہگار ہے۔"

"شیریں میں تجھ سے بحث نہیں کر سکتی۔ دل کی بات دل سے کی جاتی ہے حسینؓ میرے دل و جان کے مالک ہیں۔ وہ خوش رہیں گے تو ان کے پاس جو میرا دل ہے وہ بھی خوش رہے گا۔ تو ابھی ناتجربہ کار ہے۔ شیریں۔ جب کسی سے پیار کرے گی۔ تب پتہ چلے گا کہ محبوب کی مسرت خود اپنی مسرت بن جاتی ہے۔"

شیریں کو سمجھا بجھا کر حسینؓ کے پاس لے گئیں۔

"اٹھیے تو، ذرا میرے ساتھ آیئے، آپ سے ایک بات کہنی ہے۔"

حسینؓ بانو کی اتری ہوئی صورت دیکھ کر تاڑ گئے کہ کچھ بات طبیعت پر ناگوار گزری ہے۔ شاید شیریں کی آنکھوں کی تعریف کر دی تو خفا ہو گئیں۔ اب گلے شکوے ہوں گے مسکرا کر ساتھ ہو لیے۔ چہرے کا پردہ اٹھایا تو دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ شیریں عروسی جوڑا پہنے گردن جھکائے بیٹھی تھی۔ بات سمجھ میں آ گئی۔ ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

"بھئی واہ تم بھی خوب ہو۔ ایک ذرا آنکھوں کی تعریف کر دی۔ تو تم نہ جانے کیا سمجھ بیٹھیں واللہ تم جیسی محبوبہ کی موجودگی میں ہمیں اور کسی کی ضرورت نہیں۔ کیوں بھئی کیا ہماری نیت پر شک ہونے لگا۔"

"خدا نہ کرے مگر میں اپنی خوشی سے آپ کو اسے دے رہی ہوں۔"

"اچھا بھئی تمہارا تحفہ تو قبول کرنا ہی پڑے گا۔ لو ہم نے اسے آزاد کیا۔"

بانو نے آنسو بھری نظروں سے حسینؓ کے مسکراتے ہوئے چہرے کو دیکھا تو آنکھیں جھکا لیں۔

اسی شام حسینؓ نے اپنے ایک یہودی دوست کو جو شیریں کو بہت پسند تھا بلا کر اس کا نکاح کر دیا۔ وہ بہت بڑا سوداگر تھا۔ پہاڑی پر اس کا بڑا شاندار قلعہ تھا۔

بانو نے شیریں کو جی بھر کے جہیز دیا۔ بار بار اس کا منہ چومتی تھیں۔ کبھی اس کی شادی کی خوشی میں ہنستی تھیں۔ کبھی جدائی کے خیال سے رو پڑتی تھیں۔ حسینؓ نے ہنس کر بانو سے پوچھا۔

"اور کنیزوں کو تو جہیز نہیں دیا، اس پر بڑی مہربان ہو۔"

"وہ اوروں کو میں نے خود آزاد کیا تھا اسے آپ نے آزاد کیا ہے اسلئے یہ تو شہزادی ہوئی

کی شہزادی ہوئی۔"

"تمہارا فلسفہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔" حسینؑ ہنسنے لگے۔

بڑی عزت سے گھر کی بیٹی کی طرح بڑی شاندار ضیافت کے بعد شیریں رخصت ہوئی۔ بچے گلے مل کر روئی۔ بچوں کو چمٹا کر پیار کیا۔ بار بار بلائیں لیں۔

اسے روتا دیکھ کر حسینؑ نے مذاق میں پوچھا۔ "کیا جانے کو جی نہیں چاہتا؟"

"یہ گھر میرا میکہ بن گیا تھا۔ میکے سے کون جانے کو جی چاہے۔ آپ سب بہت یاد آئیں گے"

"یاد آئیں تو چلی آنا اور بار بار ہم لوگ بھی شیریں کے ہاں ضرور جائیں گے۔ زندگی نے وفا کی تو ایک بار ضرور تمہارے ہاں آئیں گے۔" "سب کو بچوں کو بھی ساتھ لائیں گے؟"

"ہاں ضرور لائیں گے۔"

شیریں بیاہ کر چلی گئی مگر حسینؑ اور بانو کو نہ بھولی۔ اکثر لکھا کرتی تھی کہ ضرور تشریف لائیں گے۔ میں چشم براہ ہوں۔ حسینؑ نے بانو سے کہا۔

"نیک بخت کو لکھ دو، ہم وعدہ خلافی نہیں کیا کرتے۔ تمہارے ہاں ایک بار ضرور آئیں گے۔"

اور وہ دن آگیا جس کا حسینؑ ابن علیؓ نے وعدہ کیا تھا۔

شیریں نے کچھ اڑتی اڑتی خبر سن لی تھی کہ امام حسینؑ مع اہل و عیال کے کوفہ جا رہے ہیں۔ پھر سنا کسی دوسری طرف رخ ہو گیا۔ کربلا کی خبریں تو باہر نہیں نکلنے پائیں۔ مگر دن ہی کچھ فکر تھا شاید امامؑ اس طرف سے گزرنے والے ہیں۔

شیریں بڑھتے جاتے قافلہ کی خیر خبر بھجواتی کہ شاید یہ امام حسینؑ ہی کا قافلہ ہو۔ شاید ان کے معزز مہمان تشریف لے آئیں۔

یہ بھی سننے میں آیا کہ امام حسینؓ مع اہل و عیال فوج کی ہمراہی میں یزید سے ملاقات کے لئے دمشق جا رہے ہیں تب تو وہ اس شہر لازمی طور پر گزریں گے۔

فوج کی آمد کی خبر سنتے ہی شیریں نے تیاریاں شروع کر دیں۔ خوب گھر سجایا، قیمتی ساز و سامان سے آراستہ کیا۔ اپنے پڑوسیوں کو بلا کر امامؑ اور پورے خاندان کے بارے میں بڑی تفصیل سے بتایا۔

پڑوسنیں شیریں کو بڑے رشک کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ اس کے ہاں پیغمبرِ خدا کے

نواسے مہمان ہو کر آنے والے ہیں۔ شیریں کا بڑا بلند مرتبہ ہے۔ وہ جنہیں رسول اللہؐ کی زیارت نصیب نہ ہوئی تھی۔ ان کے نواسے کے دیدار کے لیے بے قرار تھیں۔" رسول خداؐ کے خاندان کا دیدار خوش نصیبوں کو میسر ہے۔ اے بہن! اس خوشی کے موقع پر ہمیں بھول نہ جانا۔"

شیریں غرور سے ہنس کر کہتی۔

"تم خاطر جمع رکھو میں تم سب کو کیسے بھول سکتی ہوں۔ آنے دو میرے آقا کو۔ انشاءاللہ تمہیں ضرور ان کی قدم بوسی کی سعادت حاصل ہوگی۔ ماشاءاللہ ان کا لمبا چوڑا کنبہ ہے۔ علی اکبرؑ کو تو لوگ "شبیہ محمدؐ" کہتے ہیں۔ دیکھنے والے انہیں دیکھ کر درود بھیجتے ہیں۔

اور عباس ابن علیؑ کا کہنا۔ ان جیسا وجیہ پورے عرب میں نہیں۔ لوگ انھیں ماہِ قریش کہتے ہیں۔ امام کی بہن اور ان کے بچے بھی ساتھ ہوں گے۔ جس نے فاطمہ زہراؑ کو نہیں دیکھا بس وہ زینب بنت علیؑ کو دیکھ لیں۔ بالکل بی بی ہوبہو ماں کی صورت ہیں۔ شیریں نے قافلے کی آمد کی خبر سنی تو خوشی سے دیوانی ہو گئی۔ بس نیند حرام ہو گئی۔ طرح طرح کے کھانے پکوائے۔ شربت تیار کیے۔ سارے محلے کو دعوت نامہ بھیجا۔ اپنے شوہر سے کہا۔

"ذرا شہر [illegible] کے پھاٹک پر جا کر کھڑے ہو جائیے۔ جیسے ہی ذوالجناح نظر آئے۔ رکاب تھام لینا۔ لوگ ان کی خاطر مدارت کے لیے ٹوٹ پڑیں گے۔ مگر تم سب کو ٹال دینا۔ انہیں یہاں لانا۔ ایسا نہ ہو کوئی بڑھ کر پہلے انھیں مدعو کرلے۔ اچھا مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ میں انہیں سیدھا یہاں لاؤں گی"

"نیک بخت گھبرائی کیوں ہو؟" اس کے شوہر نے ہنس کر کہا۔

"ابھی سے جانے کی ضرورت نہیں۔ میں دیکھ کر آتا ہوں۔ آگئے تو تمہیں بھی بلا لوں گا تاکہ ہم دونوں مل کر ان کی پیشوائی کریں۔"

اس کا شوہر گیا۔ جب واپس آیا تو بڑا اداس مرجھایا ہوا سا۔

"تیرے آقا نہیں آئے۔ بڑی گڑبڑ ہے۔ کچھ باغیوں نے سر اٹھایا تھا۔ ان کی سرکوبی کے بعد انہیں قید کر کے لائے ہیں۔ نیزوں پر [illegible] سر ہیں۔ اونٹوں پر عورتوں اور بچوں کو بغیر کجاوے کے باندھ رکھا ہے [illegible]۔ میرا تو جی خراب ہونے لگا گھر بھاگ آیا۔"

ناامید ہو کر شیریں رونے لگی۔ اس وقت بھی آقا کا دیدار نہیں۔ کھانا بھی نہ کھایا۔

سارا دسترخوان سجا دیسا ہی پڑا رہا۔

رات کو قافلہ قلعہ کے سامنے میدان میں بسیرے کے لیے ٹھہر گیا۔ خوب چہل پہل تھی۔ قیدیوں کو ایک طرف ڈال دیا گیا۔ نیزے جن پر سر آویزاں تھے۔ زمین میں گاڑ دیئے گئے۔ سپہ سالار کے خیمے سے رقص و سرود کی صدائیں آرہی تھیں۔ شراب کا دور چل رہا تھا۔ سالم بکرے بھونے جارہے تھے۔ قیدیوں کو ایک ایک مٹھی بھنے جلے جو کے دانے اور تھوڑا سا پانی دیا۔ وہ بھی ان کے حلق سے اترنا مشکل تھا۔

میرے پیارے چچا جان آئیں گے تب ان کے ہاتھ سے پانی پیوں گی۔"

سکینہ کی ضد تھی۔" اماں پہلے اصغر بھیا کو پانی پلادو' وہ بہت دن کے پیاسے ہیں۔ بڑی کیسے ہو سکتی ہے۔ چھوٹا سا بھائی پیاسا ہے اور میں پانی پی لوں۔"

" ایک گھونٹ میری خاطر پی لے بٹیا' پھوپھی سمجھا رہی تھیں۔ تیرے بھائیوں اور بابا کی پیاس تو اللہ نے بجھا دی۔"

شیریں کو اپنا ریشمی بستر کانٹوں بھرا لگ رہا تھا۔ کسی کروٹ سکون نہ تھا۔ چنگ و رباب کے سروں کے ساتھ کبھی سسکیاں اور آہیں بھی لپٹی چلی آتیں۔ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھتی۔ دل کا عجب حال تھا۔ کسی کل قرار ہی نہ تھا۔ جب بہت وحشت بڑھی تو سوچا، جا کر دیکھوں تو یہ کون معصوم ہیں جو مصیبت کے مارے آہ و زاری کرتے ہیں۔ خدا جانے واقعی قصور وار ہیں یا بے قصور ہی کسی دم میں پھنسا لئے گئے ہیں۔ زمانے کے عجب رنگ ڈھنگ ہیں۔ عام طور پر معصوموں ہی کو سزائیں دی جاتی ہیں۔ بدکاروں کو چھوٹ ملی ہوئی ہے۔

اس نے سوچا یہ اتنا ڈھیروں کھانا بے کار ہی تو جائے گا۔ اگر سپہ سالار اجازت دے تو ان بدنصیب قیدیوں کو کھلا دیا جائے۔ سر پہ چادر ڈال کر گھر سے نکلی۔ جہاں قیدی تھے بالکل اندھیرا تھا۔ ڈھونڈتی ٹٹولتی آگے بڑھی۔ نیزوں پر ٹنگے سر دیکھ کر اس پر لرزہ طاری ہو گیا۔ ٹھٹک کر ایک نیزے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

ٹکٹکی باندھے وہ امام حسین ابن علیؓ کے خاک و خون میں لتھڑے سر کو گھور رہی تھی جو اس کی نظر دھوکہ دے رہی تھی۔ کئی دن سے انہیں کا خیال دل میں بسا ہوا تھا۔ ہر چہار طرف ان ہی کی صورت نظر آتی تھی۔ کہ اتنے میں شہر بانو کی نظر شیریں پر پڑی انہوں نے

اسے فوراً پہچان لیا اور شرم و ذلت سے دہری ہو کر بالوں میں منہ چھپا لیا۔

شیریں کا جسم سر سے پیر تک لرز رہا تھا۔ منہ سے دبی دبی چیخیں نکلی جا رہی تھیں۔ اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا تھا۔ مگر حسینؓ کی صورت تو ہمیشہ سے اس کے دماغ پر نقش تھی۔ اسی پُر نور چہرے کو ہزاروں بار خواب میں دیکھا تھا۔ مگر یہ کیسا ڈراؤنا خواب تھا؟ یہ اس کس گناہ کی سزا مل رہی تھی کہ اس کے سامنے خون آلودہ سر تھا۔ چونک کر اس نے قیدیوں کے ڈھیر کی طرف نظر گھمائی۔ بانو کا بس نہ تھا کہ زمین میں سما جائیں۔

شیریں کا شبہ یقین کی حد تک پہنچ گیا۔ سہمی ڈری وہ بانو کے قریب آئی۔ جھک کر ان کے چہرے سے بال سرکائے اور چیخ مار کر قدموں میں گر گئی۔

"میری شہزادی! یہ بدبخت آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں؟ یا میرے خدا مجھ سے طاقت بینائی چھین لے۔ یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں؟"

قیدیوں میں درد کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ شیریں ایک ایک سے لپٹ لپٹ کر رونے لگی۔ شیریں کا شوہر بھی اسے تلاش کرتا آ گیا۔ شیریں نے رو رو کر سب حال بتایا۔ اس سے التجا کی کہ سپہ سالار سے مہلت مانگ کر ان سب قیدیوں کو قلعے میں لے چلو۔

"وہ کم بخت کیوں اجازت دے گا۔"

"اجازت خریدی جا سکتی ہے۔ زر و جواہر دینار جو کچھ بھی مانگیں دے دو۔ بس تھوڑی دیر کے لیے انہیں لے چلو۔"

شیریں کے شوہر نے جا کر شمر ذی الجوشن سے آگے تھیلوں کے منہ کھول دیئے۔ پہلے تو اس نے ٹالا مگر پھر دولت ٹھکرانے میں حماقت نظر آئی۔ حرج بھی کیا ہے۔ قلعے کے چاروں طرف فوج پڑی ہوئی ہے۔ دغا فریب کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس نے اجازت دیدی۔

شیریں نے اپنے تمام زیور بھی اتار کر سامنے رکھ دیئے اور نیزوں پر ٹنگے ہوئے سروں کو اپنے ساتھ لے آئی۔ قلعے میں لے جا کر اس نے سب قیدیوں کو آرام سے بٹھایا۔ اپنے ہاتھوں سے ان کے زخمی پیر عرق گلاب سے دھو کر مرہم پٹی کی اور سجے ہوئے حجروں کی نیکانی کی اور زرنگار پر بٹھائے رکھے۔ صاف ستھرے ریشمی لباس پیش کئے مگر زینبؓ نے کپڑے بدلنے سے انکار کر دیا۔

"بچھڑنے والے پر خون کے چھینٹے ہی اپنی نشانی دے گئے ہیں۔ انہیں جسم سے جدا کرنے کو دل نہیں چاہتا۔"

مقتولین کے سر بھی اس نے عرقِ گلاب سے پاک کئے۔ انہیں ریشم و اطلس کی چادروں میں لپیٹ کر تخت پر رکھا۔ چاروں طرف سب جمع ہوئے اور زینبؓ بنتِ علیؑ نے اپنی درد بھری آواز میں واقعاتِ کربلا دہرائے۔ شیریں اور اس کے محلے والوں نے سن کر ایسے دردناک انداز میں ماتم کیا کہ سونے والوں کی نیندیں اچاٹ ہو گئیں۔ ایک خلقت آہستہ آہستہ محلے سے صحن میں جمع ہو گئی۔ آہ و بکا کا ایسا شور بلند ہوا کہ بدمست فوجی سرداروں کا نشہ بھی ہرن ہو گیا۔ شہریوں کے غم و غصہ کو دیکھ کر حواس باختہ ہو گئے۔

شیریں نے بہت منت و سماجت کی مگر ظالموں نے بڑی سختی سے مجمع منتشر کر دیا۔ قیدیوں کو بھوکا پیاسا ہی واپس لے گئے۔ سروں کو پھر خاک و خون میں لتھڑا کر صندوقوں میں بند کر دیا۔ اور اسی دم کوچ کا حکم دے دیا۔ شیریں اور اس کا شوہر دور تک آنسو بہاتے ساتھ گئے۔ پھر سمجھانے پر واپس لوٹ گئے۔

قافلہ دمشق کی طرف بڑھتا گیا۔ غم و غصہ کا ایک بے پناہ طوفان ہر شہر میں چھوڑتا گیا۔ واقعۂ کربلا کی لوگوں کے دلوں پر ایسی ہیبت سوار ہوئی کہ راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام ہو گیا۔ روزانہ کے کاروبار تباہ ہونے لگے۔ گلی کوچوں میں لوگوں کے ٹھٹ جمع ہو کر ان واقعات کو دہراتے، غم و غصہ کا اظہار کرتے۔ قیدیوں کی زبانی سنے ہوئے مظالم کا ایک دوسرے سے ذکر کرتے اور مستقبل کے خوف سے بے چین ہو جاتے۔ یزید اور اس کے حاکموں اور فوجیوں کے خلاف نفرت اور حقارت کا جذبہ دن بدن پروان چڑھنے لگا۔

دنیا کی کسی قوم نے کسی ملک میں کبھی اپنے پیغمبر کی اولاد کے ساتھ ایسا بے رحمانہ درندگی کا سلوک نہیں کیا۔

دربار

دمشق پہنچنے سے پہلے شمر ذی الجوشن نے بڑے زور شور کی تیاریاں کیں۔ اکثر شہروں میں حالات ناسازگار ثابت ہوئے تھے۔ بڑی سختی برتنا پڑی تھی مگر اسے یقین تھا کہ دارالخلافہ میں جہاں خلیفہ بہت ہردلعزیز تھا۔ یزید کے زیر سایہ لوگ اس کی ہیبت کی وجہ سے سر اٹھانے کی جرأت نہ کریں گے۔ اور فاتح فوج کا بڑا شاندار استقبال ہوگا۔

شہر پناہ سے تھوڑی دور رک کر پوری فوج کا جائزہ لیا۔ سب کو نئے طریقے سے مرتب کیا۔ صندوقوں میں سے سر نکال کر نیزوں پر سجائے۔

زینب بنت علیؑ نے شمر ذی الجوشن سے کہا۔

"شہیدوں کے سر ہمارے اونٹوں سے تھوڑے فاصلے پر رکھو تو بڑی مہربانی ہو۔ لوگ انہیں دیکھنے کے شوق میں ہمیں گھورنا بھول جائیں گے۔"

مگر شمر ایسے نایاب موقعے کو کب ہاتھ سے دینے والا تھا۔ وہ تو قیدیوں کو زیادہ سے زیادہ ذلیل و خوار کرنے پر تلا ہوا تھا۔ ضد میں وہ جلوس کو ایسے پھاٹک سے لے کر داخل ہوا۔ جہاں سب سے زیادہ ہجوم تھا۔ جب جلوس مسجد کے قریب پہنچا تو ایک شامی نے سمجھا کہ کفار کو کے لائے جا رہے ہیں۔ وہ زور زور سے شمر کی مدح سرائی کرنے لگا۔

"اے شمر ذی الجوشن تم پر برکتوں کا نزول ہو کہ تم نے دشمنانِ اسلام کو تباہ و برباد کیا اور فتنہ و فساد کی اجڑ کو اکھاڑ ڈالا؟"

زین العابدینؑ نے اپنے چاروں واہ واہ کرتے تماش بینوں کو تھکی ہمیار آنکھوں سے دیکھا۔ اور اس شخص سے پوچھا۔

"اے شخص تو خدا پر ایمان رکھتا ہے؟"

"بے شک!" وہ شخص بولا۔

"اور اس کے رسولؐ پر؟"

"میرے ماں باپ رسول اللہؐ پر قربان۔"

"اور آلِ رسولؐ کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں؟"

"الحمد للہ، آلِ رسولؐ برکت و رحمت کا سرچشمہ ہیں۔ اُن کے قدموں میں بخشش ہے"

وہ شخص جھوم کر بولا۔

"تو غور سے دیکھ اور پہچان کہ یہ نیزے پر بلند خاک و خون میں ڈوبا ہوا سر رسول اللہؐ کے نواسے امام حسینؑ ابن علیؓ کا ہے۔ اُن کے ساتھ اُن کے بھائیوں، بھتیجوں اور بیٹوں کے کٹے ہوئے سر نیزوں پر چڑھے ہوئے ہیں۔ میں زین العابدین مظلوم امامؑ کا بدنصیب اور بیمار بیٹا ہوں۔ اور یہ جو بے کجاوہ کے اونٹوں پر سر برہنہ عورتیں تو دیکھ رہا ہے یہ رسول خدا کی بہو بیٹیاں، نواسیاں اور پوتیاں ہیں۔"

یہ سن کر وہ شخص سناٹے میں رہ گیا۔ پھر چیخ کر بولا۔

"یہ جھوٹ ہے۔"

مگر ایک ضعیف آدمی آگے بڑھ کر بولا۔

"یہ جھوٹ نہیں۔ میں ان سروں کو پہچان رہا ہوں۔ آلِ رسولؐ کے سر ہیں۔ لعنت ہو اے مردود شمر، خدا تجھے غارت کرے۔ نامراد، یہ تو نے کیا کیا؟" اس بوڑھے نے اچانک گریبان چاک کر ڈالا۔ اور منہ پر پیٹنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ خبر مجمع میں پھیل گئی۔

مگر شمر نے فوراً اس فساد کو دبا دیا۔ زور زور سے شادیانے بجنے لگے۔ اس بوڑھے کو گھوڑوں کی ٹاپوں نے سرمہ بنا دیا۔ لوگ جانیں بچا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ فتح کے نعروں نے آہ و زاری کا گلا گھونٹ دیا۔

سہیل سعدی جو رسول خداؐ کے مشہور صحابیوں میں سے تھے۔ بیت المقدس کی زیارت لوٹ رہے تھے۔ یہ دھوم دھام دیکھ کر لوگوں سے پوچھنے لگے۔

"بھائیو! یہ کون سی نئی عید ہے جس کا مجھے پتہ نہیں؟"

ایک شامی نے پیچھے سے بتایا۔

"خاموش رہو! یہ قتلِ حسینؑ کا جشن منایا جا رہا ہے۔ آج حسینؑ کا سر دربارِ یزید میں لایا جا رہا ہے۔"

"رسول زادیاں قیدی بنا کر لائی گئی ہیں۔"

سہیل سعدی کے ہوش و حواس گم ہو گئے۔

"یا خدا یہ کیا دیکھ رہا ہوں؟ رسولِ خدا کے نواسے کا قتل اور یہ خوشیاں؟"

"خیریت چاہتے ہو تو خاموش رہو۔" شامی نے اس کے کان میں کہا اور کھسک گیا۔

اتنے میں جلوس قریب آ گیا۔ سہیل سعدی نے نیزوں پر سر اور برہنہ سر رسول زادیوں کو دیکھا تو چیخ چیخ کر رونے لگا۔

"یا اللہ مجھے اندھا کر دے! اس بڑھاپے میں یہ عذاب نازل نہ کر۔" پھر اہلِ شام سے مخاطب ہو کر کہا۔

"اے مسلمانو! اس بھیانک گناہ کا ذمہ دار کون ہے؟ کس کے دامن پر خونِ ناحق کے چھینٹے ہیں۔ دیکھو اے مسلمانو! غور سے دیکھو۔ تمہارے اپنے ہاتھ اس خون سے پاک ہیں۔ کب تک تم چپ چاپ یہ تماشے دیکھتے رہو گے۔ روزِ محشر خدا کے حضور میں اپنی لاعلمی کا سہارا لو گے۔ اور جواب دہی سے بچ جاؤ گے!"

شمر یہ سن کر بوکھلا گیا۔ اس نے اپنے خاص دستے کو اشارہ کیا کہ ڈھول تاشے کی آوازیں تیز کر دو اور ان باغیوں کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے پیس ڈالو۔"

وقتی طور پر بلا ٹل گئی۔ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے۔ تماشبین گھروں میں جا کر چپ رہے۔ مگر اس رات سیکڑوں گھروں میں ماتمِ حسینؑ برپا رہا۔ یزید کے محل میں چراغاں تھا۔ ناچ رنگ ہو رہا تھا۔ مگر عام شہریوں کے دل میں گھور اندھیرا تھا۔ گھروں سے آہوں اور سسکیوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ لوگ سجدے

میں پڑے عذاب الٰہی کے خوف سے لرز رہے تھے۔ جس جس نے وہ نیزوں پر لگے ہوئے سر اور مظلوم قیدیوں کی درگت دیکھی تھی، ان کی نیند حرام ہو گئی تھی۔ مگر بہت سے انجان لوگ اب بھی تماشہ دیکھ رہے تھے۔ خوشی سے ناچ رہے تھے۔ قیدیوں پر کوڑا کرکٹ پھینک رہے تھے۔ فاتح فوج پر پھول نچھاور کر رہے تھے۔ عمر مسکرا مسکرا کر سر کے اشارے سے لوگوں کے سلام لے رہا تھا۔

دربار کے بڑے ٹھاٹ باٹ تھے۔ چنگ و رباب کے دل کش سروں پر ماہ لقا رقاصائیں بے خودی سے جھوم رہی تھیں۔ فضا میں خوشبوئیں بسی ہوئی تھیں۔ یزید ایک زرنگار مرصع تخت پر بیٹھا شطرنج کھیل رہا تھا۔ اس کے گرد حسین و جمیل دوشیزائیں جمع تھیں۔

جس وقت قیدیوں کو دربار میں حاضر کیا گیا تو اس نے قصداً بے توجہی برتی تاکہ لوگوں پر واضح ہو جائے کہ قیدی خواہ آل رسولؐ ہوں، بس قیدی ہیں، اس کے ایک ہاتھ میں جام تھا۔ اور دوسرے ہاتھ میں چھڑی جسے مذاق میں وہ کبھی کسی حسینہ کے ٹہکا دیتا اور وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتی۔ کبھی اس کی مدد سے مہرہ سرکا دیتا۔

جب حسینؓ کا سر تشت طلائی میں سجا کر اس کے سامنے لایا گیا تو اس نے بغیر نظر ڈالے کہہ دیا۔

"تخت کے نیچے رکھ دو۔" اور شطرنج کی چالوں میں غرق ہو گیا۔

نحیف و زار قیدی سامنے کھڑے شرم و ذلت سے لرز رہے تھے۔ جو کچھ عذاب ان پر میدانِ کربلا میں اور اس کے بعد اس لمبے سفر میں ڈھائے گئے تھے، ان کے رِستے جسموں، سوجے ہوئے پیروں اور غم و اندوہ میں ڈوبی ہوئی آنکھوں سے عیاں ہو رہے تھے۔ کھڑا ہونا دشوار تھا۔ وہ بی بیاں جن کا آنچل تک فرشتوں نے نہ دیکھا تھا۔ آج بھرے دربار میں سر جھکائے، بالوں میں منہ چھپائے ہوس ناک نگاہوں کا نشانہ بنی کھڑی تھیں۔ ننھی سکینہ اپنے کرتے کی دھجیاں سمیٹے پھوپھی کے پہلو میں منہ چھپائے تھرتھر کانپ رہی تھی۔ ایران کی شہزادی، امام حسینؓ کی چہیتی بانو جوان بیٹے کے غم میں

ڈوبی، دودھ پیتے علی اصغر کی آخری سسکی کی یاد کانوں میں بسائے نہ جانے فراق کی کس دنیا میں کھوئی ہوئی تھیں۔ ان کی آنکھوں کا نہ کوئی محور تھا نہ ان میں روشنی ایک شب کے دلہناپے کے بعد بیوگی کے بوجھ تلے کچلی ہوئی فاطمہ کبریٰ جن کے ہاتھوں کی مہندی بھی ابھی میلی نہ ہوئی تھی۔ سوکھی سوکھی آنکھیں فرش پر گاڑے ماں کے بازو کے سہارے سکڑی تھیں۔ زین العابدینؑ کا جسم بخار سے پھنک رہا تھا۔ بیڑیوں کے زخم سلگ رہے تھے۔ کنپٹیاں شدتِ ضبط سے پھٹی جا رہی تھیں۔

یزید ان سب کے حال سے قطعی بے خبر اپنی چال میں کھویا ہوا تھا۔ جام پر جام چڑھا رہا تھا۔ جام میں باقی بچی تلچھٹ اس تشت میں انڈیل دیتا۔ جس میں امام کا سر رکھا تھا۔ یہ ڈرامہ بڑے سوچ سمجھ کر کھیلا جا رہا تھا۔ اپنی برتری اور بلندی کے احساس نے مدہوش بنا رکھا تھا۔

جب کھڑے کھڑے بہت دیر ہو گئی تو زین العابدین ابن حسینؑ نے زنجیروں کے بوجھ کو دونوں ہاتھوں سے سنبھالا اور دو قدم بڑھ کر یزید سے کہا۔

"اے ابن معاویہ ہم کب سے تیرے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ اور تجھے ادھر دیکھنے کی بھی فرصت نہیں۔"

بڑے مزے کی چال اڑی ہے۔" یزید نے بے توجہی سے کہا۔

"چالیں تو تو بہت چل چکا، کچھ زمانے کی چال کا بھی ہوش ہے؟"

"کیوں دماغ چاٹتے ہو، میرے پاس فضول بکواس کا وقت نہیں۔"

"میں زندگی کے اس مقام پر پہنچ چکا ہوں۔ جہاں فضول یا بے معنی بکواس کا نہ میرے پاس وقت ہے نہ موقع ہے۔ یزید وقت ہمیشہ ساتھ نہیں دے گا۔"

"مجھے دھمکیاں دے رہے ہو! کیوں نہ ہو آخر ہو کس کی اولاد، غدار کے بیٹے اور کیا امید ہو سکتی ہے۔ تمہارے باپ نے مجھ سے بے بات بغض مول لیا۔ میرے جائز حقوق سے منکر ہوئے میری رعایا کو بھڑکایا۔ خدا نے انہیں سزا دی۔"

"اپنی فوج کی حیوانیت کا ذمہ دار خدا کو بناتے ہو، اپنے گریبان میں منہ ڈال کر

دیکھو، تم میرے باپ کے قاتل ہو۔ اور شیطان تمہارے ساتھ ہے۔ میرے باپ نے کوئی فتنہ اٹھایا نہ فساد۔ انہوں نے تمہارے ظلم اور لوٹ کھسوٹ پہ اپنی خوشنودی کا اظہار کرنے سے انکار کر دیا۔ انسان کشی، کنبہ پروری اور اندھا دھند کرنے کے لیے تمہارے ہاتھوں کو مضبوط کرنے پر تیار نہیں ہوئے۔ انہوں نے جو کچھ کیا وہ ہر مسلمان کا فرض ہے۔"

یزید غصے سے بے قابو ہو گیا۔

" تمہارے دماغ اب بھی درست نہیں ہوئے۔ خدا کے مقرر کیے ہوئے خلیفہ کے سامنے گستاخی کی جرأت کرتے ہو۔"

" تمہیں خدا نے نہیں تمہارے باپ نے اور تمہارے خوشامدی حاکموں نے بادشاہ بنایا ہے۔ اگر تمہیں خدا کی مدد اور رحمتیں حاصل تھیں تو تم نے میرے باپ کی بیعت کی اہمیت کیوں ضروری جانی۔ تم جانتے تھے کہ حسین ابن علیؑ پہ عرب قوم کو اعتماد ہے۔ اگر وہ تمہاری گدی نشینی پر آفریں نہیں کہے تو وہ سمجھ جائیں گے کہ ضرور تم میں کوئی عیب ہے۔"

" بس خاموش۔" یزید لاجواب ہو کر جھلا اٹھا اور حکم دیا اس بدزبان لڑکے کو قتل کر دو۔ جلاد آگے بڑھا مگر زینبؑ تڑپ کر سامنے آ گئیں۔

" اے ظالم یہ لڑکا ہمارا آخری سہارا ہے۔ اگر اسے قتل کرنا ہے تو اسی وقت ہم سب کے قتل کا حکم بھی دے دے کہ اس کے بعد ہم لاوارث رہ جائیں گے۔"

جلاد بھی ٹھٹھک گیا۔ یزید نے چاروں طرف نظر گھمائی۔ دیکھا خود اس کے اپنے دوست احباب نظریں چرا رہے ہیں۔ موقع مناسب پا کر فوراً بات بدل دی۔

" تم ابھی بچے ہو۔"

" حسینؑ کے خاندان کا بچہ بچہ ان کے ہی نقش قدم پہ چلتا ہے۔"

ابن حسینؑ نے پھر دلیری سے کہا۔ مگر یزید ٹال گیا۔ اپنی کچھ سبکی ہوتے دیکھ کر دوسرا ہی انداز اختیار کیا۔ کھسیانا پن مٹانے کے لیے امام حسین ابن علیؑ کے کٹے ہوئے سر کو دیکھا پھر ہونٹوں پہ چھڑی مار کر بولا۔

" ان ہی ہونٹوں سے میری فضیلت سے انکار کرتے تھے۔ اب زبان کیوں بند ہو گئی۔"

ابو برزہ اسلمی جو رسول اللہؐ کے صحابی تھے۔ بہت بزرگ، متقی اور پرہیزگار تھے۔ وہ ابھی تک خاموش کھڑے تھے۔ اب برداشت نہ کر سکے۔ گرج کر بولے۔

"اے یزید ہونٹوں پر سے چھڑی ہٹا لے۔ بخدا میں نے اپنی آنکھوں سے رسول خدا کو ان ہونٹوں کا بوسہ لیتے دیکھا ہے۔"

یزید بگڑ اٹھا۔ اور غصہ ہو کر ابو برزہ کو دربار سے نکال دیا۔ وہ راستے ضعیف تھے مگر انہیں کیا کہ یزید کرتا باشی دلتی۔ وہ یزید اور اس کے جلادوں کو لعنت ملامت کرتے چلے گئے۔

رعب ڈالنے کے لیے یزید نے روم کے سفیر کو بھی یہ ڈرامہ دکھانے کے لیے مدعو کر لیا تھا کہ بیرونی ممالک میں بھی یہ دھاک بیٹھ جائے کہ یزید اتنا عظیم اور طاقتور ہے کہ آل رسول بھی اس کے سامنے سربسجود ہوتے ہیں۔

اس نے یزید سے پوچھا: "یہ کیا قصہ ہے؟ یہ کس کا سر ہے۔"

"ایک غدار کا۔ حسین ابن علیؑ جنہیں میری فضیلت سے انکار تھا۔"

"یہ تمہارے پیغمبرؐ کے نواسے تھے۔"

"ہاں مگر میری حق تلفی کرنا چاہتے تھے۔"

"یہ تو سیاست کی بات ہے۔ اگر تم مسلمان ہو اور تمہارے دل میں اپنے پیغمبرؐ کی اولاد کے لیے رتی بھر رحم نہیں۔ میں حضرت داؤدؑ کے خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ پشتیں گزر گئیں مگر اب بھی یہودی اور عیسائی میرے قدموں کی خاک کو تبرک سمجھ کر آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ اور تم اپنے رسولؐ کی اولاد کو کفار سے بھی زیادہ بری گت بناتے ہو۔ چین میں ایک جزیرہ ہے جہاں حضرت عیسیٰؑ کے گدھے کا سم رکھا ہے۔ لوگ دور دور سے زیارت کو آتے ہیں۔ تمہارا مذہب عجیب ہے کہ پچاس برس تمہارے پیغمبرؐ کو گزرے ہوئے نہیں ہوئے کہ تم نے ان کی اولاد کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک شروع کر دیا۔ کیسا ہے تمہارا ایمان اور یقین۔ اور تم اپنے اس مذہب کو ہم پر ٹھونسنا چاہتے ہو؟"

اب تو یزید کے غصے کی انتہا نہ رہی اور فوراً اس صاف گو انسان کے قتل کا حکم

دے دیا۔ یزید کی عقل ماری گئی تھی۔ شراب اور بدکاریوں نے بڑا تند خو اور بے بہا بنا دیا تھا نہ خود کسی بات پر غور کرنے کا عادی تھا۔ نہ کسی کی رائے لیتا تھا۔ اپنے آپ کو عقل کل تصور کرتا تھا۔ جو بات ایک دم دماغ میں کلبلاتی کر بیٹھتا۔ طاقت کے غلط استعمال سے جو کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ اسے ہر سرکش کی سزا سمجھنے لگا تھا۔ اس کے حواری موالی بھی خر دماغ اور خود غرض تھے۔ فلسفی اور عالم یا تو ختم کر دیئے گئے تھے یا ہجرت کر گئے تھے۔ کچھ باقی تھے بھی تو ان کا راج پاٹ سے کوئی واسطہ نہیں رکھا گیا تھا

مگر یزید جتنا رعب داب میں تیزی کرتا جاتا تھا۔ اتنا ہی لوگوں کی نظروں سے گرتا جاتا تھا۔ عرب ممالک کے علاوہ باہر کے ملکوں میں بھی اس کی ضد اور خر دماغی کا چرچا ہونے لگا تھا

قیدی اب اتنے چور ہو گئے تھے کہ بمشکل لڑکھڑاتے جا رہے تھے۔ بمشکل ایک دوسرے کو تھامے کھڑے تھے۔

ایک خوشامدی نے یزید کی کچھ رکی ہوئی دیکھ کر دربار میں جان ڈالنے کے لیے اٹھ کر درخواست کی کہ اگر چھوٹی لڑکی دے دی جائے۔ تو وہ بڑی سے بڑی قیمت دینے کو تیار ہے۔ یزید کھل اٹھا، ہنس کر بولا۔ "نقد سودا ہے ادھار کا سوال نہیں۔"

اس خنڈے نے کرتے سے اشرفیوں کے توڑے کھول کر سامنے ڈھیر کر دیے۔

"میں نقد کی بات کرتا ہوں۔"

سکینہ سہم کر ماں سے چمٹ گئیں۔ ابن حسینؑ کا خون کھول اٹھا۔ مگر زینب انہیں پکڑ لیا۔ اور یزید سے بولیں۔

"تو اس لڑکی کو ہرگز فروخت نہیں کر سکتا۔ اگر اسے بیچنا چاہتا ہے تو پہلے اسلام ترک کر۔ کیونکہ مسلمان لڑکی کو لونڈی بنانا حرام ہے۔"

یزید بری طرح چڑ گیا۔ اس کی ہر بات الٹی پڑ رہی تھی۔ اس کا ارادہ بنت حسینؑ کو سر فروخت کرنے کا نہیں تھا۔ صرف ذلیل و خوار کرنا چاہتا تھا۔ اس شامی خریدار پر غصہ اتارنے لگا۔ دیکھنا بیکار۔

اسے ڈانٹا اور جھنجلا کر دربار برخاست کر دیا۔ قیدیوں کو زنداں میں ڈال دیا۔ بہت کوفت ہو رہی تھی۔ خود اٹھ کر حرم سرا میں جی بہلانے چلا گیا۔

ہند

ہند حسن و جمال میں بے مثال تھی۔ حسین ابن علیؑ کی کنیز تھی۔ انھوں نے اسے آزاد کر دیا تھا۔ اور یزید جو خوبصورتی کا متوالا تھا۔ اسے بیاہ لایا تھا۔ اس کے محل میں عورتوں کی کمی نہ تھی مگر ہند اسے بہت عزیز تھی۔ اس کی صحبت میں وہ دنیا کے غم بھول جایا کرتا تھا۔ ہند بڑی نیک سیرت اور بھولی بھالی تھی۔ سیاسی ہنگاموں سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ یزید اور امام حسینؑ کے درمیان جو رنجش تھی اس کا کچھ یوں ہی سا اندازہ تھا۔ قتل حسینؑ کی اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی۔ وہ خواب میں بھی ایسی بھیانک حقیقت کے بارے میں سوچ سکتی تھی۔ اسے آل رسولؐ سے بڑا لگاؤ تھا۔ کیونکہ بانو اسے بیٹی کی طرح چاہتی تھیں۔

مگر دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ اس دن نہ جانے کیوں اس کا جی بھاری تھا۔ عجیب انجانی سی وحشت دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ بے بنیاد وسوسے جاگ کر پریشان کیے ہوئے تھے۔ ایسی شدت کی پیاس تھی کہ حلق تڑخا جاتا تھا۔ مگر مشروب ہونٹوں سے لگاتے ہی جی اوٹنے لگتا تھا۔ جیسے کٹورہ کھینچتے ہوئے شربت سے نہیں گاڑھے گاڑھے لہو سے چھلک رہا ہے۔

یزید نے اس سے اختلاط کی کوشش کی تو وہ بے جان مٹی کی مورتی کی طرح سرد ہوگئی۔ یزید غصے سے جھنجھلا اٹھا۔

"آج میری طبیعت بہت مکدر ہے۔ میرا جی بہلاؤ۔ مجھے وحشت ہو رہی ہے۔ آج خراب بھا ہے۔ ترشابت بڑھ رہا ہے۔ جذامی کی قے کی طرح متعفن اور تھوک کی طرح پھیکی۔"

ہند سر جھکا کر رہ گئی۔

اس کا مردہ پن بڑھتا گیا۔ دل پر جبر کرنے پر بھی وہ یزید کو خوش نہ کر سکی۔ اس کے گھونسے اور لات بھی چپ چاپ پڑی سہتی رہی۔ یزید کا جی چاہا اس مردار کا گلا گھونٹ دے۔ آج اسے اتنی عظیم فتح حاصل ہوئی ہے۔ اور آج ہی اس کی مسرتوں کا جیسے دم گھٹ رہا ہے۔

یزید ہذیانی نیند میں ڈوبتا اُبھرتا رہا۔ بدخوابی کی شکایت پہلے بھی تھی۔ مگر اس دن تو وہ گھگھیا رہا تھا۔ بار بار آنکھ کھلی۔ پسینے چھوٹنے لگے۔ شراب کی زیادتی تھی یا کوئی انجانا وہم وہ سوتے اور جاگنے کے درمیان معلق رہا۔ ہند اس کے پہلو میں نیم مردہ پڑی تھی۔ فضا میں گھلی ہوئی آہ و زاری کو سن سن کر پاگل ہو رہی تھی۔ کون رو رہا تھا؟ ایسا معلوم ہوتا تھا ساری کائنات رو رہی ہے۔ دارالخلافہ کے سب جانے کتنے گھروں میں سونے والے خواب میں آہ و بکا کر رہے تھے۔

رات کے سناٹے میں یہ خاموش ماتم اس کا دم گھونٹنے لگا۔ وہ دبے پاؤں اٹھی۔ ادھر اُدھر کان لگا کر سنتی رہی۔ بڑے غور و خوض کے بعد اس نے اندازہ لگایا کہ قلعے سے تھوڑی دور جو قید خانہ ہے وہاں سے رونے کی آواز آ رہی ہے۔ اس نے اپنی لونڈی سے کہا کہ دربان سے جا کر کہے کہ معلوم کر کے آئے کہ کون رو رہا ہے؟ کیوں رو رہا ہے؟ کیا کوئی بیمار ہے؟ دربان نے واپس آ کر اطلاع دی کہ زندان میں جو آج نئے قیدی آئے ہیں۔ ان میں ایک بچی ہے جو سوتے میں چونک چونک کر ڈرتی ہے۔

مگر ہند کے کانوں میں تو رونے کی صدائیں اُترتی جا رہی تھیں۔ اس ایک بچی کی آہ و زاری میں ساری دنیا کا بچپن رو رہا تھا۔

"کیا بچی بیمار ہے؟" "پتہ نہیں"

"کیا بھوکی ہے؟" "بھوکے تو سبھی قیدی ہیں"

نیند کو آگ لگ چکی تھی۔ ہند دیر تک دریچے سے قید خانہ کی عمارت کو دیکھتی رہی۔ جانے کیا اس کے جی میں سمائی۔ لونڈی اور دربان کو ساتھ لیا۔ اور چپکے سے محل سے اُتر کر قید خانے کے دروازے تک پہنچی۔ اسے دیکھ کر پہرے داروں نے دروازہ کھول دیا اور وہ اندر داخل ہو گئی۔

اندر بلا کا اندھیرا تھا۔ کچھ میلے کچیلے کپڑوں کے ڈھیر سے کونے میں پڑے تھے۔ بلا کی اُمس اور سیلن تھی۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ مارے سڑاند کے دماغ گھوم گیا۔ خشک خون اور سڑتے ہوئے زخموں کی بدبو سے سر چکرانے لگا۔ اس نے شمع منگائی اور چاروں طرف نظر دوڑانے لگی۔ اس نے دیکھا اور کلیجہ منہ کو آ گیا۔ تار تار کپڑے۔ کانوں میں چھوٹے اور زخم

سوکھے ہونٹوں پر آہیں سکینہ کروٹ لیے پڑی تھی۔ پاس ہی ایک گرد کے ڈھیر میں جنبش ہوئی۔ بیڑیاں بج اٹھیں۔

بانو نے شمع کی جھلملاتی روشنی میں دیکھا کر زرق برق لباس میں کوئی پری زاد کھڑی ہے۔ انہوں نے جلدی سے زینبؑ کو ڈر کے جھنجھوڑا۔ زینبؑ نے فوراً ہند کو پہچان لیا اور جلدی سے منہ پھیر لیا۔ مارے شرم کے سرگھٹنوں سے لگ گیا۔ ہند انہیں تکتی رہی پھر ان کے سامنے دو زانو بیٹھ گئی۔

"بنت علیؑ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ خواب ہے یا حقیقت۔ للہ مجھے کوئی جگاؤ۔ ورنہ میرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔"

"کیا نیند کے متوالوں کے جاگنے کا وقت آگیا ؟ ہم پر کیا گزری اور گزر رہی ہے۔ کیا ملک عرب کے باشندوں کو کچھ خبر نہیں ؟"

ہند زینبؑ کے قدموں میں سر رکھ کر رونے لگی۔

"میں تو محل میں ایک پرکٹے پرند کی طرح قید ہوں۔"

"وہ پیروں میں عیش و عشرت کی بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں۔" زینبؑ نے طنزیہ کہا۔ "کچھ عیش و عشرت میں ڈوب کر سب کچھ بھلا بیٹھے ہیں۔ کچھ حرص و ہوس میں گرفتار ہو کر بد حواس ہو چکے ہیں۔ کچھ بادشاہ کی بخشی ہوئی برکتوں کو زندگی سمجھ کر بتانے چپ ہیں۔ کچھ شاہی ظلم و ستم سے آگے آواز کھو چکے ہیں۔ عرض آل رسول کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی کسی کو فرصت اور مہلت نہیں۔ تم یہاں کیوں آئی ہو ہند۔ یہ تم نے اپنے لیے بہتری کا سامان نہیں کیا۔"

"لعنت ہے اس زندگی پر جو ضمیر بیچ کر حاصل ہو۔ ہاں میری آقا زادی۔ عرب قوم پر لعنتوں کا سایہ ہے۔" ہند سر جھکا کر رونے لگی۔ "یا خدا ہمارا کیا انجام ہونے والا ہے ؟"

ہند کے رونے سے اور سب کی بھی آنکھ کھل گئی۔ زینبؑ کی زبانی قتل حسینؑ کا تذکرہ سن کر پاگلوں کی طرح دیواروں سے سر پھوڑنے لگی۔ زینبؑ کی زبانی قتل حسینؑ کا تذکرہ ہی کر اسی وقت الٹے پیروں واپس گئی۔ کھانے کا سامان اور پانی اور شربت کی صراحیاں قیمتی ملبوسات

باندیوں کے سر پر رکھوا کر لاؤ۔ ایک ایک کی منت کی مگر کسی نے حلق سے نوالہ نہ اُتارا سب نے
اس کی خاطر تھوڑا پانی پی لیا۔ کپڑے تو چھونے سے بھی انکار کر دیا۔

"ہمارے لباس ہم پر تو ٹوٹے گئے۔ مظالم کے واحد گواہ ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے
عزیز میدانِ کربلا میں بے گور و کفن پڑے ہیں۔ ہم یہ لباسِ فاخرہ کس دل سے پہن سکتے ہیں۔
ہند ناکام و نامراد اور روتی پیٹتی واپس لوٹ آئی۔ اس نے یزید کو جگا کر بری طرح
اس کی ڈانٹ ڈپٹ کی۔ جی بھر کے کوسا۔ عذابِ دوزخ سے ڈرایا۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔
"حکومت کے معاملے میں دخل اندازی مت کر بد بخت ورنہ پچھتائے گی"۔
"جب تو نے ہمارے ایمان اور یقین ہی کو کچل ڈالا تو اب اس سے بڑی اور کیا سزا
ہو سکتی ہے۔ اے یزید آج سے میں تجھ پر حرام ہوئی۔ مجھے ہاتھ نہ لگانا تیرے ہاتھوں سے
حسینؓ کے لہو کی بو آ رہی ہے"۔

یزید بہت پریشان تھا۔ حالات یوں پلٹا کھا جائیں گے۔ اس کی امید نہ تھی وہ تو سمجھا
تھا اس کے پہلو میں کھٹکتا کانٹا ہمیشہ کے لیے نکل گیا۔ یہ خبر نہ تھی کہ از سرتا پیر خار دار
زنجیروں میں گرفتار ہو جائے گا۔ مختلف شہروں سے عجیب عجیب خبریں آ رہی تھیں ہنگامے
شروع ہو گئے تھے۔ لوگ شارعِ عام پر جمع ہو کر قتلِ حسینؓ کی تفصیلیں سنتے اور سناتے اور
آہ و زاری کرتے۔ یزید اور اس کے حاکموں کے خلاف نفرت کا بے پناہ طوفان اٹھ رہا تھا۔
ہر طرح سے بغاوتوں کو دبانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ مگر جوں جوں جبر باندھے جاتے
طوفان کا زور بڑھتا جاتا۔

امام حسینؓ کے غم میں رونا ماتم کرنا جرم قرار دے دیا گیا۔ غمِ حسینؓ حکومت کی پالیسی
پر اعتراض ہے۔ حکومت پر اعتراض کرنے والے دشمنانِ اسلام ہیں۔ مگر آنسوؤں پر پہرہ بٹھانا
انسانی طاقت سے تباہ ہوا۔ لوگ اور غصہ ہوتے اور ضد میں یزید کو دکھ پہنچانے کے لیے
ہر گلی کوچے میں ماتم کرنے لگے۔ شاعروں نے سینکڑوں نوحے اور مرثیے لکھ ڈالے جنہیں
کہ لوگ دیوانہ وار سینہ کوبی کرتے، سروں پہ خاک ڈالتے، عرب قوم بہت جذباتی
اس کے ہر فعل میں بلا کی شدت اور تندی پائی جاتی ہے۔ جتنی جتنی روک تھام بڑھی ضد بڑھی

مظلوم امام حسینؑ کے قتل سے بے خبر چین سے اپنے گھروں میں بیٹھے رہے تھے۔ اپنے ضمیر کو لعنت ملامت کر رہے تھے۔ اظہار غم کو انہوں نے ذریعہ نجات سمجھ کر اس میں بڑے جوش و کا مظاہرہ کیا۔

نافرمانی کرنے والوں کو سخت ترین سزائیں دی گئیں۔ زندہ گھوڑوں کی ٹاپوں سے کچلا گیا۔ کوڑوں سے کھال اتاری گئی۔ سولی پر لٹکایا گیا۔ فاتح فوج درندوں کی طرح شہریوں پر ٹوٹ پڑی اور میدان کربلا کے مناظر دہرائے گئے۔ مظلوم حسینؑ کے خون کا ہر قطرہ ایک عظیم طوفان کی صورت میں اختیار کرنے لگا۔ انسان کے دلوں میں زہر بھر گیا۔

لوگ یزید سے زیادہ خود اپنی بے حسی پر ملامت کرتے تھے۔ وہ بے خبر گھروں میں بیٹھے رہے۔ اور نواسہ پیغمبر کے بے گناہ بچوں کو اس بے دردی سے تباہ و برباد کیا گیا۔ عوام کے پاس ہتھیار نہ تھے۔ صرف حساس دل تھے۔ انہوں نے حسینؑ کی زندگی کو شمع راہ بنایا۔ ظلم کا جواب مظلومیت سے دیا۔ تلواروں کا جواب آنسوؤں کی ایک ایک بوند جمع ہو کر ایک عظیم طوفان بن گئی۔ یزید کی زندگی جہنم ہو گئی۔ راتوں کی نیند حرام ہو گئی۔

واپسی

میدانِ کربلا میں شہیدوں کی لاشیں بے گور و کفن پڑی تھیں۔ حکم شاہی تھا کہ انھیں ہرگز دفن نہ کیا جائے۔ جو بھی اس حکم کی خلاف ورزی کرے گا، غدار سمجھا جائے گا۔ اور سخت ترین سزا پائے گا۔ اس کا گھر بار جلا کر خاک کر دیا جائے گا۔ زن و بچوں کو کولھو میں پلوا دیا جائے گا۔ قبیلہ بنی اسد جن سے امام حسین ابن علیؑ نے کربلا میں زمین خریدی تھی۔ ایک بار ادھر سے گزرے اور شہیدوں کی برہنہ لاشیں نظر آئیں۔ ان کے ساتھ عورتیں بھی تھیں وہ بدحواس ہو کر رونے پیٹنے لگیں۔

"یہ کن بدنصیبوں کی لاشیں ہیں۔ ان کے سر کس ظالم نے کاٹے ہیں۔ انھیں دفن کیوں نہیں کیا گیا۔"

مردوں نے شرم سے سر جھکا لیے اور دبی زبان سے بتایا کہ یہ امام حسین ابن علیؑ اور ان کے دوستوں عزیزوں کی لاشیں ہیں۔ غداری کے جرم میں انھیں قتل کر دیا گیا۔ اور حکومت نے منادی کر دی ہے کہ انھیں دفن کرنا جرم ہے۔"

"رسولِ خدا کے بیٹوں کو دفن کرنا کس ملعون نے جرم قرار دیا ہے؟" عورتیں بگڑنے لگیں۔

"شاہی حکم کے آگے کون دم مار سکتا ہے۔ خیریت اسی میں ہے کہ یہاں سے جلدی جلدی واپس لوٹ چلیں۔

"لعنت ایسی خیریت پر۔ خدا کی مار اس حاکم پر جو مسلمان کی لاش کی ایسی بے حرمتی روا سمجھتا ہے۔ ان لاشوں کا کفن ہم پر واجب ہے۔ اگر تم مرد ہو کر ڈرتے ہو تو گھر میں چوڑیاں پہن کر بیٹھو، ہم عورتیں انہیں اپنے سر کی چادروں کا کفن دے کر دفنائیں گی۔"

یہ کہہ کر عورتیں پھاوڑے لے کر قبریں کھودنے لگیں۔

مردوں کو انتہائی شرم آئی۔ انہوں نے عورتوں سے پھاوڑے چھین لیے۔

"نیک بختو، تم بیٹھو، جو ہو گی سو دیکھی جائے گی۔ ہم انہیں دفن کریں گے۔"

چنانچہ انھوں نے جیسے تیسے کفن دیئے اور سب کو نمازِ جنازہ کے بعد دفن کیا۔ جن جن

بے نام سے واقف تھے ان کی نشانیاں وہاں نصب کر دیں۔

قبیلہ بنی اسد کی جرأت کے بارے میں جس نے بھی سنا۔ آفریں کہا۔

مگر دمشق کے بندی خانے میں محبوس قیدی قبیلہ بنی اسد کی جرأت مندانہ اقدام سے بے خبر تھے۔ قیدخانہ بھی دل یزید کی طرح تنگ و تاریک تھا۔ نہ ہوا کا گزر تھا۔ نہ اندھیرے میں ایک دوسرے کی صورت نظر آتی تھی۔ نہ یہ پتہ چلتا تھا کب رات گزری اور صبح ہوئی۔ چمگادڑیں اور ابابیلیں اِدھر اُدھر پھڑپھڑاتیں تو بچے سہم کر ماؤں کی گود میں چھپ جاتے۔ قیدخانہ کیا تھا ایک مرقد تھا۔ جو بھی داخل ہوا بس مرکر ہی رہا ہوا۔۔۔۔۔۔ دیوار کی سیاہی دم گھونٹے دیتی تھی۔ بچے سانس لینے کو ترستے۔ کوئی سوراخ یا روزن نظر آجاتا۔ سب آسمان کی جھلک دیکھنے کو ٹوٹ پڑتے۔ عمارت ایسی بوسیدہ تھی کہ ہر وقت چھت گرنے کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔

پھر بھی سر پر سایہ تو تھا۔ اپنے عزیزوں اور دل کے ٹکڑے تو میدانِ کربلا میں چلچلاتی دھوپ اور جلتی ریت پر برہنہ پڑے تھے۔

"اللہ اس رسی سے گلو خلاصی ملے تو لوگوں سے راستہ پوچھتی کربلا پہنچ جاؤں"؟

زینبؑ آہ بھرتیں۔

"پھوپھی جان ہمیں بھی ساتھ لے چلو۔ ہمیں بابا بہت یاد آتے ہیں۔ ہمیں ساتھ نہیں لے جاؤ گی تو ہم رو رو کر جان دے دیں گے" سکینہ کہتیں۔

"تم کیسے جاؤ گی بیٹی، کوسوں کا سفر ہے"؟

"ہم چلے جائیں گے۔ بابا کیوں نہیں آتے۔ اماں نے کہا تھا نہر پر پانی لینے گئے ہیں۔ مگر اتنے دن ہوگئے۔ ابھی تک نہیں آئے۔ ہم ان کے انتظار میں جان دے دیں گے۔ مگر وہ نہیں آئیں گے۔ پھوپھی جان بابا ہمیں کیوں بھول گئے"۔

بانو ایک دم غنودگی سے چونک اٹھتیں۔

"شمع جلاؤ، اجالا کرو۔ میرا علی اصغر جاگ پڑا تو اندھیرے میں دہل جائے گا"؟

م۔ ہائے کلیجہ تھام کر رہ جاتیں "ہائے پروردگار میری تو عقل پر پتھر

پڑ گئے ہیں۔ بھول بھول جاتی ہوں کہ علی اصغر تو ماں کی گود سونی کر کے بابا کی آغوش میں سو رہے ہیں۔"

بابا کو یاد کرتے کرتے سکینہ کو وہم ہو گیا کہ دروازہ بند ہے۔ اس لیے بابا نہیں آتے۔ رو رو کر دربان کی منتیں کرنے لگیں۔

"اے دربان خدا کا واسطہ تھوڑا سا دروازہ کھول دو، میرے بابا آنے والے ہیں۔ کہیں دروازہ بند دیکھ کر واپس نہ لوٹ جائیں۔"

"کون ہے تو اے لڑکی!؟" دربان نے درشتی سے پوچھا۔

"میں سکینہ ہوں۔ اپنے بابا حسین ابن علیؑ کا انتظار کر رہی ہوں۔ وہ مجھے لینے آ رہے ہیں۔"

"چپ رہ لڑکی، تیری بک بک نے تو ناک میں دم کر دیا۔ دن رات روتی ہے چین سے دو گھڑی بھی سونے نہیں دیتی۔ چل دور ہو۔ بس اب صبح قفل کھلے گا۔"

"صبح تک تو میرا دم بھی نکل جائے گا۔"

"اچھا ہی ہوگا تیری ہر وقت کی ریں ریں سے پیچھا چھوٹ جائے گا۔ بڑی ضدی لڑکی ہے۔ شمر کے طمانچے کھا کر بھی مزاج درست نہیں ہوا۔ دیکھ دروازہ بند کر ورنہ ہم ابھی انہیں بلاتے ہیں۔ وہ آ کر پھر سے تیرے گلے میں رسی باندھ دیں گے۔"

ڈانٹ پھٹکار سن کر بچی سہم گئی۔ دیوار سے لگی اندھیرے میں اِدھر اُدھر ٹٹولتی کہ سانس لینے کو کوئی روزن مل جائے۔

"کہاں اندھیرے میں ٹکریں مار رہی ہے۔ اِدھر میری گود میں آ جا میری جان"
مگر بچی کو تو ایک ہی رٹ لگی تھی۔

"بابا کیسے بے مروت ہیں، آ کر ہمیں اس قید سے آزاد کیوں نہیں کراتے۔ ہماری انھیں ذرا بھی پروا نہیں۔"

بانو نے ٹٹول کر بچی کو اٹھا لیا۔ ماں بیٹی گلے مل کر رونے لگیں۔ بچی کی نیند ایسی اچاٹ ہوئی تھی کہ پلک جھپکنا دشوار تھا۔ سب نے بار بار گود میں لے کر سلانے کی کوشش کی اسے نیند نہ آئی۔ کبریٰ نے چھوٹی بہن کو لے کر بہت سلانے کی کوشش کی۔

"بس پل بھر کے لیے سو جاؤ میری جان ۔"

"نہیں اب ہم کبھی نہ سو جائیں گے ۔ بابا آکر سلائیں گے ۔ تب ہی سوئیں گے" سکینہ نے کہا۔

دربان نے جو بچی کی آہ وزاری سنی تو اسے ایک شرارت سوجھی ۔ ظالموں کی جیلوں میں انسانوں کے دل بھی پتھر ہو جاتے ہیں ۔ جیل کے احاطے میں اب بھی مقتولین کے سر نیزوں پر آویزاں تھے ۔ اس نے امام حسینؑ کا سر اتار کر ایک خوان میں رکھا اوپر سے خوان پوش ڈھکا اور لے کر قید خانے میں گیا۔

"لو بادشاہ نے تمہیں نواکہات بھیجے ہیں ۔" یہ کہہ کر خوان دہلیز سے آگے سرکا دیا اور دروازہ بند کر کے ہنسنے لگا۔

نہ جانے بیمار بچی کے نتھنوں میں کیسی خوشبو پہنچی کہ تڑپ کر بہن کی گود سے نکل گئی ۔

"بابا آگئے، میرے پیارے بابا آگئے !" اور اندھیرے میں گرتی پڑتی خوان پر جا گری ۔ سب گھبرا کر چیخنے لگے ۔

"ذرا سی روشنی دکھا دو خدارا !"

دربان ہنستا ہوا آیا اور مشعل آگے بڑھا دی ۔ سکینہ نے لرزتے بخار میں جلتے ہاتھوں سے خوان پوش سرکایا ۔ ایک گھٹی ہوئی چیخ کلیجے سے نکلی ۔ بچی نے باپ کے منہ پر منہ رکھ کے دم توڑ دیا ۔

دربان گھبرا گیا ۔ جلدی سے سکینہ کے مردہ ہاتھوں سے بڑی مشکل سے سر چھینا اور بھاگا ۔ قید خانہ سے آہ و بکا کی ایسی دل دوز آئیں ابھریں کہ قصر یزید کے کنگورے ہل گئے ہند کے دل پر ایسی چوٹ لگی کہ وہ سوتے سوتے چیخ مار کر اٹھ بیٹھی جس دن سے اس نے قیدیوں کی حمایت کی تھی ۔ اسے قید کر دیا گیا تھا ۔ کھانا پینا چھوٹ گیا تھا ۔ تن بدن کا ہوش نہ تھا ۔ یزید اس پر بے طرح گرویدہ تھا ۔ اس کی ابتر حالت دیکھ کر بے حد کڑھتا تھا ہوتا اور بل کھاتا مگر ہند دنیا سے منہ موڑے موت کی آرزو میں نیم مردہ گھل رہی تھی ۔

ملک کے حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے ۔ امام کا ذکر جرم بن گیا تھا ۔ لوگوں کو بھی ضد سوار ہو گئی تھی باوجود پابندیوں اور قتل و غارت کے سارے ملک میں ذکر حسینؑ ہونے لگا ۔

زین العابدین نے بڑی مشکل سے بہن کا جنازہ اٹھانے کی اجازت لی۔ یزید لوگوں کے اشتعال سے خائف ہو چکا تھا۔ اس نے اجازت دے دی۔ ابن حسینؑ بہن کا جنازہ ہاتھوں پہ لے کر قبرستان کی طرف روانہ ہوئے۔ لوگ جوق در جوق ان کے ہمراہ ہو لیے۔ روکنے تھام کی کوشش کی گئی تو ہنگامے شروع ہو گئے۔ فوجی امداد پہنچی۔ اور مجمع منتشر کیا گیا۔ قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا۔ یزید کی فوج اور سکینہ کا جنازہ اٹھانے والوں میں ٹکر ہو گئی۔ بات اتنی بڑھی کہ حشر برپا ہو گیا۔

ابن حسینؑ میت لے کر واپس لوٹ آئے۔ اور وہیں قید خانے کے احاطے میں پھاٹک کے قریب میت دفن کر دی۔

اس واقعہ کے بعد حکومت نے فیصلہ کر لیا کہ قیدیوں کا سوال ایک مصیبت بن چکا ہے۔ انہیں دارالخلافہ میں رکھنا اپنی تباہی کو دعوت دینا ہے۔ یہاں یہ لوگ رہے تو روز کوئی مصیبت کھڑی ہوتی رہے گی۔ خیریت اسی میں ہے کہ انھیں وطن جانے کی اجازت دیدی جائے۔ یہ لوگ چلے جائیں گے۔ تو سب ہنگامے ٹھنڈے پڑ جائیں گے کچھ عرصے بعد لوگ بھول بھال جائیں گے۔

مجرم کون ؟

فاتح فوج کو سرکاری مراتب بخشے گئے۔ مگر عوام کے دلوں میں ان کیخلاف بے پناہ نفرت پیدا ہو گئی جو دن بدن بڑھتی ہی گئی۔ وہ جدھر نکل جاتے لوگ پھٹکار بھیجتے اور نفرت سے منہ پھیر لیتے۔ اکثر ان پر غلاظت اور گندگی پھینکتے۔ ان کا ہر نکلنا دشوار ہو گیا۔ رائے عامہ سے ڈر کر ان کے دوست احباب بھی کنارہ کش ہو گئے ان کے عزیز ان سے گھن کھانے لگے۔

ہر نماز کے بعد مسجدوں میں حسینؓ کا ذکر ہونے لگا۔ یزید کے دشمن جو اب تک چپ دبکے ہوئے بیٹھے تھے۔ دلیر ہو گئے۔ انھوں نے کھلم کھلا یزید کے خلاف فتوے دینے شروع کر دیئے۔

یزید کو اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے طرح طرح کے بہانے ڈھونڈنے پڑے اس نے اپنے درباریوں سے اپنی بے گناہی کی گواہی طلب کی۔ زیادہ تر خوشامدیوں نے اسے ہر الزام سے بری الذمہ قرار دیا سارا قصور ابن زیاد کا ہے۔

"اصل مجرم ابن سعد ہے۔"

"لیکن حسینؓ کا قاتل شمر ذی الجوشن ہے۔ اسے واجب سزا ملنا چاہیئے۔"

یزید نے سوچا ان قربانی کے بکروں سے بھی پیچھا چھوٹ جائیگا۔ اپنی کارگزاریوں سے بڑے دماغ خراب ہو گئے ہیں۔ قتل حسینؓ کی سازش میں جو لوگ شامل تھے انکی بڑھتی ہوئی طاقت سے خوف پیدا ہونے لگا تھا۔

شبث بن ربعی بھی اس مجلس مشاورت میں ایک طرف بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بار بار یزید کو گھور رہے تھے۔ یزید کو وحشت ہونے لگی۔ اس نے جھلا کر کہا۔

"اے ابن ربعی تم بھی تو کچھ کہو!"

"قاتلانِ حسینؓ پر لعنت۔" انھوں نے نظریں جھکا کر کہا۔

یزید اس جواب سے قطعی خوش نہ ہوا۔ ابن نمیر سے کہا۔ تمہاری کیا رائے ہے؟

"سچ جواب چاہیے یا مصلحت آمیز۔" وہ بڑی ہوشیاری سے بولا۔

"سچ جواب دو۔"

"میری جان تو خطرے میں پڑ جائے گی۔ کیونکہ سچ بہت تلخ ہوتا۔!"

"تمہیں جان کی امان دی جاتی ہے!" اس کے سوا یزید اور کیا کہہ سکتا تھا۔ دوسرے وہ اپنے مخالفین کو نظر انداز نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یا تو انہیں اپنا طرفدار بنا لینا چاہتے۔ یا ان کے وجود سے چھٹکارا پالینا چاہیے۔

"حسینؓ کا اصلی قاتل وہ ہے جس نے ان کے خلاف لشکر بھیجا۔ انکے قتل کے احکامات جاری کئے۔ اور جلادوں کو ان پر تعینات کیا! اے امیر جو کچھ ہوا آپ کے حکم سے ہوا ورنہ کسی کی مجال نہ تھی جو رسول خداؐ کے نواسے کی طرف نظر اٹھا کے بھی دیکھتا۔؟

"حسینؓ غدار تھے۔ خلیفۂ وقت سے غداری اسلام سے غداری ہے بمصلحتِ الٰہی سے غداری ہے۔"

"پھر تو امیر معاویہ سب سے بڑے غدار تھے کہ انھوں نے علیؓ ابن ابی طالب کی بیعت سے انکار کیا اور ان سے جنگ کی!"

یزید کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ مگر ابن نمیر اتنا کچھ کہہ چکے تھے کہ اب آگے تکلف کرنے سے کچھ فرق نہ پڑتا۔ لہذا کہتے گئے۔

"تم نے مجھے جان کی امان دی ہے۔ مگر عہد شکنی تمہارے لیے کوئی نئی بات نہیں۔ تم اپنے آپ کو دین اسلام کا واحد ٹھیکے دار سمجھتے ہو۔ تمہاری اور تمہارے حاکموں کی مخالفت کرنا ہرگز اسلام دشمنی نہیں ہے۔ تم افراد ہو اسلام کی بنیاد نہیں اسلام ذاتی رائے کی آزادی دیتا ہے۔ گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو کیا تم واقعی ایک سچے مسلمان ہو؟"

"تیرا دماغی توازن درست نہیں بڑھے! الٹی سیدھی بکواس بند کر۔"

کوئی اور وقت ہوتا تو یزید اسی دم ان کا سر قلم کرا دیتا۔ مگر حالات نے اس بری طرح شکنجے میں کسا تھا کہ اسے مجبور اور تنگ دیکھ کر اس کے اپنے مشیر خاص عزیز اور بھروسے کے آدمی اکڑ دکھا رہے تھے۔

یزید کو ان کی حمایت کی اشد ضرورت تھی اور وہ اپنی اہمیت کے احساس پر غرور سے اکڑ رہے تھے۔

عرب قوم بے انتہا جذباتی واقع ہوئی ہے۔ ذرا سے اشارے پہ بہہ نکلتے ہیں ملک کے کونے کونے سے احتجاج کی آوازیں پہلی دفعہ پھر بلند ہوگئی۔ اب یزید کو اندازہ ہو رہا تھا کہ امام حسینؓ زندہ تھے۔ تو اس کے وجود کے لیے اتنے خطرناک نہ تھے۔ شہید ہو کر زندۂ جاوید ہو گئے۔ لاکھوں زندگیاں پا لیں۔

درباریوں نے رائے دی کہ بہتری اسی میں ہے کہ آل رسولؐ کو بڑی عزت اور آرام سے وطن روانہ کر دیا جائے۔

قیدیوں کو وطن روانہ کرنے سے پہلے یزید نے پھر انہیں دربار میں طلب کیا۔

قیدیوں کی حالت ایسی ابتر ہو رہی تھی کہ زندان کے در و دیوار ان کے نصیب پر رو رہے تھے۔ گرد آلود چہروں پہ بے خبری میں مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ فاقوں سے جسموں میں کھڑے رہنے کی طاقت نہ رہی تھی۔ دل مارے وحشت کے سینوں سے نکلے پڑتے تھے۔ پرانے زخم بھرنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ کم اور خراب خوراک، ہوا اور روشنی کا فقدان سب برسوں کے مریض معلوم ہوتے تھے۔

جیسے ہی دربانوں نے زندان کا دروازہ کھولا، بچے خوف سے ماؤں سے لپٹ گئے۔

"امی امی کوئی آتا ہے ہمیں چھپا لو۔"

ماؤں نے سہم کر بچوں کے منہ پر ہاتھ رکھ دیے کہ کہیں ان کی چیخ پکار سے بپھرے داروغوں کو غصہ نہ آ جائے۔

شمر ذی الجوشن اندر داخل ہوا۔ اسے کوڑے کا فن تھا جو عجب سا کھ طریقے لیے

جسم پر تیزی سے قابض ہوتا جا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔

"میرے مہربان آقا نے تمہیں معاف کر دیا۔ اب تم لوگ قتل نہیں کیے جاؤ گے۔ خوش ہو جاؤ کہ تمہاری رہائی کا وقت آ گیا۔"

کسی میں خوش ہونے کی سکت نہ رہی تھی۔ خاموش سر جھکائے بیٹھے رہے۔

"تم لوگوں کی دربار میں طلبی ہے۔ اٹھو!"

"ایک دفعہ تو ہم تیرے بادشاہ کے دربار میں ذلیل و خوار ہوئے۔ اب کیوں بلاتا ہے کیا کوئی کسر باقی رہ گئی ہے؟ خدا کا واسطہ ہمیں اسی زندان میں گھل گھل کر مر جانے دو اب ہم آزاد ہو کر کیا کریں گے۔ ہمارے لیے دنیا میں کیا رہ گیا ہے؟ حسینؑ قتل ہو گئے۔ ہمارے پیارے ہم سے بچھڑ گئے۔ ہم تا قیامت ان کی صورتوں کو ترسیں گے۔ اپنے درباری بادشاہ سے کہو اپنے جلاد بھیجے کہ آ کر ہمارے سر تن سے جدا کر دیں کہ یہ قصہ ختم ہو۔ یہ سر اب کندھوں پہ بار ہیں۔"

ابن حسینؑ بہ مشکل کھردرے پتھروں کے فرش پر گھسٹ کر اٹھ بیٹھے۔ انہیں اب بھی بخار آ رہا تھا۔ پھوپی نے کہا۔

"ہماری خاموشی ہی ہماری زبان ہے۔ ان پاجیوں کے منہ لگنے سے کیا حاصل اگر بادشاہ نے بلایا ہے تو جانے ہی میں مصلحت ہے؟" پھر دبی زبان سے ابن حسینؑ سے کہا۔

"یوں ہم قید میں سڑ کر ختم ہو جائیں گے۔ کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا۔ لوگ ہمیں بھول جائیں گے۔ یہ تو بڑا ظلم ہوگا۔ ہم باہر نکلیں گے تو کم از کم لوگ ہماری درگت دیکھیں گے کچھ تو ہمارے بارے میں سوچیں گے۔"

"تم ہمارے امام ہو۔ خدا رہتی دنیا تک ہمارے سر پر ہمارے امام کا سایہ قائم رکھے۔ تم ہماری امیدوں کا مرکز ہو۔ ہم بدنصیبوں کا سہارا ہو۔ تم جیسا کہو گے ہم وہی کریں گے۔"

بڑی مشکلوں سے سب گھسٹ گھسٹ کر اٹھے۔ ہاتھ ہلانا تک قیامت تھا۔ جوڑ جوڑ میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ ہڈیاں چیخ رہی تھیں۔ اس بار قیدی دربار لائے گئے تو یزید شطرنج کی چالیں بھول چکا تھا۔ دربار میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ صرف بیڑیوں اور زنجیروں کی جھنکار گونج رہی تھی۔

یزید سہما ہوا بیٹھا تھا۔ جلدی سے ہڑبڑا کر اٹھا۔ بڑی نرمی سے سب کو بٹھایا سارا الزام شمر ذی الجوشن اور عمر بن سعد کے سر تھوپنے کے بعد وہ خود کو قطعی بری الذمہ قرار دے چکا تھا۔ بڑے تاسف سے آنسو بہا کر کہا۔

مجھے بڑا افسوس ہے۔ یہ سب ان مردوں کی کارستانی تھی۔ ان سب کو ایسی سزائیں دی جائیں گی کہ ان کی سات پشتیں یاد کریں گی۔ ان لوگوں کو حسینؓ ابن علیؓ سے پرانا بیر تھا۔"

اس کے بعد زنجیریں اور بیڑیاں کاٹنے کا حکم دیا۔ اور ادھر ادھر سب کو ڈانٹنا پھٹکارنا شروع کیا۔

"ان سب کو سخت سزائیں دی جائیں گی۔ ایک ایک کی گردن ماری جائے گی۔"

"کس کی گردن مارو گے؟ کیسے سخت سزائیں دو گے۔ ہمیں سب کچھ پتہ ہے" زینبؓ بنتِ حسینؓ نے کہا۔

"میرا ہرگز یہ منشا نہیں تھا کہ ابن زہرؓ کو شہید کیا جائے۔ اگر میں میدانِ کربلا میں ہوتا تو انہیں سمجھا کر راہِ راست پر لے آتا۔ جو کچھ ہوا میری لاعلمی میں ہوا۔"

"یزید ان باتوں سے تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتے، نہ دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک سکتے ہو۔ تم لاکھ پردہ ڈالو حقیقت چھپ نہیں سکتی۔ حسینؓ کا لہو جگمگاتا رہے گا۔ تمہاری زہر میں بجھی باتیں تکلیف دہ ہیں۔ اگر تم اسی وقت جلا دو کربلا، ہماری گردنیں اڑا دو تو تم بڑے احسان مند ہوں گے؟"

"تم لوگوں کو میرے اوپر بھروسہ نہیں۔ مگر میں جھوٹے وعدے نہیں کرتا۔ خزانے کا دروازہ کھلا ہے۔ میں تمہارے عزیزوں کا خون بہا دینے کو تیار ہوں۔"

عربوں میں یہ اصول تھا کہ اگر عزیز چاہیں تو مقتول کی جان کے بدلے جان کے بجائے زر

لے سکتے تھے۔" یہ سن کر زینبؑ کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔ انہوں نے کہا۔
خونِ حسینؑ کی قیمت قیامت کے دن رسول اللہؐ کو دینا' یا حسینؑ کی ماں فاطمہ زہراؑ اور باپ علیؑ ابن ابی طالب کو دینا کہ وہی ان کے سب سے بڑے حق دار ہیں۔ اے یزید بن معاویہ اب تو ہمارا تمہارا حساب کتاب خدا کے حضور میں ہو گا۔ تم کس کس کا خون بہا ادا کرو گے۔ تم نے آلِ رسولؐ کو نہیں پوری انسانیت کو ذبح کیا ہے۔ روزِ حشر خدا کو خون بہا ادا کرنا۔"
یزید سر سے پاؤں تک کانپنے لگا۔ چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ دربار میں حاضرین پر سکتہ چھا گیا۔
"میری طرف سے تم کو آزادی ہے۔ جہاں چاہو جاؤ۔" یزید نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ "اگر تمہارے دل میں واقعی کچھ رحم ہے تو ہمیں اتنی مہربانی کرو کہ ہمارا جو سامان لوٹا گیا ہمارا وہ واپس لوٹا دو۔ ہمارے شہیدوں کے سر اور کپڑے۔ ہمارے سروں کی چادریں دیدو تاکہ ہم انہیں ان کے ساتھ دفنا دیں اور ہمیں واپس جانے کی اجازت دے دو۔"
یزید نے فوراً سب سامان منگوا دیا۔
کٹی پھٹی خون میں ڈوبی عبائیں اور چادریں، تار تار عمامے دیکھ کر یزید کے درباریوں کے مجموں میں خوف اور دہشت سے کپکپی دوڑ گئی۔ جیسے وہ شہیدوں کے برہنہ جسم کربلا کے میدان میں کھلے پڑے تھے۔ سر و قد اٹھ کھڑے ہوں۔ یزید نے سہم کر آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے ایک انجانے خوف سے جسم لرزنے لگا۔ لوگ پھٹی پھٹی آنکھوں سے خونی پیراہن دیکھ رہے تھے اور ان کے ہوش و حواس گم ہوئے جا رہے تھے۔
"یہ میرے پیارے بھائی حسینؑ کی عبا ہے آپ کے خون سے تر بتر۔ یہ میری ماں کا دوپٹہ ہے جو پرزہ پرزہ ہو رہا ہے۔ تیر بھی کے کانٹوں نے ٹکڑے کر دئیے ہوئے ہیں۔ اس کا تو ایک تار بھی سلامت نہیں۔"
یزید بہت بری طرح بوکھلا گیا؛ بالکل ہی عقل ماری گئی۔ خود ستائی کی پرانی عادت نے جوش مارا۔ احساس کمتری سے پناہ لینے کی خاطر بولا۔
"ابن حسینؑ، تمہارے باپ کی عبا ہے یا کسی فقیر کی گدڑی!"

اس اندوہ ناک موقع پر اس کی حماقت اور چھچھورے پن پر ابن حسینؓ کو ہنسی آگئی۔

"یزید تم بہت چھوٹے سے انسان ہو۔ میرے باپ کو جھوٹی شان جمانے کیلئے اطلس اور دیبا کا سہارا نہیں چاہیئے تھا۔ آج بھی ان کی برہنہ لاش انکی جرأت اور حق پرستی کے نور میں لپٹی ہوئی ہے۔ مگر تم اس زربفت اور کمخواب میں بھی ننگے ہو۔"

اور کوئی وقت ہوتا تو یزید کے دربار میں یہ گستاخی موت کا پیغام بن جاتی۔ مگر لوگوں کی آنکھوں میں سلگتی ہوئی نفرت نے اس کی تمام شاہی قوتیں سلب کرلیں۔ خود اس کے درباری اس سے گھن کھا رہے تھے۔ جیسے وہ زندہ انسان نہیں بلکہ لاش ہے جس کی بدبو سے انسانی دماغ زخمی ہوا جا رہا ہے۔ مصلحتاً یزید دبک گیا۔ اور مسمسی صورت بنا کر بولا۔

"سب کو سزائیں دی جائیں گی۔ یہ غیر اسلامی فعل بخشا نہیں جائے گا۔"

جو انعام اور اکرام کی امیدیں لگائے بیٹھے تھے چوکنے ہو گئے۔ انہیں یزید پر کبھی پوری طرح بھروسہ نہ ہوا۔

کپڑوں کے ڈھیر میں سے بانو نے علی اکبرؓ کی پوشاک پہچان کر گھسیٹ نکالی۔ کس ارمان سے پھوپھی نے یہ جوڑا تیار کیا تھا۔

"یہ تو بالکل نئی پوشاک تھی۔ کیوں ماں کے دل کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ علی اکبرؓ جاتے وقت تم نے یہ تو نہیں کہا تھا۔ واپس نہ لوٹو گے۔ ہم شکل نبی کے دیدار سے پھر آنکھیں ٹھنڈی ہی نہ ہوں گی؟"

"ام رباب نے اپنی ردا کھینچ کر سر پر ڈالی تو ساتھ میں علی اصغرؓ کا ننھا سا خون میں ڈوبا ہوا کرتا الجھا چلا آیا۔ جلدی سے اٹھا کر آنکھوں سے لگایا اور بے اختیار چومنے لگیں۔

دیکھو تو میرے لال کے ننھے کرتے کی کیا گت بن گئی۔ جب میرے لال کے گلے پر سہ پھلا تیر لگا تو دودھ کے بجائے جیتا جیتا خون اگل دیا۔ یا اللہ میرا دودھ لہو ہو گیا میرے بچے، میرے چاند! اماں راتوں کو اٹھ کر تجھے ڈھونڈتی ہے۔ اپنی خالی گود دیکھ دم آتا ہے اللہ جانے اس جنگل میں تم پر کیا بیت رہی ہو گی۔ میرے چاند تم تو فاختہ کے پروں کی آواز سے چونک اٹھتے تھے۔ وہاں اکیلے کیسا ڈر لگتا ہو گا میری جان!"

"زینبؑ نے بڑھ کر بانو کو سینے سے لگا لیا۔

"نہ رو میری شہزادی۔ بدنصیب ماں تیرا لال اپنے بابا کی گود میں محو آرام ہے میں نے عالم خواب میں دیکھا ہے۔ رسولِ خدا اپنے نواسے کو میدانِ کربلا میں ڈھونڈ رہے ہیں۔ میری ماں کی گود میں مقتول بیٹے کی کٹی ہوئی لاش ہے۔ فاطمہ زہراؑ خون کے آنسو رو رہی ہیں۔ اور میں نے اپنے باپ کو بھی خواب میں دیکھا۔ شیرِ خدا کے ہاتھوں میں ذوالفقار کے بجائے رسّی کے ٹکڑے ہیں۔" "امی یہ سکینہؑ کے بندے ہیں۔ یہ سفید موتی لال کیوں ہو گئے؟"

ربابؑ کی ہتھیلی پر موتی خون کے بوندوں کی طرح لرز رہے تھے۔ اچانک جیسے سانپ نے ڈس لیا ہو۔ سہمے ہاتھوں سے قاسمؑ کا عمامہ اور آنکھوں سے لگا لیا۔ بجلیاں سی کوند گئیں، وہ بچپن کا ساتھ، ہنستا ہوا چہرہ، مسکراتے ہوئے پرشوق لب، وہ پل بھر کی شادی وہ مہکتا ہوا جسم بن جشن بے وفا محبوب ... گھوڑوں کی ٹاپوں سے کچلا ہوا جسم

... ربابؑ بے ہوش ہو کر زمیں ڈھیر ہو گئیں۔

بھائی نے بہن کو ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ ناتواں لاغر جسم میں نہ جانے کہاں سے جان آ گئی۔

درباریوں کا عجیب عالم تھا۔ نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ ہونٹ سلے ہوئے تھے۔ اشک جاری تھے۔ "یزید پر اتنا بوجھ آ پڑا۔ دم گھٹنے لگا۔ گھبرا کر چاروں طرف دیکھا شہزادیوں کی آنکھوں میں غیرت اور بے گانگی نظر آئی۔

"تم جو کچھ چاہو میں حاضر کرنے سے گریز نہ کروں گا۔"

"جو مانگیں گے وہ دو گے؟" زینبؑ بنتِ علیؑ نے پوچھا۔

"ضرور۔"

"تو مجھے رونے کی اجازت دے دو، ابنِ معاویہ اگر تیرا دل پتھر کا نہیں تو مجھے جی بھر کے رو لینے دے۔ جب سے میرے بھائی شہید ہوئے رونے کی مہلت نہ ملی میری آنکھوں سے ایک آنسو نہ بہا۔ یہ رکے آنسو میرے دماغ کے پرخچے اڑائے دیتے ہیں۔ میں آنسو بہانا چاہتی ہوں۔ ہمیں ایک مکان دے دو۔ ہم جانے سے پہلے اپنے جی کی بھڑاس نکالیں گے۔" یزید نے فوراً حکم دیا کہ انھیں ایک علیحدہ مکان میں پہنچا دیا جائے۔

غم حسینؑ کی یہ پہلی مجلس تھی۔ لوگ دور دور سے آکر جمع ہو گئے۔ زینبؑ نے شروع سے لیکر آخر تک ایک ایک واقعہ بیان کیا۔ اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیا۔ عونؑ و محمدؑ کی شہادت، قاسمؑ کا قتل علی اکبرؑ کی جوان سال لاش کی بے حرمتی، معصوم چھ مہینے کے علی اصغرؑ کے حلق میں اٹکا ہوا سہ پھلا تیر، عباسؑ کے کٹے ہوئے بازو، ان کے خون میں ڈوبا ہوا علم اور لہو میں لتھڑی ہوئی مشک، پھر حسینؑ کی تنہائی اور بے بسی، شمر کا ان کے سینے پر چڑھ کر سر جدا کرنا، نیزوں پر سروں کی بے حرمتی، اور چھینی ہوئی ردائیں۔ سکینہ کے لہو لہان کان، امام علیؑ کے پیروں کی بیڑیاں۔ علی اصغر کا خالی پالنا۔ جلے جلے خیمے غرض ایک ایک واقعہ اس درد اور سوز سے بیان کیا کہ سننے والے غم اور غصے سے دیوانے ہو گئے۔

یزید بے طرح گھبرا گیا اور جلد از جلد ان لوگوں کو رخصت کرنے پر اصرار کرنے لگا۔ اس نے ان کے ساتھ پانچ سو سوار روانہ کیے۔ جو سب کے سب ان سے دلی ہمدردی رکھتے تھے۔ نعمان بن بشیر کو حکم دیا کہ ان سب کو بخیر و عافیت مدینہ پہنچا دے۔

مگر مدینہ جانے سے پہلے یہ لوگ کربلا گئے۔ شہیدوں کے سر سینے سے لگائے پھر اسی میدان کی طرف روانہ ہوئے۔ جہاں کی دنیا تاراج ہو گئی تھی۔ لوگ راستے میں ملتے زینبؑ اور کلثومؑ حالات کربلا دہرائیں۔ ان کی جادو بیانی اور پھر غم حسینؑ۔ راہ میں مجلسیں جم جاتیں ایک آگ سی بھڑک جاتی۔

جب یہ لوگ کربلا پہنچے تو معلوم ہوا کہ لاشیں قبیلہ بنی اسد کے افراد نے دفن کر دی ہیں جہاں جو شہید ہوا تھا وہیں دفن کر دیا۔ ان لوگوں نے ان کے سر بھی ساتھ سپرد خاک کر دیئے۔

فاطمہ کبریٰؑ قاسم بن حسنؑ کی لحد پر بے جان ہو کر گر گئیں۔

"اب میں اپنی زندگی انہی کی تربت میں گزار دونگی" انہوں نے ضد کی "میرے لیے دنیا اندھیر ہو چکی ہے۔ میں اپنی زندگی کے ساتھی کو اس بیاباں میں اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤں گی" لوگوں نے سمجھایا بجھایا۔ وہ غم اور ناتوانی سے بار بار بے ہوش ہو جاتیں۔ آخر انھیں محمل میں لٹا دیا اور مدینے کی طرف روانہ ہونے کا قصد کیا۔

زینبؑ بنت علیؑ کا عجیب حال تھا۔ بار بار حسینؑ کی قبر سے رخصت ہو کر محمل میں سوار ہوتیں۔

پھر بھی نہ مانتا واپس آکر قبر پہ گر جاتیں۔

"میری دنیا تو اس میدان میں سو رہی ہے۔ جی چاہتا ہے یہیں ایک کونے میں چادر بچھا کے بیٹھ جاؤں۔"

"آپ بھول رہی ہیں۔ آپ اس بچے کھچے قافلے کی سردار ہیں۔ تمام شیرازہ بکھر جائے گا۔ آپ کے سہارے تو ہم سب زندہ ہیں۔ آپ سب کو مدینہ پہنچا دیجئے۔" لوگوں نے کہا۔

"مدینہ کیا منہ لے کر جاؤں گی۔ صغریٰ کو کیا جواب دوں گی۔ وہ پوچھے گی میرے بیاہتوں کو کہاں چھوڑ آئیں۔ مدینہ والوں سے کیسے آنکھیں ملاؤں گی۔ کیسے کیسے پھول کملا گئے۔ میں کیوں زندہ بچ گئی؟"

"اس لیے کہ آپ کو ابھی جینا ہے۔ ایک ہی دنیا والوں کے سوالوں کے جواب دے سکتی ہیں۔ کیا آپ نے باباجان کا حکم بھلا دیا۔ ہمارے امام نے کیا فرمایا تھا۔ کیا ان کی قربانی بے کار ہو جائے گی۔ ان کا لہو ریت نے جذب کر لیا۔ اور غافل سوئی پڑی ہے۔ نہیں پھوپھی جان ہماری زندگی کا بس ایک ہی مصرف ہے کہ ہم دنیا بھر کو بتائیں کہ کس طرح ایک زبردست طاقت نے مٹھی بھر انسانوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور ختم کر دیا۔ مگر ہم بتا دیں گے۔ ہم ختم نہیں ہوئے۔ جب تک سچائی اور انصاف کا جذبہ زندہ ہے۔ ہم زندہ ہیں۔ ہم دنیا پر ثابت کر دیں گے کہ حق کتنا روشن اور جاندار ہے۔ جب کبھی زبردست کمزور اور مجبور کو غارت کریں گے۔ ہم زندہ ہو جائیں گے۔ جب معصوموں کا خون بہے گا۔۔۔ خون حسینؑ اور سرخ ہو جائے گا۔ لوگ حسینؑ کا نام لے کر ظلم کا مقابلہ کرنے پر ٹوٹ جائیں گے۔ فتح موت اور زندگی کے بندھنوں سے آزاد ہے۔ فتح صرف سچے خیال کی ہوتی ہے۔"

زینبؑ نے آخری بار قبر کو بوسہ دیا اور جلد ہی بھائی سے جا ملنے کا ارمان لیے محمل میں سوار ہو گئیں۔

مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں ہر شہر اور قصبے لوگ ارد گرد جمع ہو جاتے جو قافلے والوں سے مل کر جاتے۔ وہ اپنے بھائی بندوں اور اپنے شہریوں کو سناتے اس طرح جو کچھ کربلا میں آل رسولؐ پر بیتی تھی گھر گھر کی کہانی بن گئی۔ لوگ جمع ہوتے حالات سنتے، ماتم

ہزاروں شاعروں اور ادیبوں کے دل ہل گئے۔ اور ان کے قلم جنبش میں آگئے۔ ایک ایک واقعہ سوز اور نوحے کی صورت میں عوام کے دلوں کو چھونے لگا۔ گھر گھر مجلسیں منعقد ہونے لگیں۔ لوگ جمع ہوتے، حالات سنتے اور سر دھنتے۔ حسینؑ سے عقیدت بڑھتی گئی ان کے قاتلوں سے نفرت اس سے بھی تیزی سے بڑھی۔ لوگوں نے ان کے قاتلوں کی زندگی دشوار کر دی۔ ان کے لیے سماج میں زندہ رہنا دشوار ہو گیا۔ یہ وہ آگ تھی جسے بجھانا بڑی سے بڑی طاقت کے بس کی بات نہیں۔ جب ایک جذبہ عوام میں جنم لے کر ابھرتا ہے تو کوئی طاقت اسے دبا نہیں سکتی۔

حکومت کو بہت زبردست طاقت سے مقابلہ کرنا پڑا۔ عوام بھری پوری طاقت نہتے اور مجبور انسان بھی جب کسی بات کے حق میں فیصلہ کر لیتے ہیں تو انھیں دبانا اور کچلنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ عوام کے ریلے کے سامنے بڑی بڑی حکومتیں تنکوں کی طرح بہہ جاتی ہیں۔

جب قافلہ مدینہ پہنچا تو وہاں کے شہریوں کو پورے حالات کی اطلاع نہیں پہنچی تھی۔ قافلے کے ساتھ واقعات کے گواہ جلے ہوئے خیمے تھے۔ علیؑ اصغر کا خالی پالنا تھا۔ خون میں ڈوبے لباس تھے۔

شہر کے دروازہ پر قافلہ رک گیا۔ اور زینبؑ نے کہا۔

"اے مدینہ والو! میری ہمت ہو ہی نہیں رہی ہے کہ شہر کے اندر قدم رکھوں۔ اسی دروازے سے بھرا پرا خاندان سفر پر روانہ ہوا تھا۔ آج اپنا سب کچھ لٹا کر یہ قافلہ واپس لوٹا ہے۔ ہمارے پاس کچھ نہیں صرف یہ جلے ہوئے خیمے ہیں۔ یہ بھی جلی روا ہیں یہ علیؑ اصغر کا خالی پالنا ہے۔ اور سوگوار ذوالجناح ہے۔ رسولؐ خدا کے نواسے کربلا کے میدان میں تین دن کے پیاسے شہید ہوئے۔ ان کی نظروں کے سامنے ان کے بیٹے اور بھائی ذبح کئے گئے چھ ماہ کے علی اصغرؑ نے سر پر تیر کھا کر بدنصیب باپ کے ہاتھوں میں دم توڑ دیا۔"

فاطمہ صغراؑ نے جب یہ سنا تو ایک دل دوز آہ کلیجے سے نکلی اور وہ وہیں خاک پر گر کر بے ہوش ہو گئیں۔

ام البنین نے جب اپنے چاروں بیٹوں کی شہادت کی تفصیل سنی تو سجدۂ شکر بجا لائیں۔

کر ان کے بیٹے امتحان میں پورے اترے مگر ماں کا دل بے قرار ہو رہا تھا۔ بڑے رشتے بر لیں۔

"لوگو! میں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ جو میری دنیا میں آگ لگا دی۔

"میرے مکان کے چاروں ستون ڈھا دیئے۔؟

"میں جو بیٹوں کی ماں کہلاتی تھی۔"

"آج میری گود سونی ہے۔"

"نئی بیاہی دلہنیں میرے آنچل کے سائے کو مبارک سمجھتی

تھیں کہ خدا ان کی بھی گود بھر دے۔

"پر آج میری گود خالی ہے۔

میری عمر بھر کی کمائی لٹ گئی۔

میرا خون کربلا کی ریت پہ رل گیا۔

اب میں کیوں زندہ ہوں۔"

ناشاد و نامراد قافلے کی واپسی پر مدینے میں طوفان پھوٹ پڑا۔ جس نے حکومت کی بنیادیں جھنجوڑ ڈالیں۔ غم حسینؑ غم جہاں بن گیا۔ حسینؑ کے قاتلوں کے لیے جینا دوبھر ہو گیا۔ کتنے ہی ان میں سے پاگل ہو گئے۔ بہتوں نے اپنے ہاتھوں اپنی جان لے کر قصہ پاک کیا۔ لوگ ان کی جانوں کے دشمن ہو گئے۔ انہیں ڈھونڈ کر قتل کیا۔ خاندان کے خاندان تباہ کر دیئے۔ ہزاروں نے دوسرے ملکوں میں گمنامی اختیار کر لی۔

جگہ جگہ مجلسیں ہونے لگیں۔ لوگ نوحے اور مرثیے پڑھتے۔ اور ماتم کرتے۔ حکومت کی طرف سے حسینؑ کا سوگ منانے والوں پر پابندیاں ہو گئیں۔ اس پر عوام اور بھی بھڑک گئے سرِ عام چوراہوں پر ماتم ہونے لگے۔ اور سختی ہوئی۔ غصہ اور غم بڑھا اور دور دور کے قصبے ملکوں میں غم حسینؑ پھیل گیا۔

عرب قوم بڑی جذباتی ہے۔ جتنی پابندیاں ہوئیں۔ اتنا ہی غم و غصہ بڑھا۔ ماتم حسینؑ یقین اور ایمان کا جز بن گیا۔ ماتم میں اور شدت ہوئی۔ لوگ زنجیروں اور چھریوں سے ماتم

کئے۔ ان پر ظلم ہوتے، سولیاں دی جائیں مگر بجائے خوف زدہ ہونے کے ان کی جگہ ہزاروں ماتم کرنے والے اٹھ کھڑے ہوئے۔

ماتم کی آواز سن کر یزید پر کرب طاری ہو جاتا۔ دماغ بیکار ہونے لگتا۔ راتوں کی نیند حرام ہو جاتی۔ کوئی تدبیر اظہار غم کو ممنوع قرار دینے کی کام نہ آئی۔ حکومت کی بنیادیں ہل گئیں۔ یزید نے ذہنی خلفشار سے عاجز ہو کر جان دی۔ امیر معاویہ کے خواب پاش پاش ہو گئے۔ حکومت کی باگ ڈور عباسیوں کے قبضے میں آ گئی۔ یزید کا نام شیطان کے ساتھ وابستہ ہو گیا۔ آج تیرہ سو سال کے بعد بھی دنیا کے ہر حصے میں غم حسینؑ کروڑوں انسانوں کے دلوں میں سمایا ہوا ہے۔ محرم کے مہینے میں اسی شدت سے قتل حسینؑ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ مجلسیں منعقد ہوتی ہیں۔ واقعات کربلا دہرائے جاتے ہیں۔ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی دنیا حسینؑ ابن علیؑ اور ان کے رشتہ داروں اور دوستوں کو نہیں بھولی ہے۔ اور صدیاں گذر جائیں گی۔ روز قیامت تک دنیا شہید اعظم حسین ابن علیؑ کو نہ بھول پائے گی۔

ختم شد

ایک قطرہ خون



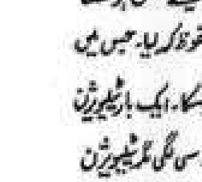


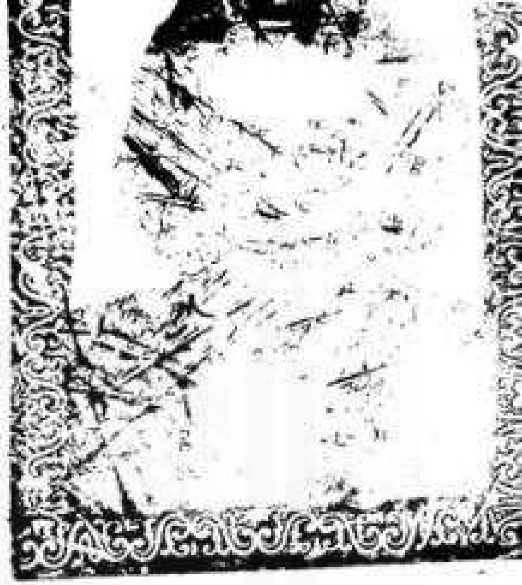
عصمت چغتائی ایک ایسا نام ہے جس کو پڑھ کر یا تصویر دیکھ کر میں نے ہمیشہ ذہن میں ایک ایسا خاکہ بنایا جو میرے خیال میں صرف عصمت چغتائی ہی کیلئے ممکن ہو سکتا تھا۔ میں نے جب بھی ہر وہ کتاب رسالہ یا اخبار خرید کر اسے پڑھا اور اپنے پاس محفوظ کر لیا۔ جس میں عصمت چغتائی نے کچھ لکھا ہو۔ مگر میں کبھی عصمت چغتائی سے ملاقات نہ کر سکا۔ ایک بار ٹیلیویژن پر میں نے عصمت چغتائی کا ایک انٹرویو سنا تو مجھے ان کی آواز میں جانی پہچانی سی لگی مگر ٹیلیویژن ملاقات اتنی ادھوری تھی کہ میرے دل میں پہلی بار عصمت چغتائی صاحبہ سے ملاقات کی خواہش پیدا ہوئی۔ میں نے کسی بھی اچھے وقت میں بھارت جا کر عصمت صاحبہ سے ملاقات کا فیصلہ کر لیا۔ مگر ایک صبح جب اخبار والا اخبار دے کر گیا تو سب سے پہلے میری نظر اخبار کی اس خبر پر پڑی جس میں محترمہ عصمت صاحبہ کی پاکستان میں آمد کی نوید تھی۔

اور پھر جب عصمت صاحبہ پاکستان کے چند شہروں میں اپنے ہم عصر ادیبوں سے ملیں تو مجھے بھی ان سے ملاقات کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس ملاقات میں جو میری مختصر سی زندگی سے پہلی ملاقات تھی میں نے عصمت چغتائی صاحبہ کو اپنے [illegible] روپ میں دیکھا اور ان کی ذرا ذرا سی بات اتنی توجہ سے سنی جیسے برسوں بعد [illegible] اور [illegible] ہوئی خالہ مجھ سے ملنے کیلئے آئی ہوں۔ مگر یہ سب ملاقاتیں اتنی مختصر تھیں کہ میں وہ سب کچھ عصمت صاحبہ سے نہ پوچھ سکا جو کچھ میں نے سوچ رکھا تھا۔

اور اب جبکہ میں عصمت چغتائی کا ناولٹ ایک قطرہ خون شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں میں نے دیکھا ہے کہ یہ خوشی عصمت صاحبہ سے بے حد قریب محسوس کر رہا ہوں۔

عصمت چغتائی نے واقعات حسین اور کربلا کے معرکہ حق و باطل پر یہ اردو ادب میں پہلا تاریخی ناول تخلیق کیا ہے اور میرا خیال ہے کہ کوئی بھی تاریخ دان اور ادیب اس





عصمت چغتائی

عصمت کے افسانے پڑھنے والوں کی زبانی میں نے ہمیشہ یہی سنا کہ وہ مردمار قسم کی عورت ہے لیکن جب پہلی بار میں نے انہیں دیکھا تو یوں محسوس ہوا۔ جیسے خمیری آٹے میں کسی نے بہت ہی نرم و نازک اور حساس دل گوندھ دیا ہو۔

یہ سنہ ۱۹۴۲ء کی بات ہے جب میں دسویں جماعت میں پڑھتا تھا اس وقت بھیا شاہد لطیف سے ان کی شادی ہو چکی تھی۔ بڑی بوڑھیوں کو یہ شادی پسند نہیں آئی تھی "اے ہے سنا ہے بہو افسانے لکھتی ہے وہ بھی حالی۔ بڑے فضول واہیات اور ننگے افسانے۔ ننگے۔ اللہ توبہ۔ آج کی لڑکیوں کے دیدے کا پانی ڈھل گیا ہے"

میں یہ باتیں سنتا تھا اور سوچتا تھا کہ نہ جانے دیدے کا پانی ڈھلنے کے بعد عورتیں کیسی ہوتی ہیں پھر اچانک معلوم ہوا کہ شاہد لطیف اور عصمت آ رہے ہیں۔ پہلے وہ بھائی میاں اور بی سے ملنے کے لئے بریلی گئے پھر بڑے بھائی عصمت اللہ خاں سے ملنے کے لئے لکھنؤ آئے۔ جس دن شاہد اور عصمت لکھنؤ آ رہے تھے۔ معلوم نہیں کیوں بھائی صاحب بغیر مجھے بتائے ہوئے انہیں لینے کے لئے سٹیشن پہنچ گئے۔ میں ابھی سو کر اٹھا ہی تھا۔ کہ یہ لوگ آ گئے۔ میں نے سلام کیا اور پھر ڈرتے ڈرتے عصمت کو دیکھا۔ وہ تو ویسی ہی تھیں۔ جیسے گھر کی اور عورتیں — میرا تعارف کرایا گیا۔

شاہد بھائی بولے۔

"یہ ہیں عصمت "

"یہ ہیں خالد!"

اور پھر میں اس بھابی عصمت سے ملا جو ہر لحاظ سے دنیا کی الگ عورت تھیں۔

خالد لطیف